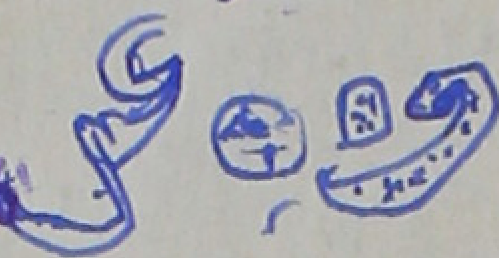
راہِ عمل

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

Hero,

Mr. Ghulam Nabi Jantray
R/o village Midraw
31-5-77





راہِ عمل

نذرِ حسرت

عزیز سیّدین کے نام

بھابی جان ـــــ آپ کی اتھاہ محبّت اور انمول دوستی سے محروم اس دل میں اب صرف آپ کی ان مٹ یاد ہی باقی رہ گئی ہے ـــــ یہ ناول جو آپ کو بے حد پسند تھا اس پیاری یاد کی نذر ہے

۱

گیتا کمرے میں داخل ہوئی۔ حسبِ عادت کسی خیال میں کھوئی ہوئی۔ صفیہ بیگم نے سوچا اسے بھی ساتھ کیوں نہ لے چلوں۔ ذرا اس کی بھی تفریح ہو جائے گی۔

"کیوں گیتا اباّ کے چلتی ہو؟ پرسوں میں اور میاں اُدھر جا رہے ہیں۔"

"میں کیا کروں گی وہاں جا کر آپا؟" گیتا کو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ اس کی وجہ سے کسی پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔

"کرو گی کیا؟ اور میں ہی کیا کروں گی؟ ذرا سیر ہو جائے گی۔ میاں کام سے جا رہے ہیں۔ کار میں جائیں گے، میں نے سوچا ہم تم بھی چلیں۔"

"کتنے دن کے لئے جا رہے ہیں میاں؟"

"اب یہ تو ان کے پروگرام پر منحصر ہے۔ جانتی ہو کہ ہر جگہ تو ان کے چاہنے والے نکل آتے ہیں۔" صفیہ بیگم نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔ جس میں کچھ ناز تھا، کچھ شکایت تھی، کچھ پیار تھا۔

"آپا، میاں نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لئے کوئی نوکری تلاش کریں گے" گیتا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی ہو جائے گا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو امتحان کی تکان بھی نہیں اُتری۔ ذرا صورت تو دیکھ اپنی آئینے میں۔ کتنی زرد ہو گئی ہے محنت کر کر کے۔"

بے ارادہ گیتا کی نظریں سامنے کی الماری کی طرف اُٹھ گئیں جس میں جڑا

ایک پرانا سا قدِ آدم آئینہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں
اُداسی کی جھلک، چوڑے ماتھے پر فکر کی ایک دو شکنیں، گندمی رنگ میں کندن کی سی سُرخی
کی جگہ ہلکی سی سیاہی اور زردی ملی ہوئی اور خمیدہ ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ۔

"واہ کیا صورت ہے۔" عجیب بیگانگی کے انداز سے اس نے سوچا۔ ساتھ ہی
پیچھے بیٹھی صفیہ بیگم کا عکس مسکراتی ہوئی شریر آنکھوں سے اسے گھورتا نظر آیا۔

"ہائے کتنی پیاری صورت ہے آپا کی۔ یہ دمکتا ہوا سرخ و سفید رنگ۔ یہ چمکتی
ہوئی سیاہ آنکھیں، کالے بالوں کی یہ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چوٹی اور چہرے پر
بلا کی معصومیت اور بھولا پن ۔۔۔ کاش ۔۔۔ کاش میں بھی ایسی ہی حسین ہوتی۔ بھلا کون
کہہ سکتا ہے انھیں دیکھ کر کہ یہ اٹھارہ اُنیس برس کی لڑکی کی ماں ہیں ۔۔۔ ایشور۔ ساری
خوبیاں ان ہی کے لیے کیوں تھیں۔ شہرت، عزت، حُسن، محبت کیا نہیں ان کے پاس؟
ایسا بے مثال پتی ۔۔۔ ایسے پیارے اور سعادت مند بچے ۔۔۔" اس وقت اسے اپنی
محبوب آپا سے عجیب سی جلن پیدا ہو رہی تھی۔ "تبھی تو وہ ہر وقت ہنستی رہتی ہیں، ہر ایک
سے محبت اور خوش مزاجی سے ملتی ہیں۔ اتنی جوان اور خوبصورت نظر آتی ہیں۔ ان کی
سی قسمت میری بھی ہوتی تو۔۔۔۔۔"

"ارے باؤلی ۔۔۔ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہے شیشے میں۔ کہیں نظر نہ لگ جائے
اس پیارے مکھڑے کو۔" صفیہ لڑکیوں سے ہمجولیوں کی طرح ہنسی مذاق کیا کرتی تھیں۔

گیتا کے زرد چہرے پر حیا کی سرخی آ گئی۔ "میں تو آپ کو دیکھ رہی تھی آپا۔
کتنی سُندر ہیں آپ؟" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ صفیہ بیگم کی ہنسی کی جھنکار
سے سارا کمرہ گونج اُٹھا۔ جیسے بہت سے گھنگرو ایک دم بج اُٹھے ہوں۔

"اچھا بڑے لوگوں پر یہ پھبتیاں۔" وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ سامنے سے حبیب میاں
پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آتے نظر آئے۔ دُہرا بدن۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں

میں بچوں کی معصومیت اور موٹے ہونٹوں پر شفقت بھری مسکراہٹ۔ گول چہرے پر گھنی کھچڑی داڑھی جس میں ابھی سے سفیدی غالب نظر آرہی تھی۔ سر پر انے گنے بال۔ جسم پر کھدر کا کرتا پاجامہ۔ بیوی کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگے۔

"کیا پڑا پایا؟ کس بات پر اس قدر ہنس رہی ہو؟ گیتا — ارے آج تو یہ رونی صورت بھی ہنس رہی ہے۔" انھوں نے ایک ہلکا سا چپت گیتا کے سر پر مار کر کہا۔ گیتا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بڑی نعمت مل گئی ہو۔

"میاں — پرسوں آپ انہالے جا رہے ہیں نا؟ میں بھی چلوں گی۔" جانے کیا بات تھی کہ اتنی محبت اور پیار کے باوجود وہ صفیہ بیگم سے اتنی بے تکلف نہ تھی جتنی حبیب میاں سے۔

"اچھا۔ ضرور چلنا۔ تمھیں اپنا گاؤں بھی اس بار دکھالائیں گے۔"

"کہاں ہے میاں آپ کا گاؤں؟ کیا نام ہے؟" اشتیاق سے گیتا نے پوچھا۔

"گمڑ گانوہ سے کچھ ہٹ کر ہے۔ جمنا کے کنارے۔ اچھا منظر ہے اس کا۔ کملا نگر چلو گی نا صفیہ؟"

"کیوں نہ چلوں گی۔ وہاں جا کر ذرا آپ کے ان کارندہ صاحب کی بھی خیر خبر لینی ہے جنھوں نے دو سال سے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔" صفیہ نے ذرا تیزی سے کہا کب سے وہ میاں سے کہہ رہی تھیں کہ کملا نگر چلو تاکہ زمین جائداد کی کچھ آمدنی وصولی کی جا سکے۔

"جی معاف کیجئے۔ میں آپ کے کارندے صاحب کی خدمت میں حاضری دینے نہیں جا رہا۔"

"آپ نہیں تو میں ان کی خدمت میں درخواست کروں گی۔"

"وہ غریب کہاں سے تمھیں روپیہ دیتا رہے — بھلا اب آمدنی ہی کیا جو

بھیجے۔ اس کا خرچ ہی مشکل سے چلتا ہوگا۔"

"ہے کیوں نہیں چچا میاں کی زندگی میں اسی سے سارا خرچ چلتا تھا۔ اب آخر کیا مصیبت آگئی ہے کہ اس سے آدھا چوتھائی بھی وصول نہیں ہوتا۔"

"ہاں تم تو چاہتی ہو کہ میں بھی بزرگوں کی طرح ——— خدا ان کی روح کو نہ شرمائے۔ کسانوں کا خون چوسوں ——" ان کے نرم چہرے پر ایک دم سختی اُبھر آئی۔

"اجی کسانوں کا خون کون چوس سکتا ہے اب۔ خدا بھلا کرے تمہاری حکومت کا۔ ختم کر دیں سب زمینداریاں۔ بھیک منگوا دی پشتینی رئیس زادوں کو۔"

"شکر و احسان ہے خدا کا کہ یہ مبارک دن آیا۔ مگر تم تو بھیک نہیں مانگتیں پھر کیوں حکومت کو بُرا بھلا کہتی ہو۔"

"میرے دشمن بھیک مانگیں۔ واہ ——— اور آپ کا بس چلتا تو بھیک بھی منگوا دیتے۔ آپ کی آمدنی پر میرے گھر کا خرچ نہیں چلتا ہے حضور۔ خدا جنت نصیب کرے میرے ساس سسر کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ اب بھی تمہارے بچے پل رہے ہیں اور جب چاہتے ہو کوئی چیز بیچ کر اپنی شاہ خرچیاں پوری کرتے ہیں۔"

"آج معلوم ہوا کہ تم میں بھی وہ جونک والی صفت موجود ہے جو زمینداروں کا خاصہ ہے کہ دوسروں کا خون چوس کر عیش کیا جائے۔ سچ ہے اثر کہاں جا سکتا ہے۔"

"اے ہے بڑے آئے عیش کرانے والے۔ بائیس برس ہو گئے تمہارے ساتھ مصیبتیں جھیلتے اور ان بچارے کو عیش نظر آتے ہیں یہ۔" صفیہ کی آواز بھاری ہوگئی۔ حبیب میاں نے دیکھا کہ مذاق میں یہ تو ہتھے سے اکھڑی جا رہی ہیں تو کھسیا کر ہنس پڑے۔

"بس بگڑ گئیں؟ پھر کیوں جھیلیں ہمارے ساتھ مصیبتیں۔ کیوں ساس سُسر کے

ساتھ رہ کر عیش نہ کیے۔"

صفیہ مجبوراً مسکرائیں: "ہاں آپ تو یہ چاہتے ہیں بس کہ کارندہ کا نام اور ذکر نہ آئے۔ مگر مجھے اب کے ان حضرت سے نبٹنا ضرور ہے۔"

کوئی اور ہوتا تو سمجھتا کہ میاں بیوی لڑ رہے ہیں۔ مگر گیتا اتنے عرصے میں خوب جان گئی تھی کہ یہ نوک جھوک محض ایک دوسرے کو چھیڑنے کے لئے ہوتی ہے۔ ورنہ دونوں ہم خیال، ہم مذاق، ایک جان دو قالب ہیں۔

حبیب میاں نے گیتا سے کہا: "ارے ہاں بیٹی میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کتنا بھلکڑ ہوتا جا رہا ہوں۔" انھوں نے اپنے اونچے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کیا بھول گئے میاں؟ کیا مجھے نوکری مل گئی؟" بیتابی سے گیتا نے پوچھا

"ارے نہیں باؤلی۔ نوکری ایسی آسانی سے نہیں ملتی اور وہ بھی صرف بی اے پاس کو۔"

"صرف بی اے پاس؟" مایوسی سے گیتا نے کہا۔ جس میں چوٹ کھائے ہوئے غرور کا دُکھ بھی شامل تھا۔

"ہاں بھئی — بی اے کے بعد جب تک کوئی ٹریننگ نہ ہو ڈھنگ کی نوکری ملنا بہت مشکل ہے۔

"خیر — مجھے اس وقت تو یہ بتانا تھا کہ کملا نگر میں میرے ایک بچپن کے دوست سُندر سنگھ ہیں۔ کچھ دن ہوئے ان کا ایک خط میرے پاس آیا تھا، تمھارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں؟ کون ہیں یہ سندر سنگھ؟" گیتا نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارے ماموں ہیں۔ تمھاری ماں کے چچا زاد بھائی۔ انھیں یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ تم میرے پاس ہو۔ ویسے ہی پوچھوایا تھا کہ شاید تمھیں معلوم ہو کہ سکندر پور

میں للتا دیوی رہتی تھیں۔ اب سُنا ہے کہ ان کی وفات ہو گئی۔ معلوم کر کے لکھو کہ ان کی لڑکی کہاں ہے۔"

گیتا ان رشتہ دار کا ذکر سُن کے کچھ خوش نہیں ہوئی۔ تیوری پر بل ڈالے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"تم چپ کیوں ہو گئیں۔ سندر سنگھ بڑا اچھا آدمی ہے۔" وہ جانتے تھے کہ گیتا رشتے داروں سے کتنی بیزار و بدگمان ہے۔

"اتنے دن سے انھوں نے پوچھا نہیں۔ کوئی خیر خبر نہ لی۔ اب کیا خیال آیا؟"

"انھیں بہت دن تک تمھاری ماں کی وفات کا حال ہی معلوم نہیں ہوا پھر اِدھر اُدھر پوچھ گچھ کرتے رہے۔ اتفاق سے مجھے لکھا۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ تمھاری بچی میرے پاس ہے۔"

"میں ان کی نہیں —— آپ کی بچی ہوں۔" بھرائی آواز میں گیتا نے کہا۔

حبیب میاں کے باہر جانے کے بعد صفیہ بیگم بولیں "گیتا اتنی پریشان کیوں ہوتی ہے بیٹی؟"

"آپا میں سوچ رہی ہوں کہ یہ ماموں صاحب کوئی نیا گل نہ کھلائیں۔ میں آپ کے سوا دنیا میں کسی کو اپنا نہیں سمجھتی۔ کہیں ان رشتے داروں کی بدولت مجھے آپ سب سے چھٹنا نہ پڑے۔" اور اس نے اپنے آنسو چھپانے کو سر اور جھکا لیا۔

"کس کی مجال ہے کہ میری بیٹی کو چھین سکے۔ اچھا جاؤ۔ اوندھی سیدھی باتیں نہ سوچو۔ جا کر تیاری کرو۔ اپنے اور میرے دونوں کے جانے کی۔ پرسوں صبح ہی روانہ ہو جائیں گے۔" صفیہ اُٹھ کر باہر جاتے ہوئے بولیں۔

گیتا چپ چاپ آئینے کو تکتی رہی جہاں غور سے دو آنکھیں اسے دیکھ

رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں خوف تھا، ہیجان تھا، درد تھا، کچھ یادیں تھیں کچھ اندیشے تھے۔

۲

خالدہ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ آسمان پر ستارۂ صبح ابھی تک چمک رہا تھا۔ نسیم سحر میں بڑی لطیف نرمی اور خنکی تھی۔ بڑی اماں، پھوپی سکینہ، کلو سب محوِ خواب تھے۔ ٹھنڈی ہوا نے خالدہ کو تھپکا اور سوچا" اس نے اوندھی ہو کر تکیے میں منھ چھپا لیا۔ مگر کوئل کی مسلسل کوکو — کوکو — اور کوے کی کائیں کائیں نے اسے سونے نہ دیا۔ پھر کام بھی تو کتنے کرنے ہیں۔ آنکھیں ملتی اٹھ کر بیٹھ گئی، منھ منھ میں کلمہ پڑھا، ایک، دو جمائیاں آئیں۔ ایک نیم شکن انگڑائی لی اور کود کر چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ " توبہ اللہ میاں — کتنی جلدی صبح کر دیتے ہیں آپ۔"

برابر کے کھٹولے پر کلو بچپن کی نیند میں مگن پڑی تھی۔ شلوار کے پائنچے رانوں تک چڑھے ہوئے، منھ آدھا کھلا، آنکھیں نیم وا — گردن تکیے کو چھوڑ کر پیٹھ سے لگ گئی تھی جیسے لقا کبوتری ہو۔ خالدہ نے اس کا سر سیدھا کیا، پائنچے نیچے کھسکائے اور مڑی۔ چبوترے پر بڑی اماں اپنی بانوں کی کسی ہوئی چارپائی پر جس کی پائنتی روزانہ شام کو پابندی سے کھینچی جاتی تھی، سفید چادر اوڑھے سیدھی سیدھی پڑی تھیں۔ " توبہ جیسے کوئی مردہ پڑا ہو" خالدہ نے سہم کر سوچا لیکن ان کے گلے سے نکلنے والی مسلسل خرر — خرر — خرر کا نغمہ اس کا ثبوت تھا کہ وہ زندہ ہیں — اور یوں بھی ماشاءاللہ بڑی اماں — اسے بڑی لمبی عمر ہوئے گی

ان کی۔ اور خالدہ خود ہی مسکرا پڑی۔

"آج سکینہ پھوپی بھی اب تک سو رہی ہیں؟ کیا بات ہے؟ وہ تو بہت سویرے اٹھتی ہیں؟ اور بندو ــــ اے ہے بے چارا ایسا مدہوش ہے جیسے سارے گدھے گھوڑے بیچ کر سویا ہو ــــ اور ابا جی ذرا دیر میں آجا دیں گے ــ" پہلے خالدہ کو خیال آیا کہ جا کر آگ جلائے ــــ پھر سوچا اُٹھ اب تک تو سب سو رہے ہیں کیوں نہ کوٹھے پر جایا جائے؟

منھ پر دو چھپکے مار، نماز کو گول کر وہ دبے پاؤں زینے کی طرف بڑھی۔ "بڑی اماں دیکھ تو رہی نہیں ــــ اور پھر ابھی تو ــــ خاصا وقت ہے نماز کا۔" وہ مڑ مڑ کر بڑی اماں کو دیکھتی جاتی تھی کہ کہیں وہ اُٹھ تو نہیں گئیں؟ نہیں تو صبح صبح ان کا لکچر شروع ہو جائے گا۔ "اے ہے خلن باولی ہے کچھ ــ کوٹھے پر کیا کرنے جاتی ہو۔ سیڑھیاں نگوڑی سب ٹوٹی گھسی، چھت جگہ جگہ سے جھک گئی ہے۔ نامراد گر گرا پڑے گی۔ اور پھر ــــ نوج کنواری شریف بیٹیاں کوٹھوں پر کدکڑے لگاتی پھریں۔" مگر خالدہ کو جب موقع ملتا ان کے حکم کی خلاف ورزی کرنے سے نہ چوکتی تھی۔ "ایک تو ابا جی جمنا پر نہیں جانے دیتے، ہائے کتنا سندر سین ہوتا ہے اس وقت وہاں کا۔ اور بڑی اماں چاہتی ہیں چھت پر سے بھی نہ دیکھوں۔"

اس نے دھیرے سے زینے کے کواڑ کھولے۔ بھاری بوسیدہ کواڑوں نے صدائے احتجاج بلند کی، خالدہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ مگر خوف پر شوق غالب آیا اور دم بھر میں وہ اپنی وسیع چھت پار کر کے منڈیر کی اونچی دیوار پر چڑھ کر باہر کے نظارے میں محو ہو گئی۔

کچے مکانوں اور گھنے باغوں کے اس پار چوڑے ریتلے کنارے سے پرے، صبح کے دھندلکے میں جمنا محو خواب تھی۔ یورپ کی اُدر اُوشا کا کچا سونا بکھرنا

شروع ہوگیا تھا جس نے جمنا کے گدلے پانی کو سنہری رنگ میں رنگ دیا تھا۔
اس دھندلی شربتی روشنی میں کچھ صبح خیز لوگ دریا کے کنارے نہاتے دھوتے
یا پوجا کرتے دور سے بالکل کسی تصویر کے نقش معلوم ہو رہے تھے۔ آسمان پر دور سے
پرندوں کے جھنڈ اڑتے ہوئے آتے اور خالدہ کے سر پر سے کلکاریاں مارتے
ہوئے تیزی سے گزر جاتے۔ سامنے آم اور امرود کے گھنے باغوں کا سلسلہ چلا
گیا تھا اور خود خالدہ کا باغ تو دیوار کے نیچے ہی سے شروع ہو جاتا تھا۔ آموں سے
لدی ٹہنیاں بس ایسا لگ رہا تھا جیسے اب زمین کو چھو لیں گی۔ خالدہ کا جی مچل اٹھا
کہ وہ باغ میں جا کر گھومے، کچی امیاں کھائے، جھولا ڈالے، کوئل کی طرح
گنگنائے ——— مگر۔۔۔۔

اور اس کی ہر خواہش اور تمنا اکثر اس مگر پر ختم ہو جایا کرتی تھی۔ کاش وہ کوئل
ہوتی۔ کیسی باغوں میں پھدکتی، شاخوں میں جھولتی، دریا پر اڑتی ——— ساری دنیا
کی سیر کرتی ——— مگر اباجی اور دادا ابا کے سخت اصولوں سے ناک میں دم ہے۔
دنیا کتنی بدل گئی مگر یہ لوگ۔۔۔۔

باغ سے آگے کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا جس میں کٹے ہوئے گیہوں اور
جو کے کھلیانوں کے پاس کچھ کسان کھٹیاں ڈالے ابھی تک سو رہے تھے۔ شاید رات بھر
جاگ کر پہرہ دینے کے بعد ——

بہت سی عورتیں کولھوں اور سروں پر گھڑے مٹکیاں ٹکائے جمنا سے پانی
لینے جا رہی تھیں۔ داہنی طرف گاؤں کے کچے گھروں میں بھرپور زندگی جاگ اٹھی
تھی۔ بچوں کی چیاؤں پیاؤں، چکی کی گھرر گھرر، حقے کی گڑ گڑ، کھانسی کی کھوں
کھوں، کہیں سے سریلے گیت کی مدھر لے اور کہیں سے کسی چنچل ناری کے لڑنے
کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔

خالدہ منڈیر سے اتری۔ شفق اور گہری ہو گئی تھی اور آس پاس کے سارے بادلوں نے گلابی اوڑھنیاں اوڑھ لی تھیں۔ "اب چلوں —— بڑی اماں جاگ گئیں تو مار ڈالیں گی" لیکن وہ زینے تک ہی پہنچی تھی کہ پیچھے سے کسی نے پکارا: "اری خلن کمبخت کہاں چلی؟" اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی پیاری سکھی تارا اپنے منڈیر پر بیٹھی کھلکھلا رہی تھی۔ خالدہ بھی لپک کر پہنچی اور خود بھی دیوار پر چڑھ گئی اور دونوں بے تحاشا ہنسنے لگیں۔ ہنسی کا یہ کیا موقع تھا؟ یہ سوچے ان کی بلا۔ ان کو ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے تو آخر وہ کیوں نہ ہنسیں؟ اس ہنسی پر ان دونوں کو بڑی اماں کی پھٹکار، دادی کی ملامت، ماں جی کا غصّہ، سکینہ پھوپی کی بیزاری، ان کے تانے بھی تو سہنے پڑتے تھے۔ "ہر وقت ہی ہی ہی آخر ان نگوڑیوں کو ہنسنے کا مرض کیا ہے؟" جو لوگ بے چارے ہنسنے کی بات پر بھی منھ بسورنے کے عادی ہوں وہ کیا جانیں اس معصوم ہنسی کی لذّت۔

جب ہنسی تھمی تو باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"خلن کیسے آ گئی آج اوپر —— بڑی اماں نے روکا نہیں!"

"اور تجھے دادی نے نہیں ٹوکا؟"

"اے دادی تو پوجا کر رہی ہیں۔ مجھے جانے کیوں یہ خیال آیا کہ تو اوپر آئی ہے۔ بس چلی آئی۔"

"اللہ میاں کی مہربانی سے آج بڑی اماں بھی اب تک لمبی تانے پڑی ہیں۔ رات بھر مچھروں سے لڑی بھی تو ہوں گی۔ اللہ قسم تارا ایسا لڑتی ہیں جیسے کسی آدمی سے "اے تم غارت ہو جاؤ موؤں —— تم پر قہر ٹوٹے —— پھر آ گئے مجھے ستانے۔ اے اور کوئی نہیں ملتا کاٹنے کو —— یہ سامنے پڑے سو رہے ہیں غارت گوؤں ان کو کاٹو نہ جا کے ——" اس مزے سے خالدہ نے بڑی اماں کی نقل اتاری کہ

تارا ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی اور دیوار سے گرتے گرتے بچی۔ جب دونوں کی ہنسی
ذرا تھمی تو تارا نے پوچھا۔ "خلن کون آرہا ہے تیرے ہاں؟"

"ہمارے ہاں؟ کوئی بھی نہیں۔"

"واہ پتا جی کل کہہ رہے تھے کہ پرسوں سکندرپور سے حبیب میاں آئیں گے،
ان کی دعوت کرنی ہے۔"

"اچھا؟ اباجی نے تو بتایا نہیں ابھی۔"

اور باتوں میں یہ ہوش نہ رہا کہ سورج دیوتا نے اپنے درشن دیدیے ہیں۔
دونوں ایک دم گھبرا گئیں۔ "اے ــــ بڑی دیر ہوگئی ــــ" اور بھاگیں زینے کی طرف۔

"تارا دوپہر کو آئیو۔"

"میں کیوں آؤں؟ تو آئیونا۔"

"مت آ ــــ مر جا کر۔"

"تو نہ مرجا ــــ"

اور ایک دوسری کو یہ پیار بھری دعائیں دیتی دونوں زینے کے نیچے دوڑ
گئیں۔ خالدہ نے پہلے جھانکا۔ بڑی اماں نماز پڑھ کر دونوں ہاتھ اٹھائے باآواز
بلند ایک ایک کا نام لے کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ سکینہ باورچی خانے میں تھیں۔
وہ لپک کر اندر دالان میں گھس گئی۔ اباجی کلو کی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ "بیٹی اب اٹھ۔
دیکھ کتنا دن چڑھ آیا ہے۔ اور خالدہ کہاں ہے؟ خلن ــــ خلن؟"

"جی اباجی" سر پہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے خالدہ نے جواب دیا۔

"کہاں تھیں بیٹی؟ ذرا جلدی سے میرے لئے ناشتہ لے آؤ۔ آج بہت
کام ہے مجھے۔"

خالدہ نے شکر کیا کہ پہلے سوال کا جواب دینا نہیں پڑا، لپک کر باورچی خانہ

میں گھسی اور سینی میں ناشتہ رکھنے لگی۔ سکینہ بیٹھی گھی کی بکیاں بگار رہی تھیں۔ ایک نظر بھتیجی پر ڈالی مگر کچھ بولی نہیں۔

تارا نیچے اتری تو دادی دہی کی مٹکی لئے دودھ بلونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ تارا کی طرف ان کی پیٹھ تھی۔ ایشور نے صاف ان کی پھٹکار سے بچالیا۔ وہ جلدی سے کھونٹے پہ بندھی گائے کھولنے لگی۔ دادی نے سر گھمایا۔

"اری میری بچی۔ شاباش۔ گائے کھول کر، مرغیوں کو دانہ ڈال دے اور اس منگوا بد ماس کو اٹھا ـــــ گائے کو باہر لے جا دے؟"

تارا نے گائے کھول کر باہر بھیجی اور خود بکریاں کھول رہی تھی کہ ماں کی غصہ بھری آواز سن کر سہم گئی۔

"روز سویرے سویرے ان موئے جانوروں کی مصیبت۔ رات بھر لوگوں کے خرّاٹے اور کھانسی کی کھوں کھوں نہ سونے دے اور صبح کو یہ منحوس مرغیاں، بکریاں، گائے اور پوجا پاٹ شروع ہو جائے۔ کوئی مرے یا جئے ان سب کی بلا سے ـــــ ہے ایشور ـــــ میں کیا کروں؟" تارا کو گھورتے ہوئے انھوں نے کہا۔ بھلا تارا بچاری کا اس میں کیا دوش۔

منگل باہر سے آیا تو دادی کی زبان چلنی شروع ہو گئی۔ "اٹھ مہاراج اب اٹھا ہے۔ سارے کام پڑے ہیں اب تک اور تو سوتا رہا۔ کمینے ـــــ پاجی۔ ابھاگے۔ اس گھر میں جو ہے وہ بد دماغ نکما ـــــ کام چور نوالے حاضر ـــــ دور ہو جا میرے سامنے سے۔"

یہ "مہاراجہ" جس پر دادی بہو کا غصہ اتار رہی تھیں، آنکھوں میں چیپڑ، ناک میں گندگی، بالوں میں خاک اور تنکے، ہاتھوں میں گوبر تھوپے اس انداز سے

ان کی باتیں سن رہا تھا جیسے کوئی باؤلی بک رہی ہو۔ اس کے سیاہ رنگ پر بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھیں اور شفاف دانتوں کی لڑی چمک رہتی تھی۔ جسم پر نیلا پھٹا نیکر اور ایک چیکٹ بنیان کے سوا کچھ نہ تھا۔ گاؤں کے اس اناتھ بچے کو "ترس کھاکر" دادی نے اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔ صبح پانچ بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک مسلسل کام کا معاوضہ اسے علاوہ گالیوں، کوسنوں، تانوں تشنوں، مکوں اور تھپڑوں کے دونوں وقت موٹے اناج کی روٹی اور دال اور صبح کو گڑ کی چائے مل جاتی تھی۔ کبھی کبھار جھوٹا کھانا بھی مل جاتا جو بڑے مزے کا ہوتا تھا۔ گھر بھر میں اس سے اگر کوئی سیدھے منھ بات کرتا تو وہ تارا تھی۔ لتا اور سرندر اب تک پڑے سو رہے تھے۔ تارا نے بھائی کو اٹھایا۔

"اٹھو نا بھیا —— پتاجی آتے ہوں گے۔"

"جا بھاگ —— آئی بڑی اٹھانے والی۔ ہم امتحان کے لئے جاگ جاگ کر تھک گئے۔ اب بھی نہ سوئیں۔" اور اس نے یہ کہہ کر کروٹ بدل، دُلائی منھ پر کھینچ لی۔

"دیدی تم ہی اُٹھ جاؤ۔ تم نے تو امتحان نہیں دیا۔ ساری دھوپ آگئی گرمی بھی نہیں لگتی تمھیں۔"

"ہٹ پرے یہاں سے۔" اور لتا اوندھی ہو کر پھر سو گئی۔

تارا نے غصے سے سر جھٹکا اور پھر جھاڑو اُٹھا کر شمالی رخ دالان میں دینے لگی۔

یہ گھر خاصا بڑا تھا۔ سامنے کا دالان اور اس کے پہلو میں چھوٹا سا ایک کمرہ پختہ تھا۔ اِدھر اُدھر دو کچے دالان در دالان تھے۔ صحن خوب بڑا تھا جس کے وسط میں ایک پختہ کنواں بھی تھا جس سے گاؤں کی اونچی ذات کی عورتیں آکر پانی لے جاتی تھیں۔ سامنے کے دالان کے سوا ہر طرف ٹوٹا پھوٹا سامان،

کاٹ کباڑ بھرا نظر آرہا تھا۔ ایک دالان جانوروں کا مسکن تھا جس میں گائے کا گوبر، بکریوں کی مینگنیاں، مرغیوں کی فوج اور ایک کونے میں غلے کی بوریاں، لہسن پیاز کے ٹوکرے اور خدا جانے کیا کیا الابلا بھرا پڑا تھا۔ چبوترے پر پلنگ ٹیڑھے میڑھے پڑے تھے۔ اندر رسوئی میں دادی لیپ پوت کر رہی تھیں جہاں کی صفائی اور ترتیب سارے گھر سے مختلف تھی۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔

تارا نے سارے گھر میں جھاڑو دی اور ابھی ہاتھ دھو رہی تھی کہ ٹھاکر سندر سنگھ اندر داخل ہوئے۔

"نمستے پتاجی" تارا نے چہک کر کہا۔ آواز میں جو کھنک تھی وہ ظاہر کر رہی تھی کہ باپ سے بہت پیار ہے۔

ٹھاکر سندر سنگھ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھے۔ لتا بے ڈھنگے انداز میں پڑی سو رہی تھی۔ دوسری طرف صاحبزادے خواب خرگوش میں مست تھے۔

"اٹھئے ٹھاکر مہاراج اب بیدار ہو جائیے۔ کب تک آرام فرمائیں گے؟" غصّے کو طنز میں ڈھال کر انھوں نے کہا۔ ان کی زبان بڑی صاف اور شستہ تھی۔ لباس، انداز اور زبان سب پر دلی لکھنؤ کی تہذیب کا اثر نظر آتا تھا۔ اردو فارسی دونوں کی اعلےٰ تعلیم پائی تھی۔ ماں تو خیر ان پڑھ تھیں۔ بیوی پوربی یو۔ پی کی رہنے والی تھیں اور صرف ہندی جانتی تھیں مگر ٹھاکر نے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو بڑے شوق اور اصرار سے اردو پڑھائی تھی۔

سریندر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ بائیس تیئس برس کا تندرست اور وجیہہ نوجوان تھا۔ انداز میں لاابالی پن۔ جلدی سے باہر چلا جانا چاہتا تھا کہ باپ نے ٹوکا۔ "یہ وقت ہے اٹھنے کا؟"

"ماتا جی بڑی گرمی اور مچھر تھے ورنہ میں تو روز بہت سویرے ...."

"اٹھ جاتا ہوں۔ مندر میں جا کر پوجا کرتا ہوں، جمنا جی میں اشنان کرنے جاتا ہوں، پھر آکر دیر تک پڑھتا رہتا ہوں — شرم کرو — اسی کاہلی کی بدولت آج تک ایف اے میں پڑے ہو۔"

مادی، سوئی میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ آخر نہ رہا گیا۔ "سندر! بس چپ ہو جا۔ کیوں لڑکے کے پیچھے پڑ گیا سویرے سویرے۔ وہ تو بہت جلدی اُٹھتے ہے روز۔ آج اس کا جی ماندا تھا تو میں نے ہی کہا ابھی ذرا دیر اور سوتا ہے۔"

"ماتا جی آپ نے ہی اسے بگاڑا ہے۔"

"چل ہٹ، آیا بڑا اب مجھے دوش دینے والا۔ رات رات بھر جاگ کر پیا کی ہے بے چارے نے۔ ذرا سو گیا تو کیا ہوا۔ اپنی لڑکی کو نہیں دیکھتا۔ بیٹی ذات ہو کر اب تک پڑی سو رہی ہے۔ اسے بھی میں نے بگاڑا ہوگا۔"

"اس کو بگاڑنے کے لئے دوسرے لوگ موجود ہیں۔" جھلا کر سندر سنگھ نے کہا۔

لتا بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی اور جا کر ماں کی پیٹھ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ منھ سرخ، آنکھوں میں آنسو۔

تارا نے آہستہ سے باپ سے کہا۔ "دیکھا پتا جی! اب اُٹھی ہیں۔ کوئی کام نہ کاج اور جا کر ماں جی سے شکایتیں الگ کر رہی ہیں۔"

ٹھاکر سندر سنگھ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ذرا دیر بعد پکارا۔

"لتا — لتا۔"

"کیا ہے پتا جی؟" روٹھی آواز میں جواب ملا۔

"اب بھی جاکر وہاں بیٹھ گئیں۔ یہ نہیں ہوا کہ مجھے ناشتہ ہی کرا دو۔"

"ائے پتاجی — تارو نے اب تک آپ کو ناشتہ نہیں کرایا۔ ارے منگلوا — منگلوا — کہاں مر گیا — چل جلدی ادھر آ —" پیر پٹکتی ہوئی تارا رسوئی میں گھسی اور فوراً ہی ایک تھالی کے جھنجھنا کے گرنے کی آواز آئی۔

تارا کی ماں اب کمرے سے دالان میں نکل آئی تھیں اور سخت غصے میں بھری بیٹی میاں کی طرف ٹیڑھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس گھر میں کوئی کام جو ڈھنگ سے ہو۔ صبح سے بھوکی بیٹھی ہوں۔ اتنا کسی سے نہ ہوا کہ ایک پیالہ دودھ دے دیتا۔ کرے تو لتا — نہ کرے تو لتا۔ اور کسی کو میری پرواہ ہی کب ہے۔"

تارا نے بے بسی سے باپ کو دیکھا اور سر جھکا کر آنسو پی گئی۔ سندر سنگھ اب اور ضبط نہ کر سکے۔

"تارو صبح چار بجے سے اٹھی گھر کے کام کاج میں لگی ہے اور تم ہو کہ اُلٹا اسی کو بُرا بھلا کہہ رہی ہو۔ اسے نہیں کچھ کہا جو اب سو کر اُٹھی ہے۔"

سیتا دیوی کا پارا اب بہت اوپر چڑھ چکا تھا۔ بھلا سندر سنگھ کی اتنی مجال کہ اس طرح انھیں ٹوکیں۔" ہاں ہاں وہ تو گھر بھر میں ایک میں بری ہوں ایک میری بچی۔ اور تو سب دودھ کے دھوئے پاک صاف ہیں۔ اس کی دشمنی نہیں یہ بھی میری دشمنی ہے۔ اس کی ہنیں میری کاٹ کی جاتی ہے۔ بس ہم دونوں ماں بیٹی پڑے پڑے کھاتے ہیں۔ ہائے ایشور مجھ نصیبوں جلی کو موت بھی نہیں آتی۔ ساری عمر ان ناگنوں کے پیچھے جان دی۔ کبھی سکھ نہ نصیب ہوا اسی لئے تو لا کر اس اجڑے گاؤں میں ڈالا ہے کہ نہ میرا کوئی ناتی آئے نہ سکھ دکھ کا شریک۔ جلا جلا کر، گھلا گھلا کر، مار ڈالیں تو کلیجوں میں ٹھنڈک پڑے۔

سوا گاؤں کیا شمشان ہے شمشان ۔ نہ بجلی نہ نل ۔۔۔ نہ نوکر چاکر ، نہ پھل ، مکھن ، بسکٹ مٹھائی ۔۔۔ نہ کپڑا لتے نہ جوتا ۔۔۔ ہے پرماتما ۔۔۔ کسی کی قسمت میری جیسی نہ ہو ۔۔۔"

زبان میں پہلے روانی تھی ، پھر رقت ، پھر ترحم پیدا ہوا اور ہوتے ہوتے ہچکیوں اور سسکیوں نے ہسٹریا کی کیفیت پیدا کر دی ۔ لتا رسوئی سے بھاگتی ہوئی آئی اور ماں کی کمر سے لگ کر خود بھی ٹسک ٹسک کر رونا شروع کر دیا ۔ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی چھوٹی بچیوں کی طرح منہ بسور کر رو رہی تھی ۔ تارا کو باوجود اس کے کہ اس وقت سخت رنج تھا ، غصہ تھا ، پریشانی تھی مگر ہنسی آ گئی جسے اس نے چھپا لیا ۔

سندر سنگھ نے دو بار کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ۔ مگر پھر بند کر لیا وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ ڈیوڑھی کی طرف جانے لگے ۔۔۔ ماں چیختی رہ گئیں ۔ "اے بھیر تو جا سندریا ۔۔۔ یہاں تو آ ۔۔۔ میں پوری بھابی بکائے بیٹھی ہوں ، مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

تارا کی آنکھوں میں رکے آنسو گالوں پر لڑھک آئے ۔ بچارے پتا جی ۔

۳

صدیق حسن اور سندر سنگھ کے خاندانوں میں کئی پشتوں سے تعلقات چلے آتے تھے ۔ دونوں کے سکر دادوں نے اکٹھے ہی یہ ٹیلہ جس پر یہ دونوں حویلیاں واقع تھیں خریدا تھا ، ساتھ ہی شاندار حویلیاں تعمیر کی تھیں ۔ حویلیوں کے ساتھ ہی ٹیلے کے سرے پر جہاں سے نشیب میں بہتی ہوئی جمنا کی بہار نظر آتی تھی ، دونوں

دوستوں نے برابر اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لئے چھوٹا سا مندر اور ایک ننھی سی مسجد تعمیر کرائی تھی۔۔ مدت ہائے دراز سے یہ مندر اور مسجد یوں ہی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے محبت و اتحاد کا نغمہ گا رہے تھے۔ زمانہ بیتا، دنیا بدلی، سیاست کے میدان میں عجیب عجیب کھیل کھیلے گئے۔ راجا پرجا کے تعلقات میں فرق آیا، ہندو مسلمانوں کی محبت و یکجہتی مخالفت اور نفرت میں بدلی۔ بدیسی حکومت کی پالیسی کی بدولت سارے دیس میں مندر اور مسجدوں پر جھگڑے ہوئے۔ پھر آزادی آئی تو دوست دشمن بن گئے، ایک دوسرے کا خون بہایا، بھائیوں نے بہنوں کی عصمت لوٹی۔ لوگ گھر وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگے۔ اور بہیمیت اور درندگی کے ایسے خوفناک مناظر سارے دیس میں نظر آئے کہ انسانیت نے شرم سے منھ چھپا چھپا لیا۔ اور دیش کے سچے سپوت انسانیت کے پرستار، محبت و اتحاد کے عاشق نے بھائیوں بھائیوں میں پھر سے صلح و اتفاق کرانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائی۔ اور آخر کار اس عظیم مقصد کی خاطر شہادت کا جام پیا۔۔۔ اور اس مہان دیش کو پھر ایک بار یہ بتا گیا کہ ہندوستان کا آدرشش محبت و پیار ہے، نفرت اور انتقام نہیں

لیکن ان بڑے بڑے واقعات کا اثر کملا نگر پر اتنا نہیں پڑا جتنا اور شہروں اور دیہاتوں پر۔ یہاں ہندو مسلمانوں کی آبادی قریب قریب برابر برابر تھی۔۔۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے، جن میں اکثریت کسانوں اور کھیت مزدوروں کی تھی۔ کچھ باہر کے عناصر نے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد بھی، آپس کے تعلقات خراب کرنے کی کوشش کی، خوف اور دہشت بھی پھیلائی، جس کے نتیجے میں کچھ کھاتے پیتے گھرانے پاکستان چلے گئے، لیکن بحیثیت مجموعی یہاں کے عام لوگوں نے اپنی زندگی کی رفتار بہت کم بدلی۔ نہ انھوں نے جھگڑے فسادوں

میں حصہ لیا، نہ ایک دوسرے کا گلا کاٹا، نہ مندر پر جھگڑا ہوا نہ مسجد کو شہید کیا گیا۔ ہاں کشیدگی یہاں بھی تھی، مگر وہ ہندو مسلمان میں کم اور راجہ پرجا میں زیادہ تھی۔ جس کی بنیاد اقتصادی بدحالی اور معاشی لوٹ کھسوٹ تھی۔ صدیوں کے دبے کچلے مصیبت اور افلاس کے ماروں کو اپنے حقوق اور اپنی خودی کا کچھ احساس ہو چلا تھا اور انھوں نے "مالکوں" سے دُر نا کم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ان پر اور زیادہ سختی کی جانے لگی تھی۔ لیکن جب حالات بدلے، زمینداری سسٹم بالکل ختم کر دیا گیا تو یہ تلخی بھی کم ہونے لگی۔ اور اس وقت کملا نگر بظاہر ایک سُست رفتار، نرم رو ندی کے مانند تھا جو طوفانوں اور سیلابوں کے ہنگاموں سے بے خبر خاموشی سے اپنے راستے پر بہے چلی جاتی ہے۔

اس مندر اور مسجد میں اب وہ رونق تو نہ رہی تھی جو بیس پچیس سال پہلے ہوتی تھی، اس لئے کہ کچھ عقیدت مند پاکستان چلے گئے تھے، کچھ بھگتوں نے بڑے شہر جا لبائے تھے، نوجوانوں میں مذہبی لگن یوں بھی کم ہوتی ہے، اور اس بحرانی دور میں شہر تو شہر دیہاتی نوجوان بھی مذہب سے نہ سہی، مذہبی پابندیوں سے بچنے لگے ہیں۔ پھر بھی صبح شام دونوں عبادت گاہوں میں کچھ نہ کچھ رونق ہو ہی جاتی تھی۔ صبح شام مندر میں کچھ بھگت بھجن گاتے اور پوجا پاٹ کرتے لیکن دن کا بیشتر حصہ ٹھاکر سوہن سنگھ ہی کا یہاں گزرتا تھا۔ مسجد میں بھی فجر کے وقت ابن میاں کی اذان کی آواز سن کر گاؤں کے کچھ کسان، کچھ جلاہے اور تیلی وغیرہ لپکے ہوئے آتے اور "فرضین" ادا کر کے چلے جاتے۔ مغرب عشا کے وقت بھی کچھ نمازی جمع ہو جاتے تھے۔ البتہ ظہر عصر کا وقت زیادہ تر خالی جاتا تھا اور صرف ابن میاں اور ان کے پیچھے بندو یا صدیق حسن ہوتے تو وہ نماز ادا کرتے نظر آتے تھے۔

ٹھاکر سوہن سنگھ پوجا کے بعد ایک ہاتھ توند پر پھیرتے اور دوسرے سے اپنے گھٹے ہوئے سر پر لٹکتی ہوئی سفید چٹیا کو بل دیتے ہوئے، مندر سے برآمد ہوئے۔ خوب لمبے تڑنگے گورے چٹے۔ لمبی لمبی سفید نوکیلی مونچھیں اور آنکھوں میں اب بھی غصّے کی سرخی اور خشمناکی۔ وہ آکر چارپائی پر بیٹھے ہی تھے کہ ابن میاں مسجد سے موٹے دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے باہر آئے اور ٹھاکر کو دیکھ کر خود بھی ادھر ہی مڑ گئے۔ ان کی چال کا وقار، چہرے کا غرور اور رکھ رکھاؤ کا انداز بتا رہا تھا کہ پرانے زمینداروں کی باقیات میں سے ہیں۔ لٹّھے کا میلا پاجامہ کیکری بنا ہوا کرتا، سر پر کڑھی ہوئی دوپلی ٹوپی جس میں سے سفید بالوں کی جھالر باہر لٹکتی نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں بلا کی چمک اور آواز میں شیر کی سی گرج۔ وہ اپنی لمبی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹھاکر کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"کہیئے ٹھاکر صاحب خیریت؟ کیا حال چال ہیں؟"

"ارے ابن میاں کیا حال پوچھتے ہو۔ دن پورے کر رہے ہیں اب تو۔ ہم لوگوں کا زمانہ اب ختم ہو چکا بھائی۔"

"کہتے تو سچ ہو دوست۔ اس کل جگ میں جینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دنیا ہی بدل گئی دس برس میں۔ کسان لاٹھ کا بچہ بن گیا۔ زمیندار چمار سے بدتر ہو گیا۔ ساہوکار کو کوئی دو ٹکے کو نہیں پوچھتا اور مزدور کے راج کے چرچے سننے میں آتے ہیں، ہم تو انگشت بدنداں زمانے کی نیرنگی دیکھا کرتے ہیں کیا تھا کیا ہو گیا؟"

"بھائی جان یہ جو آپ کی قومی حکومت آئی ہے نا اس نے ہم لوگوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ ہائے انگریز کیسا شریف پرور حاکم تھا۔ چھوٹے، بڑے،

شریف رذیل کو پرکھنے والا۔ وہ کیا گیا ہم پر تو آسمان ٹوٹ پڑا۔ ریاستیں ہضم، تعلقے ختم، زمینداریاں چٹ کر لی گئیں۔ شریفوں کو گرایا گیا، کمینوں کو سر چڑھایا، غلام آقا بن گئے، آقا فقیر ہو گئے — بے حیا ہیں کہ مرتے بھی نہیں —"

"ہاں میاں انقلاب اسی کا نام ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جدھر سے نکل جائیں لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ ہر وقت دس پانچ آدمی ہاتھ باندھے خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا، خوش حالی کی گنگا بہتی تھی — ایک یہ زمانہ ہے — خیر شکر ہے اس کا جس حال میں رکھے"

ان دونوں بڈھوں کا یہ محبوب موضوع تھا۔ تقریباً ہر روز یہی سب باتیں ہوا کرتی تھیں۔

"ادہ میاں باہر کیا اندر بھی یہی حال ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ سرندر ہے، مردود پورا صاحب کا بچہ بن گیا ہے۔ لونڈیاں میم بنتی جارہی ہیں۔ بہو کا مزاج نہیں ملتا۔ بڑھیا بھی سٹھیا گئی ہے — بس سندر ہے بچارا جو ذرا سا خیال کرتا ہے۔ بھیا — یہ دنیا ہماری تمہاری نہیں —" بوڑھے ٹھاکر نے مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

"اجی لعنت کرو اس سالی دنیا پر — ہم نے تو میاں خود اپنی ایک دنیا بسالی ہے۔ برس ہو گئے سوا تمہارے سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔ بس اپنی کوٹھری میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ صدیق کو برا لگتا ہے۔ لگا کرے۔ جب اس کے پاس لوگ آتے ہیں تو قسم خدا کی میں کواڑ اندر سے بند کر لیتا ہوں۔ اب سنا ہے کل ان کے کوئی دوست شہر سے تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہدیا کہ بھئی میں نہیں ملوں گا —"

"حبیب میاں آرہے ہیں نا؟"

ہاں ہاں وہی چھٹن۔ اپنے یار شدن کا لونڈا ـــ پہلے تو خاندان کی بڑی بدنامی ہوئی تھی اس کی وجہ سے۔ انگریز سے لڑا، کانگریسی بنا، جیل گیا، سرکار اس کی دشمن ہوگئی۔ بچارا شدن اسی غم میں چل بسا۔ رمضان میاں تو اپنا دیس چھوڑ چھاڑ کر پاکستان ہی چلے گئے۔ اب سنا ہے کہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ پارلیمینٹ کا ممبر ہے۔ حکومت میں رسوخ ہے۔"

"اجی انھیں لوگوں نے تو ہماری زمینداریاں ختم کرائی ہیں۔ جس تھالی کھائیں اسی میں چھید کریں۔ جس شاخ پر بیٹھیں اسی کو کاٹیں۔"

"اور کیا میاں ـــ یہ لوگ سارے زمینداروں اور رئیسوں سے تو چندے لیا کرتے تھے اور اب انھیں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ـــ سنا ہے چھٹن کو تو وزارت مل رہی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔"

"اجی آج نہیں کل وزیر بن جائے گا ـــ مرے تو ہم ایسے۔"

دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی اور دونوں بڈھوں کے پیٹ میں مروڑیاں سی اٹھ رہی تھیں۔ منگل آکر ٹھاکر کو بلا لے گیا۔ ابن میاں نے کرتے کی جیب سے ایک آثارِ قدیمہ قسم کی جیبی گھڑی نکالی۔ وقت دیکھا۔ سات بجنے میں دو منٹ تھے۔ وہ اندر کی ڈیوڑھی کی طرف مڑ گئے۔

دونوں لمبی تاریک ڈیوڑھیوں سے گزر کر وہ صحن میں داخل ہوئے۔ یہ گھر جو کبھی بڑا وسیع شاندار اور آرام دہ ہوگا اب زبانِ حال سے اپنے مکینوں کی خستہ حالی کی داستان سنا رہا تھا۔ جنوبی حصہ کھنڈر بن چکا تھا جہاں تمام ملبہ، اینٹیں، کاٹھ کباڑ، ٹوٹے ہوئے برتن وغیرہ کے انبار لگے تھے اور اس سامان نے خود بخود ایک دیوار سی یا روک سی بنا دی تھی۔ شمال کی طرف ایک

بڑا سا دالان در دالان تھا جس کے موٹے پایوں کے ستون اور دیواروں کے چوڑے چوڑے آثار حویلی کی بچی کھچی شان کو سنبھالے ہوئے ہیں لیکن جس کی چھت نیچے کو جھکی ہوئی، زمین گو برا اور مٹی سے لپی ہوئی ہے۔ اندر کے دالان سے دونوں طرف پرانے طرز کی صحنچیاں ہیں اور ان کے اندر کوٹھریاں۔ دوسری طرف ایک چھپر ہے جس میں بکریاں بندھتی، مرغیاں بند ہوتیں اور لہسن پیاز، دالوں، گیہوں، جو، مٹر وغیرہ کا اسٹاک جمع کیا جاتا ہے۔ بڑے دالانوں میں صحنچی کے اندر ایک لمبی سی اندھیری کوٹھری ہے جس میں اناج کی بوریاں، دالوں کے مٹکے، گڑ کی بھیلیاں، لہسن پیاز کے جھوے، دھانوں کے بورے، جہیزوں کے بھاری سیاہ برتن، لکڑی کے بڑے بڑے خالی صندوق، چوہوں کے بل ایک کالے ناگ کا مفروضہ مسکن ہے۔ اس کوٹھری میں بڑی اماں کے سوا کوئی اور شاذ و نادر ہی جاتا ہے۔ ناگ دیوتا صرف انھیں کا احترام کرتے ہیں۔ کسی اور کی ان کی خلوت میں مداخلت کی ہمت نہیں ہوتی۔

ابن میاں اندر داخل ہوئے تو بڑی اماں خلن پر بگڑ رہی تھیں "تیرا چیا چل گیا ہے۔ خلن سے کوٹھریا میں کیوں گئی؟ اگر اللہ نہ کرے وہ دیکھ لیتے۔ غصہ آجاتا انھیں ––– تجھے جو چاہیئے تھا مجھ سے کہا ہوتا ––" خلن منھ پھلائے کنوئیں کے پاس کھڑی تھی۔ وسیع کچے صحن کے ایک کونے میں گدلے پانی کا یہ گہرا کنواں سب سے زیادہ خلن کے لئے مصیبت تھا۔ جس میں سے دو چار بالٹیاں بھر کر اس کے بازوؤں میں دن بھر درد رہتا تھا۔ مگر گاؤں کی عورتیں مزے سے پانچ پانچ سات سات گھڑے بھر کرلے جاتی تھیں۔ پاؤں کی چاپ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ابن میاں ڈیوڑھی سے آرہے تھے۔ اس نے جلدی سے ڈھلکے آنچل سے سر ڈھکا اور باورچی خانے کی طرف دوڑ گئی۔ "پھپھی۔ دادا میاں آگئے۔"

ابن میاں کچھ بڑبڑاتے سر جھکائے باورچی خانے کے سامنے بچھے تخت پر بیٹھ گئے۔ ذرا فاصلے پر بڑی اماں بیٹھی دودھ بلو رہی تھیں اور اندر باورچی خانے میں جو کبھی چھوٹا سا دالان رہا ہوگا، سکینہ باپ کے لئے روٹی پکا رہی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے بھاوج"۔ کچھ طنز کچھ مذاق کے لہجے میں ابن میاں نے پوچھا۔ زینب بی ان کی بڑی بھاوج اور لگ بھگ ہم عمر تھیں۔ دونوں میں اس وقت سے دوستی تھی جب گیارہ سال کی عمر میں زینب بی نے پہلے پہل اس گھر میں قدم رکھا تھا وہ اپنے سے بہت بڑی عمر کے شوہر سے جتنی ڈرتی تھیں اتنی ہی ہم عمر دیور سے بے تکلف بھی تھیں۔ دیور کو دیکھ کر انھوں نے چھاچھ بھرے ہاتھ سے اپنے سفید دوپٹے کا آنچل اپنے چاندی کے تاروں پر ڈال لیا۔ دبلی پتلی، چھوٹے قد کی، تیکھے نقش و نگار اور گورے رنگ کی پینسٹھ اڑسٹھ برس کی یہ بیوی نوجوانوں کے لئے قابل رشک تھی، جس کی آنکھوں کی بینائی، دانتوں کی مضبوطی اور کھانے اور کام کرنے کا شوق جوانوں سے بڑھ کر تھا۔

"دیکھتے نہیں دودھ بلو رہی ہوں"۔

"یہ کیا بکھیڑا کیا کرتی ہو روز۔ بلویا جا رہا ہے دہی اور نکالا جا رہا ہے مکھن، چٹوری کہیں کی"۔ ابن میاں بھاوج کو آج بھی اسی انداز سے چھیڑتے اور ڈانٹتے تھے جیسے پچپن برس پہلے۔

"بس آ گئے صبح صبح میری جان کھانے؟ چٹورے تم خود ہو۔ مکھن کے بغیر نوالہ تو حلق سے اترتا نہیں میاں کے"۔

"اجی بند ڈبوں میں بہتیرا مکھن ملتا ہے بازاروں میں۔ اس جھنجھٹ کی کیا ضرورت کیا ہے"۔

"بجھے بھی قسم ہے جو آج یہ مکھن تمھیں چھونے دوں۔ اٹھا خلن یہ مکھن یہاں سے۔ نہیں تو اُتر جا دے گا ان کے کلیجے میں:" زینب بی نے پیالہ جس کی طرف ابن میاں ہاتھ بڑھا چکے تھے اپنے دوپٹے میں چھپاتے ہوئے تنک کر کہا۔ لیکن اتنے خلن آئے وہ پیالہ ان کے ہاتھ سے چھین چکے تھے۔

سکینہ اندر سے ایک بد تلعی سینی میں ناشتہ لئے باہر آئیں۔ ہاتھ سے باپ کو سلام کیا اور سینی ان کے سامنے رکھ دی۔"

"یہ — یہ — کیا ہے؟ انڈے اور پراٹھے۔ میں نہیں کھاتا یہ.... لے جاؤ یہ سب بکواس یہاں سے۔ میرے لئے بسکٹ اور چائے چاہیئے۔" ہر جملے کے ساتھ ان کے منھ سے ایک فصیح گالی تکیہ کلام کی طرح نکلتی رہتی تھی۔

"لے ہے بس نخرے نہ کر دکھاؤ۔ بسکٹ آج ختم ہو گئے ہیں۔" زینب بی نے کہا۔

"منگائے کیوں نہیں گئے؟" انھوں نے بگڑ کر کہا۔

"لاتا کون؟ ذرا خود ہی شہر جاتے تو کیا پاؤں گھس جاتے تمھارے۔" زینب بی کیا دبنے والی تھیں۔

"ہاں اور کیا اب میں جوتیاں چٹخاتا تمھارے لئے بسکٹ خریدنے جاؤں گا تم لوگ تو چاہتے ہو، کسی طرح مر جائے یہ بڈھا۔ پاپ کٹے۔ زہر نہ دیا کہ مرغن کھانے کھلا دئے۔ پنڈ تو چھوٹے کسی طرح اس ناکارہ سے۔ میں — مجھے" مگر ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ زبان لڑکھڑا گئی۔ سکینہ سینی اٹھانے جھکیں تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی جھکی آنکھوں سے بڑے بڑے قطرے سینی میں ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ سکینہ کے سامنے انھیں ہمیشہ ہتھیار ڈالنے پڑ جاتے تھے۔ وہ بہت کم بات کرتیں۔ ہر بات خاموشی سے تیوری پر بل ڈالے سہار لیتی تھیں۔ مگر ان کا

چہرہ دیکھ کر ابن میاں کے دل میں جانے کیا ہونے لگتا تھا۔ وہ فضول سی چیز جسے لوگ ضمیر کے نام سے پکارتے ہیں، ان کے چٹکیاں لینے لگتا۔ "یہ تمہارے ظلم کا شکار ـــ تمہاری ضد کی بھینٹ، تمہاری دولت پرستی کا نتیجہ ـــ" بیٹی کا بے رنگ سپاٹ چہرہ اور ویران آنکھیں انھیں ایک بنجر صحرا کی طرح لگتا تھا۔

انھوں نے گھبرا کر جلدی سے دونوں ہاتھوں سے سینی کا دوسرا حصہ پکڑ لیا۔ "نہ ـــ نہ ـــ کہاں بے جا رہی ہو اسے ـــ یہی کھالوں گا ـــ بات ہی کیا ہے ـــ ایک دن یہ مزے کی چیزیں سہی ـــ اسے ختن بیٹی ـــ ذرا اپنی دادی سے مکھن تو لے آ ہمارے لیے۔"

سکینہ نے آہستہ سے سینی پھر رکھدی اور اندر گرم پھلکا ڈالنے چلی گئیں، تاکہ پراٹھے کے بدلے سادہ پھلکا کم نقصان کرے۔ ابن میاں کی زبان کی تیزی اب ختم ہو چکی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

کلو حسبِ عادت سب سے بعد اُٹھی اور اب منھ دھوئے بغیر پراٹھے کی ضد ہو رہی تھی۔ زور سے ابن میاں نے اسے ڈانٹا ـــ وہ سہم کر رونے لگی اور خالدہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ کلّو کی عمر دس کے لگ بھگ تھی۔ ہونق شکل بنائے سارے دن گاؤں کے بچوں کے ساتھ گھومتی پھرا کرتی۔ وہ دو سال کی تھی کہ ماں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں اور صدیق حسن نے میرٹھ سے جہاں وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھے بچیوں کو اپنی ماں کے پاس کملا نگر پہنچا دیا تھا۔ گھر پر ان کی بیوہ ماں، بوڑھے چچا ابن میاں، چچا زاد بہن سکینہ اور دونوں بچیاں رہتی تھیں۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ ہر ماہ کملا نگر بھیج دیتے اور خود ٹیوشن وغیرہ کر کے اپنا خرچ پورا کرتے تھوڑا بہت سہارا اچھی زمینوں اور باغ کی آمدنی سے لگ جاتا۔ ان کی پنشن کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور بچیاں کم سن تھیں۔ ساتھ میں اتنے آدمیوں کا بار بھی تھا۔

چہیتی بیوی کی جواں مرگی، ان سب فکروں نے انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ دیکھنے میں بوڑھا چچا بھتیجے سے نانھا لگتا۔ ان کے سر کے بال ابن میاں سے زیادہ سفید اور کنپٹیوں اور بھنوؤں کے گرد کی جھریاں ان سے زیادہ گہری تھیں۔ گھر میں آتے تو مرحومہ بیوی کی یاد اور زیادہ ستاتی۔ یہ گھر جو ان کے زمانے میں سلیقے اور خوش انتظامی کا ننھا سا فردوس تھا آج انھیں کباڑ خانہ دکھائی دیتا تھا۔ نہ کوئی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کرنے والا، نہ گھر کی دیکھ بھال اور انتظام ٹھیک۔ نہ خرچ کا ڈھرا بیٹھتا نہ کسی کے پاس ڈھنگ کا جوتا کپڑا نظر آتا۔ چوتھائی آمدنی پان تمباکو، چھالیہ اور حقے میں اڑ جاتی۔ کلو تو خیر دیکھنے ہی میں دیوانی پاگل لگتی جسے گھر کنے اور ڈانٹنے کا مقدس فرض گھر کا ہر فرد ادا کرتا رہتا تھا۔ لیکن خالدہ کا بھی عجیب عالم تھا سارے دن ادھر ادھر بے مقصد گھوما اور جانے کیا سوچا کرتی۔ کسی نے کچھ کہہ دیا تو کر دیا، نہیں تو منھ لپیٹے پڑی ہے یا پان کھا رہی ہے۔ کبھی کوئی قصے کہانی کی کتاب یا کوئی رسالہ باپ لے آئے تو اسے پڑھنے بیٹھ گئی۔ دادی پھوپی دونوں لڑکیوں کو بہت چاہتی تھیں۔ مگر تربیت کرنا وہ بیچاری جانتی ہی نہیں تھیں۔ سلیقہ سگھڑاپے کا خود ان کے پاس کال تھا۔ لڑکیوں کو کیا سکھاتیں۔ ہاں کھانا پکانے میں بڑی دلچسپی تھی اور یہی فن زبردستی گھول کر خالدہ کو پلا دینا چاہتی تھیں۔ ویسے دونوں دن بھر گھر کے کاموں میں جٹی رہتیں، دونوں جفاکش محنتی اور نفس کش تھیں بعض وقت صدیق حسن شرمندہ سے ہو جاتے۔ میں ماں اور اس بے کس بہن کے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتا، وہ تو پھر بھی بہت کچھ کر رہی ہیں۔ میری بچیوں کو پال رہی ہیں۔ وہ چھٹیوں میں جب تک یہاں رہتے ان ہی پریشانیوں میں گھرے رہتے تھے۔

ابن میاں ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ صدیق حسن باہر سے آ کر ماں کے پاس بیٹھ گئے۔

"اماں کل صبح دو تین مہمان آرہے ہیں" یہ سن کر خالدہ کے کان کھڑے ہوئے۔
"کون آرہا ہے؟" ماں نے بٹوے میں سے تمبا کو نکال کر پھانکتے ہوئے پوچھا۔
"حبیب میاں، صفیہ بھابی اور شاید ان کے بچے"
"اوئی۔ ان کا اپنا گھر موجود ہے۔ ہمارے کیوں آویں گے؟" ناک چڑھا کر زینب بی نے کہا۔
"یہ گھر سرائے جو ہے" ابن میاں نے طنز کیا۔ مگر صدیق حسن ان کی ایسی باتوں کو نظر انداز کرنے کے عادی تھے۔
"اماں ان کا گھر تو ہے مگر برسوں سے بند جو پڑا ہے۔ آج کل تو ان کا کارنڈ بھی موجود نہیں۔ اب دو تین دن کے لئے کیا وہ اپنے گھر جا کر ٹھہریں گے؟ اور میرے ہی اصرار پر تو وہ آرہے ہیں۔ نہیں تو انھیں اتنی فرصت کہاں؟"
"تو آویں۔ میں نے کیا منع کیا ہے"
"کچھ انتظام ان کے لئے ——"
"انتظام کیا ہوگا۔ کھانا پک جاوے گا۔ گھر کی ایک اور مرغی کی جان پہ بنے گی اور کیا۔"
"ان کے اٹھنے بیٹھنے اور رات کو سونے کے لئے بھی تو کوئی جگہ ہونی چاہیے"
"تو کیا رات بھر میں ان کے لئے کوئی محل بنا کر کھڑا کر دیا جائے؟" زینب بی کا غصہ بھڑکا۔
"محل تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہیں ذرا صفائی کرا لیجئے کافی ہے"
"تو گھر میں کوئی کوڑیاں تو لگی نہیں ہیں کوئی؟"
"یہ سب میں نہیں جانتا، مگر گھر کی حالت اس قابل نہیں کہ صفیہ بھابی یہاں بیٹھ بھی سکیں"

"تو میاں مجھ سے تو اس بڑھاپے میں اور ہڈیاں پیلی نہیں جاتیں۔ دن رات مرتی کھپتی رہتی ہوں۔ ہزار بار کہا میاں اپنا گھر لبساؤ۔ گھر والی آئے لڑکیوں کی دیکھ بھال بھی کرے، اپنا گھر بھی سنبھالے۔ میں کمبخت ماری کب تک بیٹھی رہوں گی۔ مگر ــــ"

بیٹے کا چہرہ دیکھ کر وہ ایک دم چپ ہوگئیں۔ صدیق حسن کے چہرے پر رنج و دکھ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چند لمحے خاموشی رہی جسے ابن میاں کی گرجدار آواز نے توڑا۔

"تم ــ بالکل ــ بالکل سٹھیا گئی ہو بھاوج ــ نضول ــ۔ لایعنی ــــ بیہودہ ــ حماقت۔"

خالدہ ایک ستون کی آڑ میں کھڑی سب باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اوڑھنی سے رگڑ کر آنسو بھری آنکھیں پونچھیں اور باپ کے پاس آکر بولی: ابا۔ ایک بات کہوں؟"

"ہاں بیٹی"

بڑے دالان میں صفائی کرا کے پردہ باندھ دیا جائے گا، ایک طرف مرد بیٹھ جائیں گے دوسری طرف عورتیں۔"

"تم صفائی کرالوں گی؟" حیرت سے صدیق حسن نے کہا۔

خالدہ کو سخت ندامت ہوئی۔ ابا مجھے بالکل ہی نکمّا سمجھتے ہیں۔ آج میں دکھادوں گی انھیں کہ میں بھی کچھ کرسکتی ہوں۔

"آپ پریشان نہ ہوں ابا۔ میں سب کرلوں گی۔" ہمت کر کے اتنا بڑا دعویٰ خالدہ نے کر ہی دیا۔

"نہیں ــــ اماں نہیں چاہتیں تو میں ان لوگوں کو ٹھاکر کے ہاں ٹھہرادوں گا۔"

ناگواری سے صدیق حسن نے کہا۔

"لو اور سنو۔ وہ وہاں کیسے رہیں گے۔ ان کے ہاں بھلا کیسے کھائیں گے"

صدیق حسن نے ذرا سا مسکرا کر کہا۔" اماں وہ لوگ یہ چھوت چھات پاکی ناپاکی نہیں مانتے"

"اُنھ میں یہ سب نہیں جانتی۔ کھانا پک جائے گا سکینہ سے اچھا کھانا بھلا کون پکا سکے ہے"

"اور خلن صفائی کرے گی، کیوں بیٹی؟" صدیق حسن نے خالدہ سے پوچھا۔

"ہاں ابا جی، میں ساجو کو بلا لوں گی۔ ہم دونوں مل کر سب ٹھیک ٹھاک کرلیں گے۔ بس بڑی اماں سے یہ کہہ دیجئے کہ دری چاندنی جو میں مانگوں وہ دیدیں" ڈرتے ڈرتے خالدہ نے کہا۔

دادی نے پوتی کو گھورا ___ مگر کچھ بولی نہیں۔

"ابا جی، کیسی ہیں صفیہ چچی" خالدہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بہت اچھی ہیں"

"میں نے تو سُنا ہے صدیق کہ وہ پردہ نہیں کرتی۔ ہے ہے غضب خدا کا پوتڑوں کے رئیں اور ایسے شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں طوائفوں کی طرح بازاروں میں پھریں۔ یا اللہ توبہ ___ توبہ ہے میری۔" زینب بی نے اپنے کلوں پر زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"اماں صفیہ بھابی سے ایک بار مل تو لو ___ پھر دیکھنا ان کا کلمہ نہ پڑھنے لگو"

"نوج میں ایسی بے غیرت آوارہ عورتوں کا کلمہ ___"

"بیں ہیں ___ اماں کیا ہوگیا ہے تمھیں۔ زبان سنبھالو ___ صفیہ بھابی جیسی

پاکباز عورت کے دامن پر تو حوران بہشتی نماز پڑھتی ہیں۔" صدیق حسن نے کہا تو وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔

"اوہو بڑا درد ہے صفیہ بھابی کا ۔۔۔ سُنا تم نے ابن میاں۔ یہ غضب دیکھا کہ شدن میاں کی بہو اور ۔۔۔ میں کہتی ہوں ۔۔۔" انھوں نے ابن میاں کا دامن پکڑا۔

"کیا میں کہتی ہوں، میں کہتی ہوں لگا رکھی ہے۔ یہ زمانے کی ہوا ہے دنیا اب وہ نہیں بڑی بی جو تمہارے زمانے میں تھی۔ اللہ بخشے تم نے تو بھائی صاحب سے بھی بیس برس تک گھونگھٹ نکالا تھا۔ اب تو ۔۔۔ اب دیکھنا یہی تمہاری پوتیاں ایک دن اسی طرح سر منھ کھولے بازاروں میں پھریں گی، نہ پھریں تو ابن میاں نہیں چمار کہنا چمار ۔۔۔ بلکہ بھنگی" اور دو چار گالیاں پھول کی طرح اور منھ سے جھڑ گئیں۔ جس بات کی کوئی زور شور سے حمایت کرے اس کی تردید کرنا اور جس کی تردید کی جارہی ہو، اس کی حمایت کرنا ان کی عادت ٹھہری۔

زینب بی نے منھ منھ میں کہا۔ "وہ تو تم پہلے ہی سے ہو" اور پھر زور سے چیخیں۔ "نوج خدا نہ کرے ۔۔۔ ان کے دشمن، بیری، بُرا چاہنے ۔۔۔ تو ۔۔۔ جو منھ میں آتا ہے بکتے چلے جارہے ہو۔ ایسا ہوا، اللہ نہ کرے تو ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔ اور خود بھی کچھ کھا کر سو رہوں گی۔"

"کچھ کھانے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی بھاوج، بے کچھ کھائے ہی سو چکی ہوں گی۔ قیامت کے بورئیے سمیٹنے کا ٹھیکہ تو تم نے لیا نہیں ہے۔"

زینب بی کی عمر کا ذکر اور موت کا چرچا کوئی کرے تو وہ سخت چڑھ جاتی تھیں اور ابن میاں کو ان کی یہ چڑ معلوم تھی، اس لئے چھیڑ چھیڑ کر ان کی کبر سنی کا ذکر کرتے اور بُرا بھلا سُنتے۔

"میں کیوں مروں۔ تم نہ مرجاؤ۔ آئے بڑے کو سنے والے۔ میری ذرا ذرا سی بچیاں ہیں۔ ان کو پروان چڑھتے دیکھوں گی۔ جلنے والے جلتے رہیں۔ میری ابھی عمر ہی کیا ہے۔"

"ارے نہیں — ابھی تو بالی عمریا ہے تمھاری —" ابن میاں ہنس کر بولے۔
اندر دالان میں سکینہ خاموش بیٹھی تھیں۔ جانے یہ باتیں سن بھی رہی تھیں یا نہیں۔ جیسے کسی بات سے کوئی مطلب کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ ایک دم ان کو کھانسی کا دورہ اٹھا۔ کئی سال سے انھیں دمہ کی شکایت تھی اور جب کھانسی اٹھتی تو روکے نہ رکتی تھی۔ ابن میاں منھ کھولے بدحواس ان کو دیکھ رہے تھے۔ پھر چیخے۔
"ارے خلن — کلو — بندو — کیا سب مر گئے — پانی تو پلا دو اسے۔ اور بھابی وہ — وہ اس کی دوا — ہاں کیوں آتی — مر جائے تو اچھا ہے۔ اور یہ روز روز کا کھانا پکانا — زہر ہے — زہر یہ دھواں اس نامراد کے لئے —" کھانسی سکینہ کو اٹھ رہی تھی کرب ابن میاں پر تھا۔ اُنھ اُنھ — اوہ کرتے کھنکارتے اور سوال پر سوال کئے جا رہے تھے اور ان کی الجھن سے سکینہ کی کھانسی اور بڑھ رہی تھی۔ آخر صدیق حسن کو کہنا پڑا۔ "چچا میاں خدا کے لئے ذرا خاموش رہیئے۔"

انھوں نے غرا کر بھتیجے کو دیکھا اور پھر کھسیا کر سر نیچا کر لیا۔
باپ اور دادا کے باہر جانے کے بعد خالدہ نے ساجد کو بلایا اور سارے دن لگ کر دونوں نے سارے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ کلو بھی آج باہر کھیلنے نہیں گئی بلکہ دوڑ دوڑ کر کام کرا رہی تھی۔ اندر سے دری اور چاندنی اور ایک چھوٹا سا قالین نکالا گیا۔ چینی کے برتن، تانبے کی کشتی نکلی۔ تخت بچھا، پلنگ پر پلنگ پوش ڈالا گیا۔ بیچ دالان میں صاف چادر کا پردہ پڑا۔ دادی برا بھلا کہتی جاتیں اور

چیزیں نکال کر دیتی جاتیں اور سکینہ کل کے لئے کھانا پکانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

شام کو صدیق حسن گھر میں آئے تو بہت خوش ہوئے۔ گھر زیادہ بڑا، زیادہ روشن اور بہت خوشنما معلوم ہوا، جیسے ان کی بیوی کے زمانے میں رہتا تھا۔ آخر خالدہ انھیں کی تو بیٹی ہے۔

۴

صفیہ بیگم نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ تارا، خالدہ، کلّو اور ساجو نے لپک کر ان کا خیر مقدم کیا۔ دو گھنٹے سے یہ چاروں ان کے انتظار میں بیقرار پھر رہی تھیں۔

"یہ دونوں آپ کی بھتیجیاں ہیں بھابی اور یہ تارا ہے سُندر بھائی کی لڑکی۔" صدیق حسن نے تعارف کی رسم ادا کی اور صفیہ نے دونوں لڑکیوں کو گلے سے لگالیا۔ کلّو کا خیال تھا کہ اس کا خاص طور سے نوٹس لیا جائے گا۔ چند لمحے اس نے باپ کا مُنھ دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر بولی۔

"میں ___ کلّو ___ کلّو نہیں نہیں ___ موتی بیگم ہوں چچی۔" صفیہ بیگم جلدی سے مڑیں اور ایک چھوٹی سی بھونڈی سی لڑکی کو آنکھوں میں محبت بجلیاں بھرے، مُنھ اُٹھائے، اپنی طرف تکتے پایا۔ اور جلدی سے اُسے جھک کر گلے لگا لیا۔

"ہاں بھابی یہ آپ کی چھوٹی بھتیجی ہے۔ کلّو نہ کہہ دیجئے گا۔ موتی بیگم نام ہے اس شہزادی کا۔" صدیق حسن نے ہنس کر کہا۔

صفیہ بیگم کا لڑکا سلیم جو کلّو کا ہم عمر اور ہو بہو اپنی ماں کی صورت تھا، صاف سُتھرے کپڑے، سفید کھدر کی اچکن اور ٹوپی پہنے اس کالی کلوٹی گنوار سی لڑکی کو

غصّے اور رشک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس سے ماں اتنی محبت سے مل رہی تھیں۔

"امی جان" اس نے ماں کا پلو کھینچا۔

"ارے ہاں بھئی، تم دونوں کا تعارف بھی تو کرانا ہے۔ موتی بی بی یہ تمہارا بھائی سلیم ہے۔ جاؤ سلیم موتی کے ساتھ کھیلو"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سلیم کی نظروں میں ناپسندیدگی تھی، کلو کی نگاہوں میں اشتیاق۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ پھر نظریں اُٹھیں، تیوریوں پر ذرا سے بل تھے ___ اور گردن پھیر لی۔ ذرا دیر بعد پھر کلو نے کنکھیوں سے سلیم کو دیکھا تو وہ بھی چوری چوری اسے دیکھ رہا تھا۔ کلو نے جھٹ مُنھ پھیر لیا، جیسے ہم کسی کو کیوں دیکھتے۔ سلیم نے بھی یہ ظاہر کیا کہ اسے کیا کسی کی پرواہ ہے۔ مگر چند لمحے بعد پھر ایک ساتھ دونوں کی گردنیں مڑیں اور دونوں کے پھیل سے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ چہروں پہ محبت اور دوستی کے رنگ نکھرے اور کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ دس پندرہ منٹ بعد کلو اور سلیم ایسے گھل مل گئے تھے جیسے سالہا سال کی پرانی دوستی ہو۔

ساجو کو ملوانے کی زحمت کسی نے بھی گوارا نہ کی۔ ساجو جس نے دو دن جان مار کر اس گھر کو صفیہ بیگم کے رہنے کے قابل بنایا تھا۔ جو صبح سے گھر بھر کے ساتھ صفیہ کے انتظار میں بیقرار پھر رہی تھی۔ مگر بھلا ایک غریب کسان کی مزدور بیوی سے تعارف کرانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ساجو کھسیا کر باورچی خانے میں جا بیٹھی۔

یہ لوگ اندر جا کر بیٹھے ہی تھے کہ حبیب میاں، صدیق حسن کو پکارتے ہوئے ڈیوڑھی میں گھسے۔ ان کے پیچھے گیتا تھی۔ سوتی بادامی ساڑھی ہلکا نیلا بلاؤز پہنے، دو چوٹیاں گوندھے۔ چہرے پہ گھبراہٹ سی۔

حبیب میاں کا بھی سب سے تعارف ہوا اور وہ لڑکیوں سے باتیں کرتے ہوئے تخت پہ جا کر بیٹھ گئے۔ گیتا کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا وہ وہیں ڈیوڑھی کے پاس کھڑی رہ گئی۔ زرد گالوں پہ شرمندگی کے احساس نے ہلکا گلابی رنگ پھیر دیا تھا۔ آنکھوں میں کھسیاہٹ کے مارے آنسو چھلک آئے تھے۔ ساجو نے باورچی خانے سے اس اکیلی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ "کون ہے یہ لڑکی؟ کیا حبیب میاں کی لڑکی ہے؟ پر ماتھے پہ تو بندیا لگی ہے۔ ہنہ شہر کی سبھی چھوکریاں ایسی بندیاں لگاتی ہیں" وہ بڑھ کر گیتا کے پاس آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ساجو مسکرائی، گیتا مسکرا بھی نہ سکی۔ "آؤ بی بی یہاں کیوں کھڑی ہو" اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے چلی۔

صفیہ بیگم جو اس ہنگامے میں گیتا کو بھول گئی تھیں، ایک دم چونک پڑیں۔ "ارے گیتا کہاں ہے؟ لو وہ چلی آرہی ہے۔ آؤ بی بی وہاں کیوں کھڑی رہ گئی تھیں" وہ دیکھ چکی تھیں کہ ان کا یہ ذرا سا تغافل بھی گیتا کو بہت ناگوار ہوا ہے۔

"بیٹھو بیٹی" شفقت سے صدیق حسن نے کہا اور گیتا خاموش ان کے پاس تخت پہ بیٹھ گئی۔

"یہ کون ہیں چچی جان؟" خالدہ نے چپکے سے پوچھا۔

"میری بیٹی ہے۔"

"آپ کی بیٹی ہیں؟" خالدہ نے حیرت سے کہا۔ اور باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ذرا بھی تو صورت نہیں ملتی۔

"حبیب بھائی آپ ذرا لیٹ جائیے۔ اتنے لمبے سفر سے تھک گئے ہوں گے اور بھابی آپ بھی اندر جا کر ذرا دیر آرام کیجئے" صدیق حسن نے اصرار کیا۔

صفیہ اندر دالان میں جا کر لیٹ گئیں۔ ان کے سر میں سخت درد تھا۔

حبیب میاں باہر ہی لیٹ گئے اور فوراً ہی خرّاٹے لینے لگے۔ باہر تارا اور گیتارہ گئیں۔ تھوڑی دور پر ساجو بیٹھی میٹھی میٹھی نظروں سے گیتا کو دیکھ رہی تھی۔

"تمھارا کیا نام ہے بہن؟" تارا نے سوال کیا۔

"گیتا" ذرا اکھڑے لہجے میں گیتا نے کہا۔

"گیتا! تو کیا تم حبیب چاچا کی لڑکی نہیں ہو؟"

"ہوں کیوں نہیں۔ انھیں کی بیٹی تو ہوں۔" گیتا کو یہ سوال ذرا اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"مگر تم —— تم تو ہندو ہو نا؟" جھجکتے ہوئے تارا نے پوچھ ہی ڈالا۔

"ہاں"

"پھر؟"

"پھر بھی میں ان کی بیٹی ہوں۔ وہ میرے پتا کی طرح ہیں" گیتا نے اسی رکھائی سے جواب دیا۔ اب تارا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا بات کرے۔

"تمھارا کیا نام ہے؟" اب کے گیتا نے سوال کیا۔

"تارا دتی"

اب تعجب کی باری گیتا کی تھی۔ وہ اسے اب تک صدیق حسن کی لڑکی ہی سمجھ رہی تھی۔

"تو صدیق صاحب تمھارے باپ نہیں ہیں؟"

"اگر تم حبیب چاچا کی بیٹی ہو سکتی ہو تو میں بھی صدیق چاچا کی بیٹی ہو سکتی ہوں۔" مسکرا کر تارا نے کہا۔ ساجو اب پاس کھسک آئی تھی اور گفتگو میں حصّہ لینے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"بی بی یہ ٹھاکر سندر سنگھ کی لڑکی ہے۔ پڑوسی اور دوست ہیں صدیق میاں

کے ۔" اور یہ سن کر گیتا نے اتنے غور سے تارا کو دیکھا کہ وہ گھبرا گئی۔ گیتا سوچ رہی تھی اچھا تو یہ میری بہن ہے!

جیسے ہی مہمان آرام کر کے اُٹھے کھانے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ حبیب میاں کھانے کے بے حد شوقین بھی تھے اور بڑے مبصر بھی، اور زینب بی اور سکینہ اپنے فن میں ماہر تھیں۔ دسترخوان پر مرغی بھی تھی اور پراٹھے بھی۔ بریانی اور کباب بھی۔ زردہ اور تربوز بھی۔ ان دیہاتی خواتین کی کوشش تھی کہ ان شہری مہمانوں کو ایسا کھانا کھلائیں کہ وہ بھی قائل ہو جائیں۔ حبیب میاں نے بڑھ بڑھ کر تعریف کی۔ زبانی داد بھی دی اور عملی بھی۔ صفیہ بیگم کم خور بھی تھیں اور زیادہ شوقین بھی نہ تھیں لیکن خالدہ اور صدیق حسن کے پُر محبت اصرار سے مجبور ہو کر سبھی چیزیں چکھنی پڑ رہی تھیں گیتا کھانے میں تکلف سے کام لے رہی تھی۔ ہاں سلیم اور کلو بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے۔

حبیب میاں انگلیاں چاٹتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ " واہ وا ۔۔۔ آج تو چچی اور بہن نے ایسا کھانا کھلایا جس کے لئے برسوں سے جی ترپ رہا تھا۔ صفیہ بیگم صاحبہ تو اتنی بدذوق اور کنجوس ہیں کہ کبھی ڈھنگ کا کھانا نہیں ملتا۔ واہ ہمارے ہاں کے پلاؤ کی بات ہی اور ہی ہوتی ہے ۔۔۔ اور کبابوں میں کیا خستگی ہوتی ہے۔ صفیہ بیگم کو تو میاں غریب کو بھوکا مارنے کا اچھا بہانہ مل گیا ہے کہ تمھاری صحت اچھی نہیں معدہ کمزور ہے ۔۔۔ پوچھو جس غریب کو کھانے کو نہ ملے گا اس کی صحت کیا خاک ٹھیک ہو گی ۔۔۔ خالدہ بیٹی تو نے کیا پکایا ہے اس میں سے؟ کچھ نہیں؟ بہت بری بات ہے۔ لڑکیوں کو پکانے کا شوق اور سلیقہ ضرور ہونا چاہیے ۔۔۔۔"

"اور مردوں کو کھانے کا۔" مسکرا کر دھیرے سے صفیہ نے کہا۔

"اور کیا — اے بیٹی مرد کو زیر کرنے کا یہ سب سے کارگر ہتھیار ہے — بیچارا پیٹ کا کتنا ہوتا ہے — افسوس ہماری بیوی کو یہ قیمتی مشورے کسی نے نہ دئے۔ صفیہ صاحبہ یہ آپ کیا لکھنؤ کی نزاکت دکھا رہی ہیں۔ آپ کا وہاں سے دُور پرے کا کوئی تعلق نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم دیہاتی ہیں اور دیہاتی ہی بنے رہیں۔" بیوی کو چھیڑتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"آپ جو سب کی کسر نکال رہے ہیں۔" صفیہ شوہر کی پرخوری کی عادت سے بہت کڑھتی تھیں۔ پہلے ڈٹ ڈٹ کر کھاتے تھے اور پھر اس کا نتیجہ بھگتتے تھے۔ صدیق حسن اپنے دوست کی باتوں سے بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔ اندر زینب بی کھلی جا رہی تھیں اور سکینہ کے ہونٹوں پر بھی جانے کتنے دن بعد ذرا سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ صدیق حسن ہنس کر بولے:

"حبیب بھائی آپ کی باتیں سن کر کون یہ سوچ سکتا ہے کہ یہ شوقین چھبیلا شخص مدتوں قیدِ فرنگ کی مصیبتیں جھیل چکا ہے۔ کون مانے گا کہ تنگی اور جفاکشی کی زندگی کو آپ نے جان بوجھ کر اپنایا ہے۔"

"ہونھ بڑے جفاکش — اے ان سے بڑھ کر چھیلا اور آرام طلب کون ہوگا۔ دیکھنا ابھی پھر پڑ کر سو جائیں گے۔" صفیہ نے کہا۔

خالدہ چچا اور چچی کی باتیں سن کر بالکل مسحور ہوئی جا رہی تھی۔ کبھی ایک کا منھ دیکھتی کبھی دوسرے کا۔ "ہائے اللہ مجھے کیا پتہ تھا یہ اتنے اچھے ہیں — اتنی مزے کی باتیں کرتے ہیں — بالکل بچوں کی سی — اور ساتھ ہی اس کی نظر سلیم اور کلّو پر پڑی جو اب تک کھائے جا رہے تھے۔

"بس بس کلّو — اب اُٹھ جا۔" خالدہ نے بہن کو ٹوکا۔

"اوں ہوں — کیوں اُٹھوں ابھی سے — اور پھر تم نے کلّو کہا۔ میں

موتی بیگم ہوں، کیوں چچی جان۔" کلو نے ٹھنک کر کہا۔
"ہاں اور کیا پیارا پیارا سچا موتی" صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
"خالدہ بیٹی یہ تو اپنی چچی کو اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہے۔ سینگ تو ہیں نہیں ان کے" حبیب میاں نے خالدہ کی محویت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔
"ہائے چچا جان ——— چچی جان تو اتنی اچھی، اتنی اچھی ——— ہیں کہ بس ——— بس ———" اسے تعریف کے لئے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔
"تو پھر چلی جاؤ نا چچی جان کے ساتھ۔ آدمی بن جاؤ گی۔ بھابی تو پارس ہیں۔ پیتل چھوئے سونا بن جائے۔"
"ارے ارے صدیق بھائی اتنا نہ بنائیے" جھینپ کر صفیہ نے کہا تو ان کے چہرے پر بڑی دلآویز سرخی جھلک آئی۔
"سچ ابا؟ واقعی چلی جاؤں ——— آپ مجھے ساتھ لے جائیں گی چچی جان؟" اشتیاق سے خالدہ نے کہا۔
"ہاں ضرور سر آنکھوں پر۔"
"مگر ابا یونہی کہہ رہے ہیں۔ جانے نہ دیں گے" اداس ہو کر خالدہ نے کہا۔ صفیہ بیگم میں جانے کیوں اسے اپنی ماں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔
"بس سلیم اب تم بھی شکر کرو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ابھی سے باپ کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دو" صفیہ نے سلیم کے سامنے سے پلیٹ سرکاتے ہوئے کہا۔
حبیب میاں کے قہقہے سے سارا گھر گونج اٹھا "تم سب ہی کے کھانے سے جلتی ہو" مگر اب ان کا ہاتھ بھی رک گیا تھا۔
"سا جو تم کھانا کھانے کے بعد جانا" خالدہ نے کہا تو اب صفیہ اور گیتا

سمجھیں کہ ساجو ملازمہ نہیں، ایک قسم کی مہمان ہے۔

کھانے کے بعد صدیق حسن نے کہا: "تم تو کافی سو چکے حبیب بھائی۔ چلو زرا گاؤں والوں سے مل آئیں۔ بڑے مشتاق ہیں سب تمھارے۔"

"میں کیا نیا ہوں کوئی؟"

"نئے نہ سہی پر اب بڑے آدمی ہو گئے ہو نا۔ ان کو یہ اشتیاق ہے کہ دیکھیں لیڈر کیسا ہوتا ہے۔"

"لیڈر کیسا ہوتا ہے؟ بندر کی سی صورت، لنگور کی سی حرکات، لومڑی کی سی صفات، خود غرض، شیخی باز، وعدہ خلاف، باتوں کا شیر، عمل میں صفر۔ بناسپتی لیڈر میں تو یہ ساری خصوصیات ہوتی ہیں۔ جانے آپ کون سے لیڈر کو دیکھنا دکھانا چاہتے ہیں۔ میرے تو شکر ہے ابھی دم بھی نہیں نکلی۔"

لڑکیاں ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھیں اور صفیہ تیوری پر بل ڈالے اپنے میاں کی اوٹ پٹانگ باتیں سن رہی تھیں۔

"ہم تو اب جا رہے ہیں۔ خالدہ، بھابی کو تم اماں اور سکینہ سے ملواؤ۔ اور پھر وہ آرام کریں گی۔"

دونوں دوست اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"سندر سنگھ کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔ ان کو لیتے چلیں گے۔ صبح وہ ایک ضروری کام سے کہیں چلے گئے تھے۔" دونوں ڈیوڑھی سے باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے سلیم اور کلو بھی چلے کلو کو تو عادت تھی دن بھر گاؤں میں گھومنے کی اور سلیم کو ذرا آج آزادی ملی تھی۔ ماں سے بھی نہ پوچھا، چپکے سے باہر چلا گیا۔

زینب بی اور سکینہ کھانا کھانے کے بعد سر گوندھ، کپڑے بدل، صفیہ بیگم

سے ملنے کے لئے تیار ہو چکی تھیں اور پاندان کھولے پردے کے اس طرف
ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ لتا اور تارا بھی آ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کی
عورتیں آنی شروع ہوئیں، جو بہو کو دیکھنے کے اشتیاق میں چلی آ رہی تھیں۔
اور تھوڑی دیر بعد صفیہ بیگم بیس پچیس عورتوں میں گھری بیٹھی تھیں۔ عورتیں ان کی
ہر ہر ادا کو دیکھ اور پرکھ رہی تھیں، ہنس رہی تھیں، کچھ چپکے چپکے ان کا مذاق
اڑا رہی تھیں۔ کچھ ہیبت مرعوب سی بیٹھی تھیں۔ کئی بوڑھیوں کے چہرے پر
گھونگھٹ تھے۔ یہ یہاں کا دستور تھا۔ گاؤں کی بہو بڑھیا ہو کر بھی گھونگھٹ
کاڑھے رہتی تھی۔ مگر کئی جوان بہوئیں اس قید سے آزاد تھیں۔ گھنٹہ بھر بعد
صفیہ ان سے ایسی گھل مل گئی تھیں جیسے ان ہی میں سے ایک ہوں۔ دوسری
طرف گیتا کے گرد نوجوان کنواری لڑکیوں اور بہوؤں کا مجمع تھا جو اس سے
دیس بدیس کی باتیں منہ کھولے حیرت سے سُن رہی تھیں۔ اس وقت یہ
معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی ، پریشان، ہر ایک سے بیزار
اور اداس لڑکی ہے جو صبح ڈیوڑھی کے پاس کھڑی ہر ایک کو شک کی نظروں
سے دیکھ رہی تھی۔

۵

تینوں دوست باتیں کرتے گاؤں سے گزر رہے تھے۔ تین چار سو کی آبادی
کا خاصا بڑا گاؤں تھا۔ مگر کسی ترقی، خوشحالی یا صفائی کا نشان نظر نہ آتا تھا۔
گلیوں میں ہر جگہ کوڑے کرکٹ کے انبار لگے تھے۔ اکثر جگہ گلی کی چوڑان میں
نالیاں کھودی گئی تھیں تاکہ پانی ایک کے گھر سے بہہ کر دوسرے کے گھر تک

جا سکے۔ لیکن اس نیلے کیچڑ کا وافر حصہ گلی ہی کو سیراب کرتا تھا جس میں علاوہ
سفید کیڑوں کے جو رینگتے نظر آتے تھے، مکھیوں، مچھروں اور ہر بیماری کے جراثیم
کی نوجوان نسلیں پرورش پا رہی تھیں۔ کھانے کی جھوٹن، گلی سڑی سبزیاں،
مینگنیاں اور گوبر ان کے قدموں کی خاک کو سر آنکھوں پر لے رہے تھے۔ ہر عمر کے
بچے ان گندی نالیوں پر اور تنگ بودار سیلی گلیوں میں بے فکری سے کھیل کود رہے
تھے۔ اکثر کے جسم پر کپڑا برائے نام ہی تھا اور بعض تو تہذیب دنیا کی اس بے جا قید
سے بالکل ہی آزاد تھے۔ کچھ بچوں کے پیٹ پر ایک موٹا، میلا، نیلا ڈورا بندھا
لباس کی کمی کو پورا کر رہا تھا۔ جو بچے عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے، جہاں کپڑے
کا استعمال کرنا ہی پڑتا ہے وہ بالشت بھر کی لنگوٹی یا پھٹے ہوئے ذرا سے نیکر سے
ستر پوشی کا کام لینے پر قانع نظر آتے تھے۔ بہتی ناکیں، دکھتی آنکھیں، لتھڑے منھ،
پھنسیوں سے بھرے ہوئے جسم نئے ہندوستان کی قسمت پر نوحہ کر رہے تھے۔ ننھی
ننھی جانیں اپنی ماؤں کی اپنے سے بھی چھوٹی اولادوں کو کولھوں پر لٹکائے، یا
گھسیٹتے ہوئے، کھیلنے والے خوش نصیبوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ
نو عمر لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے، کچھ کوڑیوں سے دل بہلا رہے تھے، کچھ ایک
دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے اور بلا تکلف سبھی مغلظات گالیوں کا استعمال
کر رہے تھے۔ کئی بچے بیڑی سے شوق فرما رہے تھے۔ ایک پانچ چھ سالہ
"نوجوان" لہک لہک کر گا رہے تھے۔ "انکھیاں سے ملی انکھیاں اور دل سے
ملے دل ـــــ پھر کس کا اجارا ـــــ"

سلیم حیرت سے ان بچوں کو دیکھتا، قدم قدم پر جھجکتا، کلّو کا ہاتھ پکڑے
سہما سہما سا چلا جا رہا تھا۔ مگر کلّو بڑی بے فکری سے کسی کو ٹوکتی، کسی کو ڈانٹتی، کسی
سے اظہارِ خصوصیت کرتی چلی جاتی تھی اور ہر ایک دوست کا نام اور صفات سلیم کو

بتاتی جا رہی تھی۔ بچے کلبہ اور سلیم کو کچھ حیرت، کچھ پسندیدگی، کچھ خفگی اور بیگانگی سے دیکھ رہے تھے۔ آج انھیں اپنی کھلنڈری بے تکلف دوست کچھ بدلی بدلی کچھ بڑی، کچھ اہم معلوم ہوتی تھی۔ ایک خوبصورت، خوش پوشاک مہذب بچے کی موجودگی نے اسے جانے کیا کر دیا تھا؟

عورتیں بہت سی تو کھیتوں پر گئی ہوئی تھیں۔ کچھ صدیق حسن کے ہاں جمع تھیں، جو باقی تھیں ان میں سے بعض گھر کے باہر بیٹھی چرخا کات رہی تھیں یا گپ شپ یا لڑائی جھگڑے میں مصروف تھیں۔ ایک کچے گھر کے سامنے ایک بڑھیا کھڑی ہاتھ چلا چلا کر فحش گالیاں بک رہی تھی۔ نوجوان بہو چہرے پر گھونگھٹ لٹکائے اور گنبد سا پیٹ ابھارے، کولھے پر دس گیارہ مہینے کے بچے کو لٹکائے برابر سے جواب دے رہی تھی، کچھ آگے ایک چبوترے پر عورتیں ڈھول لیے گا رہی تھیں۔ ایک طرف چوک میں نیم کے درخت میں جھولا ڈالے کچھ بچیاں جھولا جھول رہی تھیں۔

سندر سنگھ اور صدیق حسن ان سب باتوں کے عادی اطمینان سے باتیں کرتے جا رہے تھے اور ان کو ذرا بھی احساس نہ تھا کہ یہ سب دیکھ کر ان کے دوست کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ رنج و ندامت سے ان کا دل جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ دیس بھر کی بھلائی کی کوشش کرتے رہے اور خود اپنے گاؤں کی حالت سے بے خبر اور بیگانہ رہے۔ ان کے ہموطن اب تک آزادی کے آٹھ نو سال بعد بھی جانوروں کی سی زندگی بتا رہے ہیں۔ وہ گہری نظر سے ایک ایک چیز کو دیکھتے اور دل ہی دل میں منصوبے بناتے، راستے میں جو ملتا اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے چوپال تک پہنچ گئے۔

چوپال میں پہلے سے ان کے سواگت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کچے چبوترے کے وسط میں ایک نئی چارپائی پر نئی دری بچھائی گئی تھی جس کے آس پاس بہت سے

بڈھے، جوان اور بچے پالتھیاں مارے بیٹھے تھے۔ کچھ آس پاس کی عورتیں گودوں میں بچوں کو لئے اور آدھا چہرہ گھونگھٹ سے چھپائے چوپال کے نیچے کھڑی تھیں تاکہ میاں جی کے درشن کرسکیں۔ چوپال کے پوتر استھان پر گاؤں کے دستور کے مطابق وہ اپنے ناپاک قدم رکھنے کی مجاز نہ تھیں۔ کنواری بالیاں کبھی کبھار اس پر چڑھ جاتیں مگر عورت ... وہ تو ہے ہی ذلیل ناپاک گھٹیا مخلوق۔ بھلا اس کی یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ مردوں کے برابر چوپال پر بیٹھے۔ آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی یہ غلامانہ ذہنیت کملا نگر کے مردوں میں جوں کی توں باقی تھی۔

زائن سنگھ گاؤں کا بوڑھا چودھری تھا جس نے حبیب میاں کو گودوں میں کھلایا تھا۔ اس نے بڑھ کر مہمانوں کا سواگت کیا اور سب لوگ کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر سلام کرنے لگے یا پاؤں چھونے کو جھکے۔ حبیب میاں دونوں ہاتھوں سے سلاموں کا جواب دیتے، جھکنے والوں کو پکڑ پکڑ کر سیدھا کھڑے کرتے جاتے تھے "ارے ارے بھیا یہ کیا — ارے چاچا یہ کیا غضب کر رہے ہو — توبہ توبہ — مجھے گنہ گار کیوں کرتے ہیں آپ لوگ" اس آدر سے وہ بہت ہی پریشان ہو گئے۔ چارپائی پر بیٹھنے سے بھی انھوں نے انکار کر دیا۔ "نہیں چاچا میں آپ سب کے پاس بیٹھوں گا۔" لاکھ اصرار پر بھی جب وہ راضی نہ ہوئے تو چارپائی ہٹا دی گئی۔ اور دری کو زمین پر بچھا دیا گیا۔ سندر سنگھ اور صدیق حسن کو بھی مجبوراً وہیں بیٹھنا پڑا۔ انھیں حبیب میاں کی یہ مساوات ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اسی طرح تو یہ چھوٹے لوگ سر پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔

حبیب میاں ایک ایک کو پہچان کر اس سے باتیں کرتے اور خیر خبر پوچھتے جاتے تھے۔ کھیتی باڑی کا کیا حال ہے۔ بال بچے کیسے ہیں؟ کتنی کھڈیاں چل رہی ہیں، چاک کیسا چل رہا ہے۔ اب تو اچھے برتنوں کی شہروں میں بہت کھپت ہونے لگی

ہے نا۔ لوگ خوش ہو ہو کر جواب دیتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر گردن ہلا ہلا کر کہتے ۔" میاں کو سب یاد ہیں بھیا!" حبیب میاں کا بچپن کا یار، رامو الگ کھڑا تھا۔ اس نے جانے کتنی بار انھیں کشتی میں ہرایا تھا، کبڈی میں رگیدا تھا اور ان کی کمر پر سوار ہو کر پھرا تھا۔ اب بھلا وہ اسے کیا پہچانیں گے۔ حبیب میاں کی نظر اس پر پڑی: "ابے یار رامو ـــ ادھر کہاں چھپا کھڑا ہے؟ ڈرتا ہوگا کہ کشتی نہ لڑنی پڑے۔ کتنی بار رگیدا ہے تو نے مجھے۔ آج پھر ہو جائے ایک پالی، کیوں؟"

رامو کی باچھیں کھل گئیں مگر پرانی بے تکلفی سے یہ نہ کہہ سکا "جا جا۔ چھٹن کے بچے۔ تو کیا مجھے رگیدے گا ـــ آ ذرا میدان میں ٹلیتیں نکال دوں گا تیرا ـــ" بلکہ کھیسیں نکال کر ہاتھ جوڑ کر بولا "میاں بھگوان اچھا رکھے۔ اب تک ہم گریبوں کو یاد رکھا تم نے۔" مگر حبیب میاں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"کیا حال ہے بھائی؟ پیداوار تو اب اچھی ہو ہے نا؟ بنئے کا قرضہ تو چک گیا ہوگا۔ سرکاری گماشتے تو نہیں ستاتے اب؟"

رامو کو اچھا نہیں لگا کہ میاں سے اپنی بپتا کہے کہ اس کے پاس زمین ہی کتنی ہے۔ پھر لگان الگ دو، وصول کرنے والوں کی پوجا الگ کرو، بنئے کا قرضہ الگ چکاؤ ـــ جو بیسیوں برسوں سے ادا ہوتا آرہا ہے مگر آج تک پورا سود بھی ادا نہیں ہو سکا۔ بچا کھچا بیج غلہ ہو اسے سرکار کے من مانے داموں زبردستی بیچ دو۔ اس لئے تو اب بھی سب وہی پریشانیاں ہیں۔ گو یہ سب کہتے اس کی خودداری مانع آئی "ہاں بھیا رام کی کرپا سے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ تم کہو مجے میں تو ہو۔"

سب سے ملنے کے بعد حبیب میاں دری پر بیٹھ گئے اور سب لوگوں نے ان کے گرد حلقہ بنا لیا۔ دو چار ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد حبیب میاں نے پوچھا "کیوں چودھری چاچا گاؤں میں اسکول تو ہے نا؟"

"ہاں بھیا — ہے تو —" دبی زبان سے چودھری نرائن نے جواب دیا۔
"مڈل تک کا ہے یا پرائمری ہے؟"
"پانچویں تک کا ہے۔"
"کتنے لڑکے ہوں گے؟"
"یہی بھیا کوئی بیس پچیس۔"
"بس؟ اتنا بڑا گاؤں اور اتنے کم بچے پڑھتے ہیں؟"
"بھیا اسکول کا ماسٹر دل لگا کر نہ پڑھاوے ہے۔ لونڈوں کو مارے بہت ہے کئی کئی دن گاؤں سے گائب رہے ہے۔ اپنے گھر کا سارا کام بچوں سے لے ہے اسی لئے بچے نا جاویں ہیں۔" شبراتی نے کہا جس کا بڑا بچہ پرسوں ہی اسکول سے بھاگ آیا تھا۔

"ہم نے کہا تھا آج ہمارے سرکار آرہے ہیں۔ ان سے آکر ملنا۔ پر دیکھو نہیں آیا۔" غصے سے چودھری نے کہا۔

حبیب میاں نے تھوڑی دیر بعد پوچھا "اور لڑکیوں کے لئے کوئی اسکول نہیں یا وہ بھی لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھتی ہیں؟"

"نا بھیا ابھی ہماری چھوکریاں شہر کی لونڈیوں کی طرح میم نہیں بنی ہیں۔ وہ مدرسوں میں جاویں گی تو گھر کا سارا کام، چوکا برتن، گوبر پانی کون کرے گا؟"

"تم تو چاچا سو برس ادھر کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بڑا دکھ ہے کہ کملا نگر کا اب تک وہی حال ہے جو آزادی سے پہلے تھا۔ کچھ بھی تو ترقی نظر نہیں آتی۔ دیس آزاد ہوا۔ زمینداری کی لعنت ختم ہوئی۔ کتنے گاؤں میں ترقی کی اسکیمیں کامیابی سے چل رہی ہیں۔ کتنے دیہات میں سدھار کا کام ہو رہا ہے۔ علاج کے مرکز، اسکول، سماج سدھار کے سنٹر کھولے جارہے ہیں۔ کوآپریٹیو سوسائیٹیاں

اور بنک قائم ہو رہے ہیں، اچھے بیج اور پانی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ نہ کملا نگر والوں کو خود اس کا شوق اور احساس ہے نہ یہاں کی حکومت کو اس گاؤں کی کوئی فکر ہے۔"

حبیب میاں کے چپ ہوتے ہی کئی آدمیوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ کچھ نوجوان جوش میں چیخ رہے تھے، بڈھے بڑبڑا رہے تھے کہ ہمیں تو نہ اچھا بیج ملا نہ کھاد۔ نہ قرضہ نہ پانی۔ افسر اور کارندے اب بھی دھاندلی کرتے ہیں۔ رشوت لیتے ہیں، سختیاں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس گڑبڑ میں کسی کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سندر سنگھ نے جو گاؤں کے سرپنچ تھے ہاتھ کے اشارے سے سب کو چپ کیا اور بولے۔

"حبیب بھائی یہ سب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ حاکموں کی ہماری طرف ذرا بھی توجہ نہیں۔ جن نعمتوں سے دوسرے گاؤں والے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کملا نگر ان سے اب بھی محروم ہے۔ نہ ٹیوب ول لگا، نہ بنک کھلے نہ کھاد ملی نہ بیج — نہ —"

"مگر سندر بھائی، یہ تو آپ کا کام ہے کہ اس کے لئے کوشش کیجئے، دوڑ دھوپ کیجئے، حاکموں سے ملئے۔ اسکیم بھیجئے۔ اپنی مانگیں پیش کیجئے اور منوائیے۔"

"کچھ نہیں ہوتا بھیا — کچھ نہیں ہوتا۔ کتا کرنے تو بہت کوشش کی کہ سفا کھانا کھل جائے، ٹیشن بن جائے۔ ڈاک کھانا بھی ہو جائے یہاں۔ پر کچھ بھی تو نہ ہوا؟" چودھری نرائن نے نراشا کے ساتھ کہا۔

جمن نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "میاں آخر ہماری سرکار کا یہ فرض نہیں کہ وہ خود ہمارے گاؤں کو وہ سب دیوے جو دوسرے گاؤں کو مل رہا ہے۔"

ہے۔ بے شک ہے۔ ضرور ہے۔ مگر تم لوگوں کا بھی تو کچھ فرض ہے نا۔ وہ تمھاری طرف جبھی تو توجہ کرے گی جب تم خود اس کو بار بار یاد دلاؤ گے۔ اپنا حق مانگو۔ خود کچھ کر کے دکھاؤ ـــ یہ نہیں کہ خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں کہ حکومت اپنا فرض ادا کرے گی تو کچھ ہو گا۔ تم تو جانتے ہو ہمارا دیس دراصل دیہاتوں ہی کا دیس ہے۔ لاکھوں گاؤں کا مجموعہ۔ اب سرکار جادو کے زور سے ایک دم تو سب کا سدھار کر نہیں سکتی۔ یہ تو خود گاؤں والے ہی کر سکتے ہیں اور سرکار صرف مدد دے سکتی ہے انھیں۔ صرف کوشش ہی نہیں کرنی آپ لوگوں کو کچھ کر کے بھی دکھانا چاہیئے کہ دیکھو یہ ہم نے کر لیا باقی کام میں حکومت کی مدد کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کملا نگر میں تو ابھی کسی کو یہ احساس بھی پیدا نہیں ہوا کہ گاؤں سدھار کا کام ہونا چاہیئے۔ سندر بھائی مجھے افسوس ہے کہ آپ کے اور صدیق کے یہاں موجود ہوتے اب تک سماج سدھار کا کچھ بھی کام یہاں شروع نہیں ہوا۔"

اُن کے لہجے میں تیزی تھی جو اُن کے دونوں دوستوں کو ناگوار ہوئی۔

"میں تو یہاں بہت کم رہتا ہوں۔ پھر بھی کئی بار ضلع کے حاکموں سے ملا۔ کافی کوشش کی مگر کوئی کچھ نہیں کرتا۔ ٹال دیتے ہیں یا ڈانٹ دیتے ہیں۔ تم البتہ اس پوزیشن میں ہو کہ چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے اپنے گاؤں کے لئے" صدیق حسن نے الزام الٹا ان کے سر ہی رکھ دیا۔

"میں تو حبیب میاں یہ جانتا ہوں کہ تمھاری حکومت ہمیں مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ کسان بچارے ہیں، ان کو بہلا وا دیا کہ زمینداری ختم ہو گئی تو تمھارے سارے دُکھ دور ہو جائیں گے۔ اب دیکھ لو ان کی حالت کہ پہلے سے ابتر ہی ہے کچھ۔ زمینداروں بچاروں پر تو خواہ مخواہ کا الزام تھا کہ لوٹتے ہیں ستاتے ہیں۔ اب دیکھو ذرا آکر تو تمھیں پتہ چلے کہ دیش بھگتوں کی حکومت میں ان غریبوں کو کس کس

طرح ستایا اور دبایا جا رہا ہے۔" ٹھاکر سندر سنگھ زمینداری کے خاتمے سے بہت ہی خار کھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اگرچہ گاؤں کے لیڈر اور سرپنچ بن گئے تھے مگر "پرجا" کی آزادی اور برابری انھیں زہر لگتی تھی۔

ناتھو لال گاؤں کا سب سے پرجوش نوجوان تھا۔ شہر میں رہ چکا تھا۔ تھوڑی ہندی پڑھی تھی۔ اٹک اٹک کر اخبار پڑھ لیتا تھا اور اپنے کو بہت قابل سمجھتا تھا۔

"میاں یہ کانگریسی حکومت تو ہمیں الٹی چھری سے حلال کر رہی ہے۔ لگان اتنا دینا پڑے ہے کہ کچو مر نکل جاوے ہے۔ اوپر سے ہر حاکم، ہر افسر کی دھونس الگ۔ اور ہمارے خون پسینے کی کمائی جس بھاؤ چاہے سرکار لے لے ہے — اس سے تو فرنگی راج ہی اچھا تھا۔"

"ناتھو میاں کیسی کافروں کی سی بات کرتے ہو۔" حبیب میاں نے غصہ ضبط کر کے کہا۔ چودھری نے جلدی سے بات بنائی۔

"نہیں بھیا۔ یہ بات نہیں۔ پھر بھی پہلے سے بہت اچھا حال ہے۔ لگان تو کچھ دینا ہی پڑے گی۔ اور اناج کے دام بھی تو کتنے چڑھ گئے ہیں۔ پہلے سے اب بھی کئی گنا پڑ رہے ہے۔ ہاں یہ اتنی مہنگائی نہ ہو تو بڑے مجے میں زندگی گزرے۔"

"رہنے دو چودھری اپنی بھاداری۔ مجھے میں خبر ہے! اناج کے دام چڑھے تو اور ہر چیز کے دام نہیں بڑھے کیا؟ ہمیں تو جب بھی پیٹ بھر کھانے کو نہ ملے تھا۔ اب بھی نہ ملے ہے۔ میاں میرے سات بچے ہیں۔ چھ بیگے کی کھیتی ہے سال بھر میں کوئی دن ہوگا جو دونوں وخت پیٹ بھر کر ملتا ہو—" اب رامو بھی ضبط نہ کر سکا۔

حبیب میاں بڑے دکھ سے یہ سب باتیں سن رہے تھے۔ یہ لوگ ان پڑھ سہی۔ گنوار سہی۔ مگر حالات کو اب سمجھنے اور اپنے حقوق کا احساس کرنے لگے ہیں۔

اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ اب بھی ان کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں۔ حکومت کی پالسی بے شک یہ نہیں بلکہ وہ دیہاتوں کی حالت بہتر بنانے کی بہت کوشش کرتی ہے لیکن اس کے کارکنوں میں کتنے ہیں جن کے خون میں وہی پرانے جراثیم، جن کے دماغوں میں وہی زہریلے خیالات، جن کے دلوں میں وہی سختی اور بے حسی موجود ہے جو دورِ غلامی میں تھی۔ انھوں نے آہستگی سے سمجھانا چاہا۔

"آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ بے شک مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ آپ کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی اب بھی ہوتی ہوگی مگر بھائی اتنی بات یاد رکھئے کہ کاشتکار اگر اپنی زمین کا ٹھیک ٹھیک استعمال کرے تو وہ بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اچھی کھاد عمدہ بیج، وافر پانی اور سخت محنت تو بنجر زمین کو بھی گلزار بنا سکتی ہے۔ اور ہمارے ہاں کی زمین تو سونا اگل سکتی ہے سونا۔ مگر یہ مدتوں سے بھوکی ہے۔ تم سال میں اس سے تین تین فصلیں اگاتے ہو مگر اسے وہ غذا نہیں ملتی جس کی اسے ضرورت ہے پھر تم ہی کہو اس کے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آئے کہ اپنے بھوکے بچوں کو پیٹ بھر کھلا سکے۔ آدمی بھی تو بھوکے پیٹ محنت نہیں کر سکتا۔"

"مگر میاں اچھا بیج، بڑھیا کھاد اور بہت سا پانی ہم لائیں کہاں سے؟" ناتھولال نے تلخی سے کہا۔

"اس سلسلے میں جو میں کر سکتا ہوں کر دوں گا۔ پھر سندر بھائی اور صدیق میاں تو ہیں ہی تمہاری مدد کے لئے ـــــ مجھے چاچا تم سے اور دوسرے چودھریوں اور سندر بھائی اور صدیق میاں سے اس مسئلے پر مفصل بات کرنی ہے۔ آج رات کو آپ لوگ آجائیے گا۔"

"ہاں میاں ضرور کچھ کرو۔ ہماری سات سات پیڑھیاں تمہارا جس گا دیں گی، جس کے ایسے مالک ہوں اس کے نصیب کا کیا کہنا۔" چودھری نرائن

ابھی سے اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے۔

"نہیں چاچا یہ میرا یا کسی کا جس گانے سے نہ ہوگا۔ اس کے لئے تو آپ سب لوگوں کو محنت کرنی پڑے گی، کوشش کرنی ہوگی۔ اپنے حق مانگنے ہوں گے اور مل جانے پر ان کو سنبھالنا ہوگا۔ یہ ایسے آسان کام نہیں ہیں۔ کچھ سستی اور نااہلی ہم میں ہے، کچھ نکاہ پن ہمارے افسروں اور حاکموں میں ہے۔ ان سبھی کو ہمیں دور کرنا ہے نا؟"

"ہاں بھیا" دو تین آدمیوں نے ہاں میں ہاں ملائی، مگر دل میں سوچ رہے تھے کہ بھلا ہم اس میں کیا کر سکیں ہیں۔

"ایک بات مجھے آپ لوگوں سے اور کہنی ہے" حبیب میاں نے زور دیکر کہا۔ "مجھے بڑا دکھ ہوا یہ دیکھ کر کہ کملا نگر میں صفائی نام کو نہیں۔ توبہ توبہ اتنی گندگی میں ہمارے بچے پل رہے ہیں۔ گاؤں میں صفائی تو آپ لوگ خود رکھ سکتے ہیں۔ یا وہ بھی حاکم کریں گے۔ اتنی مکھیاں، مچھر، کیڑے، کیچڑ، گوبر، پاخانہ، کوڑا کرکٹ ہر طرف ہے کہ ——"

"ارے بھیا جہاں ڈھور ڈنگر ہوں ہیں وہاں گندا بھی ہوگا ہی" نرائن چودھری نے اس انداز سے کہا جیسے تمہاری موٹی عقل میں یہ بات کیسے آسکتی ہے۔

"یہ کوئی ضروری نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ گندگی ہمیں بری ہی نہیں لگتی صفائی کی عادت ہی نہیں"

"حبیب بھائی ہمارے گاؤں میں پانی کا نکاس ہی نہیں کسی طرف۔ ہر گھر کا پانی آس پاس ہی جمع ہو کر سڑتا رہتا ہے" صدیق حسن نے عذر پیش کیا۔

"مگر آپ سب لوگ ہمت کرلیں تو نالیاں بنانا کون سا ناممکن کام ہے۔ ارے بھائی آپ لوگ تو ان میاں لوگوں اور ٹھاکروں کی طرح کاہل اور اپاہج۔

نہیں۔ محنتی لوگ ہیں۔ اپنا کام خود کرنا جانتے ہیں۔" انھوں نے گاؤں کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ لیکن باوجود ان کی مسکراہٹ کے "میاں لوگوں" کو یہ جملہ بہت ناگوار ہوا۔

"پھر آپ کو اسکول کو ترقی دینا چاہیئے زیادہ سے زیادہ بچے بچیاں پڑھنے آئیں اور ساتھ ہی خود آپ لوگوں کو بھی پڑھنا چاہیئے۔" حبیب میاں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرو ہو بھتیا۔ کہیں بڈھے طوطے بھی پڑھے ہیں؟"

"بڈھے طوطے پڑھے ہوں یا نہ پڑھے ہوں۔ بڈھے آدمی خوب پڑھتے ہیں۔ میں تو پندرہ سولہ برس سے یہ کام کر رہا ہوں۔ میرے ساتھیوں نے ہزاروں ان پڑھ جوانوں اور بڈھے مرد عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے اور اب تو اڈلٹ ایجوکیشن کی یہ اسکیم سینکڑوں ہزاروں گاؤں میں چل رہی ہے۔"

"میں نے تو رات کا اسکول کھولا بھی تھا مگر دو چار آدمیوں سے زیادہ آئے ہی نہیں۔ ہزاروں بہانے بناتے اور ہزاروں عیب نکالتے۔" بیزاری سے سندر سنگھ نے کہا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ان حبیب میاں نے اگر یہ کیا بکھیڑا شروع کر دیا۔

"آپ کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔" سندر سنگھ سے حبیب میاں نے کہا۔ پھر گاؤں والوں سے مخاطب ہوئے۔ "بھائیو ہم آزاد بھارت کے باسی ہیں۔ ہمیں اپنے مہان دیس کی بڑائی اور بھلائی کے بہت سے کام کرنے ہیں، اور اس کے لئے سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ یہ کام ہمیں کرنے ہیں، ہمارا فرض ہے یہ اور پھر اپنے کو اس قابل بنانا ہے کہ دیس کی ترقی کے لئے کوئی سیوا کر سکیں۔ اس کے لئے ہمیں علم کی دولت حاصل کرنی ہے۔ تاکہ ہمیں اپنے دیس کے اور ساری دنیا کے حالات معلوم ہوتے رہیں۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ بچپن میں زیادہ جلدی لکھنا پڑھنا سیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کہ بڑی عمر میں

پڑھنا بہت مشکل یا ناممکن ہے۔ علم تو ساری عمر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سچا شوق، دلی لگن اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھائیو۔ ہندوستان اپنے کروڑوں باسیوں سے یہ آشا لگائے ہے کہ وہ اس کی سیوا کریں اور اس کا نام دنیا میں اونچا کریں۔ بھارت ان چند بڑے شہروں کا نام نہیں جہاں بڑے لوگ بیٹھ کر حکومت کے کاغذی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ نہیں۔ بھارت نام ہے ان لاکھوں گاؤں جس کی رونق اور آبادی آپ لوگوں کے دم سے ہے۔ ان کے دم سے جو دھرتی کا سینہ چیر کر اناج پیدا کرتے ہیں اور سارے دیس کی بھوک مٹاتے ہیں، اور ان کے دم سے جو اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے دیس کے سارے باسیوں کی اور بہت سی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ آپ ہی دیس کے سچے سیوک ہیں اور آئندہ کے لئے بھی دیس کی آنکھیں آپ ہی کی طرف لگی ہیں۔ جب تک دیہات کی حالت نہ سدھرے گی ہندوستان کی آزادی بھی آزادی نہیں بن سکتی۔ نہ ہندوستان صحیح معنوں میں ترقی کر سکتا ہے، اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ آپ میں خود اپنے سدھار کا احساس پیدا ہو۔ اپنے گاؤں کی اور گاؤں کے باسیوں کی حالت بہتر بنانے کی لگن ہو۔ اپنی عورتوں اور بچوں کو پڑھانے لکھانے کا شوق ہو۔ یاد رکھئے، دیر سویر یہ سب کرنا آپ ہی کو ہے۔ تو پھر آج ہی سے یہ کام کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ بہت سے کام کرنے ہیں بھائیو آپ کو۔ اپنے گاؤں میں صفائی کی مہم چلانا ہے۔ اپنی اور اپنے بچوں کی صحت کا پالن کرنا ہے، پڑھنا اور پڑھانا ہے، کھیتوں کی پیداوار بڑھانا ہے، اور اپنے گاؤں کی ترقی کے لئے اپنے جائز حقوق کی مانگ کرنا، انھیں حاصل کرنا اور پھر ان سے کام لینا ہے۔ باہر کے لوگ آپ کی سیوا کے لئے اگر آئے بھی تو بغیر آپ کی مدد کے کچھ بھی نہ کر سکیں گے، اور پھر جو لگن، جو جذبہ آپ کے دل میں ہو سکتا ہے وہ دوسرے کے

دل میں کہاں ہوگا؟ مجھے آشا ہے کہ اگلی بار جب میں کملا نگر آؤں گا تو اپنے گاؤں کو بالکل بدلا ہوا پاؤں گا۔۔۔ "

ایک دم اُنھیں احساس ہوا کہ وہ ان سیدھے سادے لوگوں کے سامنے تقریر جھاڑنے لگے ہیں۔ ان کو تقریروں کی نہیں عملی مدد کی ضرورت ہے، رہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ ایک دم چپ ہو گئے اور جوشیلے نوجوانوں نے ان کو گھیر کر سوالوں کی بوچھار کر دی۔

رات کو پھر ایک میٹنگ ہوئی۔ ناتھو لال، شبراتی، چودھری نرائن، چمن وغیرہ حبیب میاں کے بلانے پر آئے اور سندر سنگھ اور صدیق حسن بھی شریک ہوئے۔ بہت دیر تک بات چیت بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ حبیب میاں نے تجویز پیش کی کہ کملا نگر کی ترقی کے لئے ایک مکمل اور مفصل اسکیم بنا کر صوبے کی حکومت کو پیش کی جائے، وہ بھی اپنا اثر کام میں لائیں گے اور اس کی منظوری کیلئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی ان کا اصرار تھا کہ یہاں بلا تاخیر کے سدھار کا کام شروع ہو جانا چاہیئے۔ جو خود یہ لوگ کریں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ سکندر پور سے ایک دو نوجوانوں کو ان کی مدد اور مشورے کے لئے بھیجیں گے مگر اصل کام گاؤں والوں کو خود کرنا ہے۔ اسکیم بنانے اور منظور کرانے کی ذمہ داری سب ہی نے حبیب میاں پر ڈالی جسے انھیں اٹھانا ہی پڑا۔ پھر بھی سندر سنگھ اور صدیق حسن سے انھوں نے اصرار کیا کہ وہ بھی برابر اس سلسلے میں خط و کتابت اور دوسری کوششیں کرتے رہیں، اس لئے کہ حبیب میاں کو اتنے کام ہیں کہ ممکن ہے کہ وہ اس کام میں اتنا وقت صرف نہ کر سکیں جتنا ضروری ہے۔

رات گئے جب لوگ واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو ان کی آواز میں کچھ زیادہ زور اور انداز میں زیادہ جوش تھا اور دیوں میں آشا کے دیپک آنکھیں جھپک رہے تھے۔

٦

شام کو حبیب میاں نے سندر سنگھ سے کہا۔

"سندر بھائی میں تو بھول ہی گیا۔ تمہاری بھانجی گیتا بھی تو میرے ساتھ آئی ہے۔"

"اچھا!" سندر سنگھ اتنے خوش ہوئے کہ اور کچھ کہہ ہی نہ سکے۔

"ہاں —— وہ کئی برس سے میرے ہی پاس تو تھی۔" حبیب میاں نے بتایا۔

"تو پھر چلو —— مجھے اس سے ملاؤ تو۔ چھ سات سال کی تھی جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ اب تو خاصی جوان ہو گئی ہو گی" بیقرار ہو کر سندر سنگھ بولے۔ انسان کی بھی کتنی عجیب فطرت ہے۔ کبھی ایسا بیگانہ ایسا خود غرض کہ بچھڑے عزیز، مصیبت زدہ دوست کو اُلٹ کر نہ پوچھے۔ کبھی اس کے لئے ایسا بے چین ہو گا جیسے اس سے زیادہ محبوب ہستی کوئی ہے ہی نہیں۔ جذبات کا یہی اتار چڑھاؤ کبھی اسے پتھر کی سرد اور بے حس مورتیوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے اور کبھی ملائک کے لئے قابلِ سجود بنا دیتا ہے۔ حبیب میاں اس دلچسپ فلسفے پر غور کر رہے تھے۔ بے چاری بے سہارا نوعمر لڑکی ماں باپ کے سائے سے محروم ہوئی رشتے داروں کے ہاتھوں مصیبت میں پھنسی، گھر سے بے گھر کی گئی تو سندر سنگھ نے

یا کسی اور نے اس کی خیر خبر تک نہ لی۔ اگر صفیہ اسے اپنا نہ لیتیں تو خدا جانے اس کا کیا انجام ہوتا۔ اور اس وقت بیقراری کا یہ عالم ہے جیسے بچھڑا باپ بیٹی کے لئے بے چین ہو۔

"چلو اندر ہے وہ ـــ مگر دیکھو خیال رکھنا تم اس کے لئے بالکل اجنبی ہو۔ لڑکی بے حد حساس ہے۔ نازک آبگینے کا سا دل ہے اس کا" حبیب میاں نے ذرا تنبیہی انداز سے کہا۔ سندر سنگھ پر انھیں بھروسہ تھا مگر ان کی بیوی کے مزاج کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اس سے گھبراتے تھے۔

ماموں بھانجی کی ملاقات بڑی درد انگیز تھی۔ جب گیتا حبیب میاں کے ساتھ ان سے ملنے آرہی تھی تو اس کے دل کے اندر کوئی ہل چل نہ تھی۔ رشتے داروں سے یوں بھی وہ بدگمان تھی۔ جن لوگوں نے الٹ کر اسے پوچھا تک نہیں ان سے اسے کیا محبت ہو سکتی ہے بھلا؟

لیکن جیسے ہی گیتا نے ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھا اور سامنے ایک ادھیڑ عمر کے مہربان صورت آدمی کو درد اور پریم بھری نظروں سے اپنی اُور تاکتے پایا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، ایک نمکین گولا آکر حلق میں پھنس گیا، ہونٹ کانپنے لگے، آنکھیں جل اُٹھیں۔ وہ پاؤں چھونے کو جھکی تو سندر سنگھ نے جلدی سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ آنسوؤں کا ایک تیز و تند دھارا آنکھوں کے پردے چیر کر بہہ نکلا۔ جانے کتنی دیر وہ ان کے سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی لیکن جب الگ ہوئی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک بھاری بوجھ جو برسوں سے اس کی چھاتی پر دھرا ہوا تھا اس وقت ہلکا ہو گیا۔ اس کی خودداری ہمیشہ اپنے درد و غم کے اظہار سے گریز کرتی تھی۔ دوسروں کو اپنی وجہ سے رنجیدہ کرنا اسے پسند نہ تھا۔ لیکن ماموں کی چھاتی پر سر رکھنے کے بعد یہ "دوسروں" اور "کسی اور"

کا احساس جانے کہاں غائب ہو گیا اور "یہ میرے غم میں شریک ہیں ۔ اسے سمجھ سکتے ہیں" ۔ اس احساس نے بندِ غم کے سوتے کھول دئے ۔

مگر اپنائیت کا یہ احساس جو ماموں سے مل کر ہوا تھا وہ ممانی اور نانی سے ملنے پر محسوس نہ ہوا ۔ اگرچہ ان دونوں نے اسے بہت محبت سے گلے لگایا ، اور اس کے ماں باپ کا ذکر کر کے کافی دیر آنسو بہاتی رہیں اور اس کی کس مپرسی اور یتیمی پر رنج و غم کا ضرورت سے زیادہ اظہار کیا گیا ۔ البتہ جب کچھ دیر بعد لتا اور تارا نے اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال کر پیار بھرے لہجے میں کہا "دیدی" "میری اچھی دیدی" تو گیتا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی بچھڑی بہنیں کہیں سے مل گئی ہیں ۔ جب سے ان دونوں کو یہ معلوم ہوا تھا کہ گیتا ان کی پھوپی زاد بہن ہے تو خوشی سے بد حواس پروانہ وار اس کے گرد گھوم رہی تھیں ۔ اور خالدہ اداس نظروں سے گیتا کو دیکھ کر سوچتی رہی "کاش یہ میری بہن نکلتی ۔ ہائے میرے تو کوئی بڑی بہن بھی نہیں "

اگلے دن شام کو سندر سنگھ کے ہاں سب لوگوں کی دعوت تھی ، اور صبح ہی سے اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ سندر سنگھ کی ماں اور بیوی رات سے انھیں یہ سمجھا رہی تھیں کہ اب گیتا کو واپس سکندر پور نہ بھیجا جائے ۔ بھلا برادری والے کیا کہیں گے کہ جوان لڑکی غیر قوم ، غیر مذہب لوگوں میں رہتی ہے ! نانی کو گیتا کا مزاج پسند آگیا تھا ۔ ضرور وہ ان کی بن کر رہے گی اور بہو اور پوتیوں کے مقابلے میں ان کی طرفدار ہوگی ۔ اور بیچاری کا خرچہ ہی کیا ہوگا ۔ دو روٹیاں کھائے گی اور پڑی رہے گی ۔ جب ہو سکے گا اس کے ہاتھ پیلے کر دیں گے "
سیتا دیوی بھی اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھیں ۔ "پڑھی لکھی لڑکی ہے ۔ تارا اور لتا کو پڑھائے گی اور مجھے بھی دُسراہٹ ہو جائے گی ۔ اس اجڑے گاؤں میں

سوا گنوار عورتوں کے کوئی ایسا بھی تو نہیں جس سے بات چیت کی جا سکے۔"

دل تو سندر سنگھ کا بھی یہی چاہتا تھا کہ اب گیتا کو نہ جانے دیں۔ مگر وہی ایک ایسے تھے کہ جو کم سے کم شعوری طور پر، کسی خود غرضی کی بنا پر گیتا کو روکنا نہیں چاہتے تھے بلکہ سمجھتے تھے کہ ان کا فرض ہے کہ بھانجی کی سرپرستی کریں، اور اب تک کی بے خبری کی تلافی کر سکیں۔ لیکن حبیب میاں سے کیسے کہیں؟ کس منھ سے کہیں کہ تم "غیر" ہو (ان کی ماں اور بیوی کی یہی دلیل تھی) اور ہم "اپنے" ہیں غیر وہ ہیں جنھوں نے اس کو بیٹیوں کی طرح رکھا۔ یا وہ خود جنھوں نے برسوں تک خیر خبر ہی نہ لی۔ پھر یہ اندیشہ تھا کہ حبیب میاں اور صفیہ بیگم راضی بھی ہو گئے تو خود گیتا بھی یہاں رہنے پر تیار ہوگی؟ مگر کنواری لڑکی کی مرضی کیا — جو بزرگ چاہیں وہ اسے ماننا چاہیے۔

انھوں نے طے کیا کہ حبیب میاں سے اس مسئلے پر آج ہی بات چیت کریں گے۔

رات کو سندر سنگھ کے وسیع صحن میں چٹائیوں کے فرش پر مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ الگ الگ دھات کی تھالیوں میں سب مہمانوں کے لئے کھانا پروسا گیا۔ دادی کو یہ "انگریزیت" بہت بری لگی کہ مرد عورت ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ مگر بیٹے کی مرضی کے سامنے ناچار رہنا پڑا —

صدیق حسن کے ہاں سے سب کو بلایا گیا تھا مگر بڑی مشکل سے صرف خالدہ اور کلو کو آنے کی اجازت ملی وہ بھی صفیہ بیگم کی شرما شرمی۔ خالدہ، سندر سنگھ کی گود میں کی کھلائی ہوئی تھی اور بڑی اماں کے بہت ٹوکنے پر بھی صدیق حسن نے ان سے اتنا کا پردہ نہیں کرایا تھا۔ خالدہ کی وجہ سے سندر کو کھانا باہر دیا گیا جو اس کی

ماں کو بہت بُرا لگا، اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے انھوں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے انکار کر دیا۔ دراصل انھیں چھوت چھات کا بہت خیال رہتا تھا۔ مسلمانوں کے، گوشت خوروں کے ساتھ ایک چٹائی پر بیٹھ کر کھائیں تو اُن کا دھرم بھرشٹ نہ ہو جائے گا؟ ادھر بڑی اماں مسلسل سکینہ بیگم سے شکایت کر رہی تھیں کہ صدیق کا دماغ تو بالکل خراب ہو گیا ہے۔ لڑکیاں ہندوؤں کے ہاں کی سوکھی چیز تو خیر کھالیں مگر یوں سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا — ان کے مذہب پر بھی اس خیال سے آنچ آ رہی تھی مگر دونوں خواتین اندر ہی اندر جل کر رہ گئیں۔ بات ایک کی بھی نہ مانی گئی۔

چاندنی رات تھی، آج اُمس کم تھی۔ نرم اور لطیف ہوا چل رہی تھی۔ مہمان بڑے شوق اور اشتہا کے ساتھ آلو، پوری، طاہری، رائتہ، جوار کی ٹکیاں، شلجم کی بھجیا، کٹھل کے کباب، کڑھی اور کئی قسم کے اچار اور چٹنیاں کھا رہے تھے۔ حسب عادت سب سے بڑھ چڑھ کر حبیب میاں تعریفیں کر رہے تھے اور پوری پوری دادِ سخن دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ کلو اور سلیم کی بھوک بھی دن بھر کی بھاگ دوڑ کھیل کود سے چمک آئی تھی۔ خالدہ کو یہ کھانا اپنے یہاں کے کھانے سے زیادہ مزے کا لگ رہا تھا۔ صفیہ گوشت کی بہت شوقین تھیں۔ سبزی ترکاری بہت کم کھاتیں، مگر اس وقت اس خیال سے کہ کوئی کچھ خیال نہ کرے تعریفیں کر کر کے کھا رہی تھیں۔ صرف گیتا خاموش اور کسی خیال میں کھوئی جیسے کھانے سے کھیل رہی تھی۔ اندر سے دادی گرم گرم پھلکوں پر اصلی گھی چپڑ کر باہر بھیج رہی تھیں۔ لتا اور تارا باوجود سب کے اصرار پر کھانے پر اس لئے نہیں بیٹھیں کہ اندر سے کھانا لانا اور پروسنا اُنہیں کے سپرد تھا۔ سیتا دیوی سامنے دالان میں بیٹھی کُڑھ رہی تھیں۔ صدیق حسن، سندر سنگھ اور حبیب میاں کے قہقہے اور آگ پر تیل چھڑک رہے تھے۔ ایسی "آزاد، بے باک، بے شرم" عورتیں جن کی خاطر داری میں تین تین مرد بچھے جا رہے ہوں انھیں زہر لگتی تھیں۔

کھانے کے دوران میں بھی گاؤں کے مسئلے پر باتیں ہوتی رہیں اور کھانے کے بعد بھی یہی چرچہ چارہا۔ حبیب میاں کا اصرار تھا کہ صفائی کی مہم فوراً شروع کی جائے اور تعلیم بالغان کے مرکز بھی جلدی کھول دینے چاہئیں۔ اسکیم منظور ہونے میں بہت دیر لگ سکتی ہے مگر یہ کام ایسے ہیں جن کو جلد سے جلد جاری کرنا چاہیئے۔ صدیق حسن اور سُندر سنگھ یہاں کی مشکلیں اور رکاوٹیں انھیں سمجھا رہے تھے اور لڑکیاں غور سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ذرا یہ لوگ خاموش ہوئے تو تارا نے کہا۔

"چاچا جی ـــ کیا ہم لڑکیوں کے لئے بھی آپ اسکول کھلوائیں گے؟"

"ہاں بیٹی چاہتے تو ہیں مگر ابھی تو پرائمری تک ہی کا کھل سکے گا۔ تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"خاک پڑھا ہے چاچا جی۔ جب پتا جی انبالے میں تھے تو میں ساتویں میں پڑھتی تھی۔ پھر یہاں آگئے اور لکھنا پڑھنا سب ختم ہوگیا۔" اداسی کے ساتھ تارا نے کہا۔

"پھر تو تم خاصا پڑھی ہو بیٹی۔ گاؤں کی ان پڑھ عورتوں کو کچھ نہ کچھ تو پڑھا سکتی ہو۔" حبیب میاں کا خیال تھا کہ کم سے کم پڑھے لکھے سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ سیوا کی لگن اس کے دل میں موجود ہو۔

"ہم نے تو پتا جی سے کہا بھی تھا۔ گاؤں کی کچھ لڑکیاں ہندی پڑھنا چاہتی ہیں۔ مگر وہ ٹال گئے۔" ہمت کر کے تارا نے کہہ ہی دیا۔

"اور چچا جان مجھ سے تو گاؤں کی کچھ عورتیں پڑھنے اور کاڑھنا بُننا سیکھنے آتی بھی تھیں۔ مگر ایک دن دادا میاں نے دیکھ لیا۔ اتنے بگڑے، بیچے کہ کیا بتاؤں۔ کہنے لگے اب یہ کمینے بھی لکھے پڑھیں گے اور ہماری برابری کریں گے۔ ابا جی سے میں نے کہا تو وہ کہنے لگے بڑے ابا خفا ہوتے ہیں تو تم ان عورتوں کو

آنے کو منع کر دو ــــ" آج دونوں لڑکیاں بزرگوں کی زیادتیاں گنانے پر تل گئی تھیں۔

"میں نے تو کبھی تم لوگوں کو منع نہیں کیا۔ تم ہو ہی کاہل۔ بے عمل ــ"

سندر سنگھ نے اپنا دامن بچانا چاہا۔

"اور میں تو بھائی بڑے ابا کے سامنے بے بس ہوں۔ ان کی تنگ نظری اور قدامت پرستی سے ناک میں دم ہے۔ ہر کوئی کمینہ اور ذلیل ہے۔ سوا سوہن چاچا کے ہر کسی سے خفا ہیں۔ ہر ایک سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔" صدیق حسن نے صفائی پیش کی۔

"میں یہ سب نہیں مانتا۔ تم دونوں چاہتے تو لڑکیوں کو اس نیک کام میں مدد دے سکتے تھے۔ موہن چاچا اور اپنے چچا کو بھی تم چاہتے تو سمجھا لیتے۔ مگر تم لوگ کچھ کرنا چاہتے ہو نہ بچوں کو کچھ کرنے دیتے ہو۔ ذہنی کاہلی ــــ جسمانی کاہلی ــــ بے عملی ــــ"

لڑکیاں بزرگوں پر ڈانٹ پڑتے دیکھ کر من ہی من میں خوش ہو رہی تھیں مگر چہروں پر آئی مسکراہٹ کو دبا گئیں کہ کہیں بعد میں کان نہ اینٹھے جائیں۔

"اچھا تو بیٹیوں اب ہماری اجازت بلکہ حکم ہے تم یہ نیک کام فوراً شروع کر دو۔ یہ لوگ کچھ کہیں گے تو میں سمجھ لوں گا۔"

"مگر چاچا ــــ گاؤں والیوں کو ہم کیا پڑھائیں، ہندی یا اردو؟" لتا نے پوچھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تارا اور خالدہ پٹاپٹ بولے جا رہی ہیں۔ کہیں چاچا یہ نہ سمجھیں کہ وہ بدھو اور کاہل ہے۔ ان دونوں کو تو ہر جگہ پیش پیش رہنے قابلیت ظاہر کرنے اور چاخ پٹاخ بولنے کا مرض ہے۔

"یہ تو پڑھنے والیوں کی مرضی پر ہے۔ جو ہندی پڑھیں انھیں ہندی پڑھاؤ،

جو اردو پڑھنا چاہیں انھیں وہ پڑھاؤ۔ بلکہ زیادہ اچھا تو یہ ہے کہ دونوں ہی زبانیں سکھاؤ۔ اس لئے کہ یہ دونوں ایک دوسری سے اتنی قریب ہیں جیسی ماں جائی بہنیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی دیوی کے دو روپ، ایک ہی درخت کی دو شاخیں کہہ لو۔ خاص کر ابتدائی صورت میں تو بس رسم الخط کا فرق ہوتا ہے ان میں۔"

حبیب میاں گاندھی جی کی طرح "ہندوستانی" کے معتقد تھے جس کو چاہے آسان اردو کہہ لو چاہے آسان ہندی، جس میں صرف لکھائی کا فرق ہوتا ہے۔ کیا دو بہنیں مختلف لباس نہیں پہنتیں؟ ان کا خیال تھا کہ جہاں تک شمالی ہند کے دیہاتیوں کی تعلیم کا سوال ہے صرف ہندوستانی ہی ایسی زبان ہے جو انھیں سکھائی جا سکتی ہے چاہے وہ کسی لپی میں سکھائی جائے۔

"اور صرف پڑھنا ہی نہیں تھوڑا بہت لکھنا، موٹا موٹا حساب بھی سکھانا چاہیئے۔" صفیہ بیگم نے کہا۔

"ہاں میں تم لوگوں کو جامعہ ملیہ نے تعلیم بالغان کا جو لٹریچر ہندی اور اردو میں شائع کیا ہے اس کا مکمل سٹ بھیج دوں گا۔ اس سے تمھیں بہت مدد ملے گی۔" حبیب میاں نے کہا۔

"اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو ان کے اور بچوں کے کپڑے سینا کاٹنا اور کڑھائی اور ہاتھ کا کام بھی سکھنا چاہیئے۔ ہاتھ کا کام وہ پڑھائی سے زیادہ شوق سے کریں گی۔" صفیہ بیگم نے سمجھایا۔

"چچی جان ہم برا بھلا خود تو لکھ پڑھ لیتے ہیں مگر پڑھانا اور سکھانا کہاں آتا ہے ہمیں؟" خالدہ نے کہا۔

"ہاں اور کیا یہ تو ہم لوگ جانتے ہی نہیں۔ اسی دن دیدی مجھے سوئٹر کا

نمونہ سکھا رہی تھیں مگر سکھا نہ پائیں۔ اُلٹا ڈانٹنے لگیں۔ اتنی ساری گاؤں کی عورتوں کو ہم کیا سکھا پائیں گے؟" تارا کا مقصد لتا کی شکایت کرنا نہ تھا۔ اس نے تو محض ایک مثال دی تھی۔ لیکن لتا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ماں کو بھی سخت ناگوار گزرا کہ ان کی لاڈلی کی یوں سب کے سامنے تذلیل کی گئی۔ خیر تارا سے تو وہ اچھی طرح سمجھ لیں گی۔ وہ یہ بھول جایا کرتی تھیں کہ تارا بھی انھیں کی بیٹی ہے۔

"کیوں بیٹی تم نے تو حبیب بھائی اور بھابی سے یہ کام خوب سیکھ لیا ہوگا میرا مطلب ہے بڈھے توتوں کو پڑھانے کا۔" صدیق حسن گیتا سے مخاطب ہوئے جو اس عرصے میں ایک جملہ بھی نہ بولی تھی۔

"گیتا؟ وہ تو ماہر ہے اس میں۔ صفیہ کا تو نام ہی نام ہے، کام تو ان کے مرکز میں سب میری بیٹی ہی کرتی ہے۔ کتنی عورتوں کو عالم فاضل بنا دیا ہے اس نے۔" فخر سے حبیب میاں نے کہا۔

یہ اداس، خاموش گیتا انھیں اجنبی لگ رہی تھی۔ آخر وہ ان لوگوں سے گھل مل کیوں نہیں جاتی؟ سندر سنگھ گیتا کے سلسلے میں ان سے بات کر چکے تھے۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ گیتا راضی ہو جائے تو عورتوں کی تعلیم کا مرکز یہاں فوراً کھل سکتا ہے۔ صفیہ بیگم کو وہ جانتے تھے کہ گیتا کو یہاں چھوڑنے پر راضی نہ ہوں گی۔ لیکن گیتا اگر خود مان گئی تو وہ مجبور ہو جائیں گی۔

سندر سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔ "بس پھر تو کام بن گیا۔ گیتا بیٹی یہاں عورتوں کی تعلیم اور سدھار کا کام سنبھال لے گی اور یہ سب لڑکیاں اس کا ہاتھ بٹائیں گی۔"

گیتا کے اندیشے سامنے آرہے تھے۔ وہ کل ہی بھانپ گئی تھی کہ یہ لوگ اُسے روکنے پر اصرار کریں گے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ساری اسکیم، یہ ساری گفتگو

سب اسی چال کے ماتحت ہے کہ اسے کملا نگر میں روک لیا جائے اور اس کے مستقبل کے سارے منصوبے خاک میں ملا دئے جائیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو پھر گیتا بیٹی تم راضی ہونا یہاں رہ کر اپنی بہنوں کی سیوا کرنے پر؟" صدیق حسن نے پھر پوچھا۔ ان کی بھی بڑی خواہش تھی کہ گیتا یہاں رہ جائے، کلو اور خالدہ کی تعلیم کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

"جی! میں؟ جی نہیں میری تو تعلیم ابھی خود ہی مکمل نہیں ہوئی" گیتا نے رک رک کر جواب دیا۔

"کہاں تک پڑھی ہے میری بیٹی؟" اشتیاق سے سندر سنگھ نے پوچھا۔

"بی اے کا امتحان دیا ہے اس سال" فخر سے صفیہ بیگم نے کہا۔

"ماشاء اللہ" صدیق حسن مرعوب ہو کر بولے۔

"سچ مچ" سندر سنگھ نے کہا۔ وہ صرف میٹرک پاس تھے اور بھانجی نکلیں بی۔ اے۔

"اوئے گیتا دیدی۔ اتنی قابل" تارا اور خالدہ نے سوچا اور لتا رشک بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سیتا دیوی اب اندر سے باہر آگئی تھیں "ہمارے سرندر نے بھی تو اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے" یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے ایف۔ اے کا امتحان دیا ہے انھوں نے مہمانوں کی نظر میں اس کی عزت قائم رکھنے کو کہا۔ مگر سندر سنگھ نے ان کی بات جھٹلوٹی کر کے سب کی نظروں میں انھیں گرا دیا۔ "جی نہیں آپ کے سرندر نے بی اے نہیں ایف اے کا امتحان دیا ہے اور بھگوان کی کرپا سے ابھی پاس نہیں کیا۔ اگر پچھلے سال کی طرح اس بار بھی لڑھک گئے تو۔۔۔۔"

مگر وہ بات پوری کرنے سے پہلے ہی رک گئے۔ یہ گستاخی ان کی

شریمتی جی کی برداشت سے باہر تھی۔ ان کا اور ان کے سپوت کا یوں مہمانوں کے سامنے، لڑکیوں کے سامنے اپمان کیا جائے؟ ان کی تیوری کے بل، آنکھوں کی چمک، گالوں کی سرخی ان کے غصے کو ہر ایک پر ظاہر کر گئی۔ گھبرا کر سندر سنگھ نے بات پلٹی۔ "ہاں تو حبیب بھائی — عورتوں کے مرکز کو گیتا سنبھال لے گی، اب آپ مردوں کے لئے کسی کو بھیجئے۔ اب کی بار آپ آئیں گے تو دیکھیں گے کہ میری بیٹی نے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔"

"مگر گیتا تو ابھی ایم اے کرنا چاہتی ہے۔" صفیہ بیگم نے گیتا کو سہارا دیا۔

"نہیں گیتا دیدی ہم اب تمھیں جانے نہ دیں گے۔" تارا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"ہاں دیدی خدا کے واسطے ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔" خالدہ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"گیتا۔ ایسی بھی کیا بے مروتی!" لتا نے کہا۔

"نہیں گیتا بیٹی اب مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" سندر سنگھ نے حق اور اپنایت کے زور پر لہجے کو یقینی بنا لیا۔

"تم تو بیٹی کملا نگر کے حق میں ایک غیر متوقع نعمت ہو جو خدا نے ہم گنہگاروں پر رحم کھا کر نازل فرمائی ہے۔" صدیق حسن نے اپنی ثقیل زبان میں اظہار خیال کیا۔

"نا — بیٹی اب کہاں جاوے گی۔ یہاں ہی رہے گی۔" رسوئی سے دادی نے چلا کر کہا۔

گیتا کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک مچھلی ہے جو مچھیرے کے جال میں پھنس چکی ہے اور اب جال کی رسیاں دھیرے دھیرے کھینچی جا رہی ہیں۔

اس نے بے بسی سے صفیہ بیگم کی طرف دیکھا کہ وہ اس کی مدد کریں۔
"یونیورسٹی کھلنے میں دو ماہ باقی ہیں۔ اس عرصے میں گیتا یہاں رہ کر آپ لوگوں کے کام میں مدد کر سکتی ہے" صفیہ اس کی کمک پر آئیں۔

"ہاں، ان دو ڈھائی مہینوں میں وہ یہاں ان لڑکیوں کو بہت کچھ سکھا سکتی ہے پھر میں کسی اور عورت کو بھی ڈھونڈ دوں گا" حبیب میاں اندازہ لگا چکے تھے کہ گیتا مستقل طور پر یہاں رہنے پر تیار نہ ہوگی۔

گیتا اب بھی خاموش رہی۔ صفیہ نے ایک بار کہا بھی۔ "گیتا تو بھی تو کچھ بول"۔ اس نے دو تین بار کچھ کہنا چاہا ــــ مگر پھر چپ ہوگئی۔ اتنا اصرار، اتنی محبت، اتنا بھروسہ؟ کیسے ٹھکرائے ان سب کو؟

گیتا اور سب کا کہنا ٹال بھی دیتی مگر حبیب میاں کے اصرار کو کیسے رد کرے؟ خصوصاً جب انھوں نے اسے یہ سمجھایا کہ کملا نگر کتنا پچھڑا ہوا ہے اور یہاں سدھار کا کام کتنا ضروری، اہم اور کٹھن ہے، جس کو کرنا ہر نوجوان کا مقدس فرض ہونا چاہیے۔ اور اس کٹھن کام کو گیتا جیسی صاحبِ عزم اور ان تھک محنت کرنیوالی لڑکی ہی کر سکتی ہے۔ انھوں نے اس طرح اس سے کہا کہ گیتا کو خود اس کام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہوگیا اور اگرچہ بادلِ ناخواستہ مگر اس نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ دو تین مہینے یہاں رہ کر ضرور کام کرے گی۔ مگر شرط یہ رکھی کہ وہ وہاں اس کے لئے نوکری کی تلاش میں رہیں۔

تیسرے دن شام کو حبیب میاں، صفیہ بیگم اور سلیم کی انبالے روانگی تھی۔ صبح کو گیتا نے چپکے سے صفیہ سے کہا۔ "آپا ـــ میں دو مہینے سے زیادہ یہاں نہ رہوں گی۔ ـــ مجھے سکون صرف آپ کے دامن میں مل سکتا ہے۔ آپ میری

سہاتا ہے ہاتھ نہ اٹھا لیجئے گا" اور چند شبنم کے قطرے اس کی نرگسی آنکھوں سے ٹپک کر دامن میں جذب ہو گئے۔

صفیہ پر اس کی جدائی خود بہت شاق تھی۔ مگر کیا کریں مجبور تھیں۔ انھوں نے زور سے اسے چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔ "باؤلی کیسی باتیں کرتی ہے۔ تو تو مجھے زہرہ سے زیادہ پیاری ہے" اور پھر دیے کی جوت پھر سے گیتا کے من میں دمک اٹھی۔

سورج دھیرے دھیرے پچھم کی اور جا رہا تھا۔ پیڑوں کے سائے لمبے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ڈھور ڈنگروں کے گلے چراگاہوں سے واپس آ رہے تھے اور ان کے گلے کی گھنٹیوں کی ٹنن ٹنن چرواہے کی بانسری کی تان کے ساتھ مل کر ایک پرسوز موسیقی فضا میں بکھیر رہی تھی۔ دن بھر کی تلاش معاش کے بعد تھکے ہارے پنکھ پکھیرو بھی بال بچوں کے لئے چونچوں میں دانہ دنکا لئے جھنڈ در جھنڈ اڑتے ہوئے گھونسلوں کی طرف چلے آتے تھے اور ان کی پرمسرت چہکار سے سارا گاؤں گونج رہا تھا۔ گھروں سے اپلوں کا نیلا نیلا دھواں نکل رہا تھا۔

کھیتوں کے اس پار حبیب میاں کی پرانی سی کار کھڑی تھی۔ بندا اور سرندر اور ننگل پہلے ہی سے دوڑ گئے تھے کہ راستے میں سے مردوں کو ہٹا دیں۔ اپنے ہاں صفیہ بیگم پردہ نہ کرتی ہوں مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ سسرال کے گاؤں میں منھ کھلے پھریں؟ انھیں کوئی مجبور نہ کر سکتا تھا مگر گاؤں والوں پر تو ان کا بس تھا نا؟ اور گاؤں کے بڑے بوڑھے خود ہی اس بات پر خفا تھے کہ شدن میاں کی بہو منھ کھلے، بے پردہ موٹر میں کیوں آئی ہے۔

ڈیوڑھی کے اندر دونوں گھرانوں کی عورتوں کے علاوہ گاؤں کی اور بہت سی عورتیں بھی جمع تھیں جو اس سندر، شیریں زبان، ہنس مکھ بہو کو وداع کرنے آئی تھیں، جس نے تین دن میں ہی سب کا دل موہ لیا تھا۔ سا جو باقاعدہ رو رہی

تھی۔ خالدہ کی آنکھیں روتے روتے پھول سوج کر کپا ہو چکی تھیں۔ تارا اور لتا بھی آبدیدہ تھیں۔ زینب بی اور دادی بھی متاثر تھیں۔ البتہ سکینہ کے جذبات کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ ہاں، صرف سیتا دیوی کے چہرے پر مسرت و اطمینان کی جھلک سی موجود تھی جس کو وہ چھپانا چاہتی بھی نہ تھیں۔ مگر جس کا دل سب سے زیادہ درد سے بھرا تھا، اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ اس نے اپنے چہرے پر بیگانگی اور بے پروائی کی نقاب پہن لی تھی۔

صفیہ نے بڑھیوں کو سلام کر کے دعائیں لیں۔ لڑکیوں اور بہوؤں کو گلے لگایا، بچوں کو پیار کر کے مٹھائی کھانے کے لئے روپے دئے۔ ایک بڑھیا نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"آتی رہیو بہو یہ سسرے کا گاؤں ہے ۔۔۔ ہم گریبوں کو بھی ایسی لچھمی جیسی بہو کے درشن ہو جاویں گے"۔

صفیہ قدم قدم آگے بڑھ رہی تھیں۔ زینب بی نے گلے سے لگا کر بہت سی دعائیں دیں۔ دادی تو ان کے اخلاق پہ بالکل ہی فدا ہو چکی تھیں اور بار بار بہو کو سنا کر کہہ رہی تھیں "بہو تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ بھگوان سب بہو بیٹیوں کو تمہارا سا سبھاؤ دے"۔

سیتا دیوی شرما شرمی رخصت کرنے آئی تو تھیں، مگر الگ کھڑی تھیں صفیہ خود ان کے پاس جا کر ملیں۔ "بھابی سکندر پور ضرور آنا اور تارا اور لتا کو بھی لانا"۔

"ہاں بہن تمہارے دیور لائے تو ضرور آؤں گی۔ پر میرے ساتھ آنا جانا تو انھیں زہر لگے ہے"۔ کھالی سے انھوں نے جواب دیا۔

جب تارا اور خالدہ کو گلے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔ "پاگل لیو رو رہی کیوں ہو، میں پھر آؤں گی اور تمھیں بلاؤں گی"۔ پھر ان کی

نظر ساجو پہ پڑی تو بڑھ کر اُسے گلے سے لپٹا لیا۔ "ساجو میرے ہاں ضرور آئیو۔ آئے گی نا ؟"

ساجو نے روتے ہوئے گردن ہلا دی "ضرور آؤں گی بی بی"

سلیم مچلے کھڑے تھے کہ موتی بیگم کو لے کر جاؤں گا۔ خود موتی بیگم نے بغیر کسی سے کچھ کہے سُنے ایک جوڑا کپڑا، چھوٹا سا میلا تکیہ اور دلائی لپیٹ لپٹا بغل میں دبا موٹر میں رکھ آئی تھیں۔ اب بھلا کون ان کو "چاچی" کے ساتھ جانے سے روک سکتا تھا۔ اب اس انداز سے ایک ایک سے گلے مل رہی تھیں جیسے وہ بھی جا رہی ہیں۔

سب سے مل کر صفیہ نے گیتا کو گلے سے لگایا "گھبرائیو نہیں گیتا۔ میں چھٹیاں ختم ہوتے ہی بلا لوں گی"

"آپا ایسا لگتا ہے کہ اب — اب اس پنجرے سے میں نکل نہ سکوں گی" رندھے گلے سے زیرِ لب گیتا نے کہا۔

"گھبراتی کیوں ہے۔ میں جو کہہ رہی ہوں"

"آپ میرے لئے کوئی کام تلاش کر رکھئے۔ پھر مجھے کوئی یہاں روک نہ سکے گا" بہت آہستہ سے گیتا نے کہا۔ زور سے بولنے کے وہ اس وقت یوں بھی ناقابل تھی۔ "میرا آپ کے سوا کوئی نہیں آپا"

صفیہ بیگم نے دوبارہ اسے گلے سے لگایا اور آنسو پی کر باہر کی طرف مڑ گئیں۔

کلو موٹر کے ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور گاؤں کے بہت سے بچے، اس کے پرانے دوست، حسرت سے اپنی ہمجولی کو دیکھ رہے تھے جو اس موٹر والے سے مل کر ان کو بھول گئی تھی۔ مگر کلو موٹر کے عشق اور سلیم کی محبت میں مبتلا اور

سب سے بیگانہ مزے سے موٹر میں بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ مگر جب صدیق حسن نے اسے اتارنا چاہا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اس نے صفیہ بیگم سے لپٹ کر چیخنا رونا شروع کر دیا۔ اور سُرتیا سُر سلیم صاحب نے ملایا۔ آخر کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے موٹر سے اتارا گیا۔ صفیہ کا دل اس بے ماں کی بچی کی محبت پر تڑپا جا رہا تھا مگر کیا کرتیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی تو اس کی آواز سلیم کی ہچکیوں اور کلو کی چیخوں میں دب کر رہ گئی۔

جیسے ہی صفیہ ڈیوڑھی سے نکلیں، گیتا پیچھے لپکی کہ ان کے ساتھ موٹر تک پہنچانے جائے۔ سب عورتوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور قبل اس کے کہ دادی یا کوئی اور اسے ٹوکے تارا نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "گیتا دیدی ہم لوگ یہاں باہر نہیں نکلتے" اس کی آواز دھیمی اور ہمدردانہ تھی۔

گیتا نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے قید خانے سے نکلنے کا کوئی رستہ تلاش کر رہی ہو مگر ہر چہرے پر یہی ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ کہیں کوئی روزن نظر نہ آیا۔ اس نے ایک گہری طویل سرد آہ بھری اور کٹھ پتلی کی طرح تارا کا ہاتھ پکڑے اندر صحن کی طرف مڑ گئی۔

۷

حبیب میاں ایک کامیاب وکیل، پرجوش قومی کارکن، ہر دلعزیز سماجی خادم اور آزادی کے پرستار کی حیثیت سے اپنے صوبے ہی میں نہیں دور دور مشہور تھے وکالت کو انھوں نے کسبِ زر کا ذریعہ نہ بنا کر خدمتِ خلق کا آلہ بنا لیا تھا۔ کتنے انگریزی سرکار کے "معتوبین" اور "غداروں" کے مقدمے انھوں نے دل و جان سے لڑے تھے۔ اور ان کی جرح اور بے دھڑک تقریروں کی دھاک بڑے بڑے

ججوں اور جیوری کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے موکلوں میں مظلوم اور
غریب لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور ان ہی وجوہ سے وکالت جو دوسروں
کو لکھ پتی بنا سکتی ہے انھیں صرف معمولی طریقے سے گزر اوقات بھر کا پیسہ
فراہم کرتی تھی۔ یوں بھی وہ اپنا زیادہ وقت دوسرے کاموں میں صرف کرتے
تھے۔ آزادی سے پہلے کئی سال تو جیل میں بسر ہوئے۔ باہر رہے تو مقامی کانگریس
کمیٹیوں اور دوسری ذمہ داریوں کا بار اٹھاتے رہے۔ اور ساتھ ہی سماجی اصلاح
کے کام کی داغ بیل بھی انھوں نے ڈال دی تھی، جس میں سب سے زیادہ زور
وہ ان پڑھوں کو پڑھانے اور انجانوں کو سکھانے سمجھانے پر دیتے تھے — اور
آزادی کے بعد سے تو وہ اس میں اور بھی تندہی سے لگ گئے۔ اس لئے کہ ان کا
عقیدہ تھا کہ آزاد ہندوستان کے ہر شہری کو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا ہونا اور دنیا کے
اور دیس کے معاملات سے آگاہ ہونا اشد ضروری ہے۔ ورنہ ہماری یہ آزادی
پھر غلامی میں بدل سکتی ہے۔ لیکن ان کے کام کا دائرہ صرف لکھنے پڑھنے تک
محدود نہ تھا بلکہ سکندرپور کے اور اس کے آس پاس کے دیہات میں دوسرے
سوشل کاموں کو بھی انھوں نے اس میں شامل کر لیا تھا۔ علاوہ عورتوں اور
ان پڑھ مردوں اور ننھے بچوں کے تعلیمی اور تربیتی مرکزوں کے شہر کے محلّوں اور
دیہاتوں میں صحت و صفائی کی مہم اور دوسرے اصلاحی کاموں کی کوشش بھی
برابر جاری رہتی تھی۔ انھوں نے آزادی کے بعد اپنی قربانیوں کی قیمت نہ
مانگی، نہ چاہی اور نہ نچنت ہو کر بیٹھ گئے کہ منزلِ مقصود آ گئی بلکہ یہ سمجھا کہ ابھی
تو منزل پر پہنچنے کا صرف راستہ کھلا ہے۔ وہ چاہتے تو کیبنٹ میں کوئی عہدہ
یا کم سے کم صوبے میں وزارت مل سکتی تھی۔ مگر وہ عہدہ، شہرت اور حکومت سے
دور بھاگتے اور خاموش سماجی خدمت پر جان دیتے تھے۔ جب سکندرپور کے لوگوں

نے پارلی منٹ کی ممبری کے لئے ان کا نام پیش کیا تو انھوں نے سخت مخالفت کی لیکن پرستاروں اور عقیدت مندوں کے سامنے ایک نہ چلی اور بغیر کچھ خرچ کئے اور ذراسی کوشش کئے وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے وکالت کو خیرباد کہا اور جتنا وقت پارلی منٹ سے بچتا سب کا سب سوشل سروس میں صرف کرنے لگے۔

ان کی دلکش شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ دوست تو دوست مخالف بھی ان کا دم بھرتے اور مشکل اور پریشانی میں ان سے مدد اور مشورے کے طالب ہوتے تھے اس لئے کہ انھیں یقین تھا کہ اگر وہ حق پر ہیں تو حبیب میاں گلے گلے ان کا ساتھ دیں گے۔ اگرچہ سیاسی خیالات میں ان کے اپنے دوستوں، پارٹی کے بعض ممبروں سے کافی اختلاف رہتا تھا اور اپنوں پر وہ غیروں سے زیادہ تنقید اور نکتہ چینی کے قائل تھے، لیکن ان کا سخت سے سخت مخالف بھی یہ بات جانتا تھا کہ اس میں ذاتی لاگ یا لگاؤ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

وہ پکے نیشنلسٹ تھے اور اس لئے دوسرے خیال کے مسلمان ان پر ہزاروں الزام لگاتے، ان کو مسلمان ماننے ہی سے انکار کرتے، گاندھی کا پٹھو، آزاد کا دُم چھلا، ہندو کا غلام وغیرہ کہہ کر جلے پھپھولے پھوڑتے، مگر حبیب میاں ان باتوں کو سن کر اس طرح مسکراتے جیسے کسی پاگل کی بکواس یا بے وقوف بچے کی باتوں پر دانشمند بزرگ ہنس پڑے۔ بیشک وہ پکے نیشنلسٹ، آزادی کے پرستار اور کانگریس کے ساتھی تھے، جنھوں نے دیس کی آزادی کے لئے کتنی کٹھنائیاں سہیں، بدنامیاں برداشت کیں اور قید و بند کی زندگی گزاری تھی۔ اسی کے ساتھ وہ سچے مسلمان اور اسلام کے عاشق تھے، اپنے مذہب سے انھیں والہانہ لگاؤ ہوتے ہوئے بھی کسی دوسرے مذہب سے تعصب نہ تھا، بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کے مذہب ہی نے

انھیں دوسرے مذاہب کی عزت کرنے کی تلقین کی ہے اور ان کے قومی اور سیاسی خیالات
میں ان کا مذہب رکاوٹ نہیں ڈالتا بلکہ معاون ثابت ہوتا ہے۔ قومی رہنماؤں میں وہ
گاندھی جی اور مولانا آزاد سے بہت متاثر تھے اور پنڈت نہرو کے دل و جان سے
حامی، اور سچے دوست تھے۔

یوں تو حبیب میاں سب کی مدد کے لئے مستعد رہتے تھے، مگر ان کی توجہ کا
اصلی مرکز وہ بے روزگار پریشاں حال ہونہار نوجوان تھے جو ہندوستان کا انمول
سرمایہ اور اس کے مستقبل کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن کو وسائل کی کمی اور حالات
کی ناسازگاری نے عضوِ معطل بنا دیا ہے۔ جن کے حال سے اربابِ سیاست، رہنمایانِ
قوم، حاکمانِ وقت اور صاحبِ استعداد یا بے خبر ہیں یا بے پروا۔ ایسے کتنے نوجوان ادھر
کہیں بے سہارا نہ پاکر ان کے پاس آتے اور حبیب میاں دل و جان سے ان کی مدد
کرتے ـــ کسی کو باہر جاکر تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دلوانا ہے، کسی کو یہاں کی
یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ دلوا کر فیس وغیرہ کا انتظام کرانا ہے، کسی کو نوکری کی
ضرورت ہے، کسی کو صرف کام چاہیئے۔ کسی کو ذہنی الجھن ہے۔ دماغی پریشانی ہے۔
زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے کسی رہنما کی تلاش ہے ـــ اور حبیب میاں
اپنے امکان بھر ایسے نوجوان کی مدد ضرور کرتے۔ ہاں، کاہل، بے عمل یا دوسروں کے
سہارے چلنے کے شوقین لوگ ان سے ہمدردی کی جگہ ڈانٹ ہی پاتے۔ ان کا ہاتھ
نوجوان کی نبض پر رہتا تھا۔ تھوڑی دیر کی باتوں کے بعد وہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ
اس میں کس کام کی صلاحیت ہے۔ ایسے نوجوان جن میں ذرا سا خدمت کا جذبہ اور
سیوا کی لگن دیکھتے وہ ان کے سب سے زیادہ محبوب بن جاتے۔ ان کی اس چنگاری کو
بھڑکا کر شعلہ بنانا اور ان سے سماجی خدمت کا کام لینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں
نے سکندرپور اور اس کے باہر جتنے ایسے مرکز قائم کر رکھے تھے ان کو زیادہ تر ان کے

ساختہ پرداختہ نوجوان ہی سنبھالے ہوئے تھے۔ یہی نہیں اور بھی جہاں کہیں کسی بے لوث، ان تھک اور پرجوش کارکن کی ضرورت ہوتی، حبیب میاں سے مشورہ لیا جاتا۔ اس معاملے میں ان کی حیثیت ایک انسٹی ٹیوشن کی سی ہوگئی تھی، جس نے ان کی آنکھیں دیکھیں اور ان کے ساتھ کام کیا وہ اپنی دس خامیوں کے باوجود دوسرے کارکنوں سے کہیں بہتر نکلتا تھا اور یہ نوجوان حبیب میاں سے اتنی گہری محبت اور عقیدت اپنے دل میں رکھتے تھے جو آج کل کے دور میں شاذونادر ہی نظر آتی ہے۔

حبیب میاں کی شخصیت کا جادو یوں تو دوست، دشمن، بڈھے جوان، اپنے پرائے سبھی کو متاثر کرتا تھا مگر ان کے خیالات کا جتنا گاڑھا رنگ صفیہ بیگم پر چڑھا تھا اتنا کسی اور نے قبول نہ کیا تھا۔ خود ان کے بچے بھی ان کی شخصیت سے اتنے متاثر نہ تھے۔ حالانکہ جب صفیہ سے ان کی شادی ہوئی تو وہ بالکل بظاہر ہر چیز میں، ان سے مختلف تھیں اور وہ سوچا کرتے تھے کہ ان کی زندگی کیسے اس نازونعم میں پرورش پائی امیرزادی کے ساتھ بسر ہو سکے گی۔

حبیب میاں کے ماموں، صفیہ کے والد، ایک چھوٹے موٹے تعلقدار تھے اور ان کو بچپن سے نوجوانی تک وہ سارے آرام اور عیش میسر رہے جس کا یہ طبقہ صدیوں سے عادی بن چکا تھا۔ زمینداری کی گرتی دیواریں اس وقت بڑی مستحکم معلوم ہوتی تھیں۔ اور سرکار انگریزی کی سرپرستی میں اس کے یہ ساختہ پرداختہ وفادار بڑے ٹھاٹ اور شان سے بسر کر رہے تھے۔ نہ انھیں دیس کی فکر تھی نہ قوم کی چنتا، نہ آزادی کی لگن نہ دنیا کی کچھ خبر۔ وہ نہ ان جانباز رہنماؤں کو کچھ سمجھتے تھے، جو آزادیٔ وطن کے لئے ہزاروں مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ نہ ان کروڑوں عوام کے دل کی دھڑکنوں سے واقف جو دیس کو غلامی کے پنجے سے نکالنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ نہ انھیں ملک میں پھیلی ہوئی خوفناک مفلسی،

شرمناک جہالت، تباہ حالی اور بربادی کا احساس تھا اور نہ غلامی کی پیدا شدہ دوسری لعنتوں کا۔ ان کے نزدیک مہاتما گاندھی ایک سرپھرے انسان تھے جو انگریز جیسی طاقتور قوم کو ملک سے نکالنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ قوم جو ان کی ان داتا تھی جس کی سلطنت میں آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ جواہر لال نہرو کی حیثیت کسی باغی نوجوان سے زیادہ نہ تھی جو خواہ مخواہ نچلے طبقے کو سر چڑھا رہا ہے اور کانگریس ایک باغی جماعت تھی جس سے تعلق رکھنا تباہی و بربادی کو دعوت دینا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں بعض مصلحت پسندوں اور دور بینوں نے اپنا کچھ رنگ بدلا بھی، اور بعض پرخلوص جوشیلے نوجوان دل سے اس تحریک میں شامل ہوئے لیکن اکثریت انھیں لوگوں کی تھی جو اپنے شیشے کے محلوں میں بند دادِ عشرت دیتے رہے کبھی آس پاس کوئی کنکری گری بھی تو وہ جھپٹ ان نازک آبگینوں کی حفاظت کے لئے "ولی نعمت" کا سہارا ڈھونڈتے اور پھر مطمئن ہو کر نیرو کی طرح چین بنسری بجانے لگتے۔ روم جلے یا بھاڑ میں جائے، ان کی بلا سے۔

صفیہ بیگم کا بچپن اسی ماحول میں بسر ہوا۔ لیکن شادی کے بعد اپنے شوہر کے روپ میں جب انھیں نئے ہندوستان کا جلوہ نظر آیا تو وہ سخت پریشان ہوئیں۔ شادی سے پہلے وہ ان کے سرپھرے پن کی بہت سی باتیں سنا کرتی تھیں۔ مگر اپنے الھڑپنے میں اس پر کبھی غور نہ کیا تھا۔ وہ کھدر پہنتے ہیں۔ انگریز سے لڑ لیتے ہیں۔ گاندھی کے پیرو ہیں مسلمانوں کے دشمن ہیں — ہیں تو ہوا کریں ان کی بلا سے۔ ہاں جب شادی سے دو تین سال پہلے انھوں نے یہ سنا کہ وہ جیل گئے تو خاندان میں قیامت برپا ہو گئی۔ صفیہ کے والد نسبت توڑ دینے پر تلے ہوئے تھے مگر حبیب میاں کے باپ نے اپنی ٹوپی ان کے پاؤں میں ڈال دی۔ یوں بھی بچپن کی منگنی کہیں شریفوں میں توڑی جا سکتی تھی۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد جب حبیب میاں نے وکالت کا

امتحان دے کر پریکٹس شروع کر دی تو ذرا لوگوں کو اطمینان ہوا اور سب نے مناسب یہی سمجھا کہ ان کا بیاہ کر دیا جائے۔ صفیہ جیسی بیوی پاکر وہ کسی اور خبط میں مبتلا نہ رہیں گے، یہ خاندان بھر کو یقین تھا۔

صفیہ حبیب میاں کو اس وقت سے چاہتی تھیں جب چاہت کا مفہوم بھی نہیں جانتی تھیں۔ کم سنی سے ان کے من مندر میں جس دیوتا کی مورتی براجمان تھی وہ انھیں کی تھی۔ مگر شادی کے بعد بجائے مسرت کے خوف نے ان پر غلبہ پالیا۔ ان کا یہ کھدر پوش محبوب جانے کیسی باتیں کرتا جو کسی طرح ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ انھوں نے مولوی، ماسٹر اور میم سے انگریزی، اردو اور فارسی کی خاصی تعلیم پائی تھی۔ بہت سے قصے کہانیاں اور ناول پڑھ چکی تھیں۔ کتنے شاعروں کے دیوان حفظ تھے، مگر حبیب میاں کی باتیں سمجھنے میں ان میں سے کسی میں سے مدد نہ مل سکی۔ وہ صفیہ کی الفت کے ترانے گانے کی جگہ آزادی وطن کے گیت گاتا تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی کا وعدہ کرنے کے بجائے، اس کے سامنے عزبت، جفاکشی اور محنت کی زندگی کی خوبیاں گناتا، صفیہ کے رخ روشن پر نثار ہونے کی جگہ شمع وطن پر قربان ہونے کی تمنّا کرتا تھا۔ محبوبۂ دل نواز سے زیادہ اسے لیلائے آزادی سے عشق تھا۔ اس رومانی زمانے اور رنگین دور میں اُسے داغ اور امیر اور جرأت کی معاملہ بندی کے بجائے رہنمایان قوم کی زندگی کی داستانیں اور آزادی کی تحریک کے افسانے سنانے کا شوق تھا۔ وہ بے چاری بھلا ان باتوں کو کیا سمجھتیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان سے گھبرانے اور اس "موئی آزادی" سے بالکل اس طرح جلنے لگیں جیسے وہ گوشت پوست کی سچ مچ کی حبیب میاں کی کوئی محبوبہ ہو۔

حبیب میاں ان کی کیفیت کو سمجھتے تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ صفیہ کیلئے ان جیسی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ یوں بھی وہ مجبور کر کے کسی سے اپنا حکم منوانا

پسند نہ کرتے تھے۔ جب تک کوئی خیال یا عقیدہ دل وجان سے قبول نہ کیا جائے
فضول و بیکار ہے۔ انھوں نے صفیہ کو پوری آزادی دی کہ وہ جہاں خوشی
اور آرام سے رہ سکیں رہیں۔ انھیں جب فرصت ہوا کرے گی آجایا کریں گے۔
چنانچہ صفیہ کئی برس تک اپنی سسرال یا میکے میں اسی پرانی شان سے رہتی
رہیں اور حبیب میاں برائے نام وکالت کے ساتھ قومی کاموں میں سرگرم
رہے، جب وہ سال چھ مہینے میں آٹھ دس دن کے لئے آجاتے تو ان کی باغ و
بہار طبیعت اس سوئے ہوئے، حبس، ٹھہرے پانی کے سے ماحول میں زندگی
کی لہر دوڑا دیتی۔ صفیہ کی زندگی میں جیسے بہار آجاتی۔ مگر ان کے جاتے ہی حویلی
کی یہ کالی کالی دیواریں، بھیانک دالان، فراخ صحن، منقش بام و در انھیں
کاٹنے کو دوڑتے۔ نقرئی مسہری اور مخملی گدوں پر کانٹے بچھ جاتے، ریشم و
کمخواب بدن میں چبھنے لگتا، زیور و جواہرات ڈنک مارنے لگتے۔ مرغن کھانے
حلق میں پھنستے، لوگوں کی محبت و ہمدردی زہر لگتی۔ ایک من موہنی صورت
ان کے دل میں مسلسل کھٹک پیدا کرتی رہتی۔ "کیا بات ہے آخر یہ؟ وہ اتنے
دکھ جھیل کر، مصیبت اٹھا کر بھی خوش اور مطمئن ہیں اور میں اتنے عیش و آرام
میں رہتے ہوئے بھی بے چین و بیقرار؟" وہ اپنے محبوب شوہر کی جیتے جی ہوتے
ہوئے بھی بیوہ کے دن بتا رہی تھی۔ ننھی سی بچی باپ کی قربت اور محبت کو
ترستی۔ بعض وقت ان کا دل بیقرار ہو جاتا، جی چاہتا ان سب سنہری جالوں
کو توڑ ڈالیں اور اپنے شوہر کی آغوش محبت میں سما جائیں۔ جہاں ہر کٹھنائی
بڑے سے بڑے عیش پر بھاری ہوگی۔ مگر ان کے ان ارادوں کی حیثیت،
ان بلبلوں کی سی تھی جو ذرا دیر کو پانی کی سطح پر ابھرتے ہیں اور پھر ٹوٹ
جاتے ہیں۔

یوں سارا خاندان میکے اور سسرال دونوں جگہ، ان کی خاطرداری اور نازبرداری میں لگا رہتا تھا۔ ساس سسر اپنی قسمت پر ناز کرتے اور اپنے بیٹے کو صلواتیں سنایا کرتے جو ایسی پیاری، اتنی اچھی بیوی کے ہوتے "آوارہ گرد" پھرتا ہے اور اس کو اداس رکھتا ہے۔ ماں باپ بیٹی کے نصیبوں کو روتے کہ ہائے ان کا ہیرا کیسے پتھر سے مارا گیا۔ بہنیں اور بھاوجیں، عزیز رشتے دار سبھی ان کا خیال رکھتے تھے۔ مگر صفیہ کو ان لوگوں کی دلداری اور خصوصیت بھی ناگوار گزرتی۔ انھیں اس میں رحم یا تحقیر کا جذبہ نظر آتا۔ اور حبیب میاں کی محبت دل میں اور زیادہ گہری ہوتی جاتی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ ان کی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوتی گئیں اور محبت میں عقیدت کی آمیزش ہونے لگی، لیکن وہ اپنے دل کی حالت سے پوری طرح خود بھی آگاہ نہ تھیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں یہ خبر بجلی بن کر ان کے دل پر گری کہ حبیب میاں، نامعلوم مدت کے لئے جیل بھیج دیئے گئے ......

اور اس واقعہ نے صفیہ کو یکسر بدل ڈالا۔ صدمے کے پہلے شدید اثرات گزرنے کے بعد انھوں نے مستقبل کے لئے اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اور اس تیاری میں انھیں کیا کچھ کرنا اور جھیلنا پڑا یہ جذبات کے اتار چڑھاؤ کی ایک طویل داستان تھی جس کو صرف وہی جانتی تھیں۔ انھوں نے مرغن کھانے ترک کر دیئے۔ ریشم واطلس کو خیرباد کہا، ماماؤں اور نوکروں کی غلامی سے اپنے کو آزاد کر لیا، اور ایک سادہ جفاکش زندگی کی داغ بیل اس محلسرا میں ڈال دی۔ ساتھ ہی اس کی کوشش بھی شروع کر دی کہ ذہنی طور پر بھی وہ حبیب میاں کی رفاقت کر سکیں۔ سیاست سے، آزادی سے، اور دنیا سے باخبر ہونے کے لئے انھوں نے اپنے مطالعہ کو وسعت دی اور جوں جوں وہ اس راستے پر آگے بڑھتی گئیں منزل ان کے سامنے صاف، اور روشن ہوتی گئی۔

اور دو سال بعد جب حبیب میاں جیل سے چھوٹ کر گھر آئے تو جس صفیہ کو چھوڑ گئے تھے وہ انھیں نہ مل سکی۔ وہ نرم و نازک، چھوئی موئی، ان جان بے خبر رئیس زادی جانے ماضی کے دھندلکوں میں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ انھیں صفیہ کے روپ میں ایک صاحب الرائے، صاحب العزم، باخبر، محب وطن، آزاد خیال عورت کا جلوہ نظر آیا جس نے انھیں دریائے حیرت میں غرق کر دیا۔ نہ وہ رنگ روپ، نہ وہ رہن سہن، نہ وہ خیالات و عادات۔ اور پہلی بار جذباتی لگاؤ کے ساتھ ساتھ انھوں نے گہری، اَمٹ محبت کی کسک اپنے دل میں محسوس کی۔

اور جب حبیب میاں نے سکندر پور میں وکالت شروع کی تو صفیہ نے وہاں جاکر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میکے والوں نے بہت روکا، سمجھایا، سسرال والوں نے بھی منع کیا۔ کسی کو بھی حبیب میاں پر اعتبار نہ تھا، جانے کب وہ پھر جیل چلے جائیں اور یہ غریب پردیس میں اکیلی رہ جائے؟ مگر صفیہ اب وہ صفیہ نہ رہی تھیں جو اُن کے اشاروں پر بادلِ ناخواستہ بھی چلتی تھیں۔ پہلے تھوڑے دن کا بہانہ بنا کر گئیں اور دو مہینے بعد واپس چلی آئیں۔ دو تین مہینے بعد پھر گئیں اور اس کے بعد میکے یا سسرال جانے کا نام نہ لیا۔ برس دو برس بعد، بہت اصرار پر، چند دن کے لئے چلی جاتیں۔ ابتدا میں حبیب میاں بہت گھبرائے کہ صفیہ کیسے یہاں پر رہیں گی۔ ان کی آزاد منش طبیعت گھرداری کی ذمہ داریوں اور بال بچوں کا بوجھ اٹھانے سے بہت گھبراتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ صفیہ نے سارے گھر کی ذمہ داریاں ہی نہیں باہر کی بہت سی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں کہ وہ بے فکر ہو کر کاموں میں لگ گئے۔ اور اب دس گیارہ سال سے تو صفیہ نے ان کی سی زندگی کو اس خوبی سے اپنا لیا تھا اور سماجی خدمت میں اس تندہی اور بے جگری سے مصروف تھیں کہ حبیب میاں کو شاید یہ خیال بھی مشکل سے آتا ہو کہ کبھی ان کے اور صفیہ کے خیالات اور

طرزِ زندگی میں اتنا تضاد تھا۔ جن لوگوں نے تیرہ چودہ برس پہلے کی صفیہ بیگم کو دیکھا تھا صرف وہی اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کتنی بدل گئی ہیں۔ پاکستان سے برسوں بعد جب ان کے عزیز آتے اور ان سے ملتے تو حیران رہ جاتے۔ پندرہ سال پہلے کی نازک اندام، نازک مزاج امیرزادی اس نئے روپ میں کہیں زیادہ نکھرائی تھی۔ یہ سوتی، موٹے کپڑے ان کے متناسب جسم پر ریشم و کمخواب سے زیادہ سجتے تھے۔ اور اس سادگی میں جو جوبن تھی وہ اس آرائش سے کہیں زیادہ دلوں کو لبھاتی تھی ان کی نظر کی وسعت، خیالات کی ہمہ گیری، وطن کی محبت اور اہلِ وطن کی خدمت کا جذبہ اب ان کی شخصیت کا جزو بن چکا تھا۔ جن چیزوں کو پہلے انھوں نے ایک ہستی کی محبت میں اپنایا تھا اب وہ انھیں اس ہستی سے نہ سہی اپنی جان سے زیادہ پیاری تھیں۔ ابتدا میں لوگ ان کے خیالات کو ان کے شوہر کی آواز کی بازگشت اور ان کی صفات کو حبیب میاں کی شخصیت کا عکس کہا کرتے تھے مگر اب وہ ان میں اس طرح جذب ہو گئی تھیں کہ کسی طرح بھی مانگے تانگے کی چیز نہیں رہ گئی تھیں۔ وہ دبی ہوئی خوبیاں، وہ سوئی ہوئی خصوصیات جن کو اس گھٹے ماحول میں اُبھرنے کا موقع نہ مل سکا تھا، اس زندگی میں خوب نکھری تھیں۔ ان کی شخصیت کی دلکشی اور سیرت کے حسن نے ان کو، محدود حلقے میں سہی، پر حبیب میاں سے بھی زیادہ محبوب بنا دیا تھا۔ خاص کر نوجوانوں میں وہ اپنے شوہر سے زیادہ ہر دلعزیز تھیں۔ حبیب میاں سے وہ جھجکتے اور مرعوب رہتے، مگر صفیہ بیگم ان کی دوست اور رازداں بن جاتیں۔ حبیب میاں جہاں نرم دل اور ہمدرد تھے وہاں بعض اصولوں میں بہت سخت تھے۔ اخلاقی اصولوں سے روگردانی اور وطن کی محبت کی کمی، خود غرضی اور تن آسانی سے انھیں دلی نفرت تھی اور جس پر انھیں ان "صفات" کا شبہ بھی ہو جائے وہ اس سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔

صفیہ سکندر پور آنے کے کچھ دن بعد ہی پردے کی قید سے آزاد ہو چکی تھیں، اور زجس نے تو کبھی پردہ کیا ہی نہ تھا۔ اس بے راہروی پر انھیں تھپے والوں، خاندان والوں، خود سکندر پور میں محلے پڑوس والوں سے جو کچھ سننا اور جھیلنا پڑا تھا وہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ بعض کم ظرف، کینہ فطرت لوگوں نے ان کے کریکٹر تک پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، مگر آسمان کا تھوکا حلق میں آیا اور حبیب میاں اور صفیہ کے مخالفوں تک نے ان کو لعنت ملامت کی۔ ان کا سخت سے سخت معترض بھی ان کے اخلاق اور سیرت کی پختگی کا قائل تھا۔ جن لوگوں نے کمینی باتیں کیں ان پر جلد ہی روشن ہو گیا کہ پاکدامن عورت پر عیب لگانا اور چاند پر خاک ڈالنا ہم معنی ہے۔ پھر بھی کٹر مذہبی عقیدے کے لوگ ان سے ایک عرصے تک خفا ہی رہے، لیکن ان کے رکھ رکھاؤ اور برتاؤ کے سامنے لوگوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور اب تو اس دس بارہ سال میں دنیا ہی پلٹ گئی تھی اور کتنے ایسے گھرانوں میں جو سب سے زیادہ صفیہ بیگم کی بے پردگی پر معترض ہوئے تھے، پردے کی رسم اٹھ چکی تھی۔ اگرچہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ان میں صفیہ بیگم جیسی مضبوطی اور اصول پرستی نہ تھی۔ ان میں سے اکثر گھرانوں کی لڑکیاں فیشن اور بے باکی میں مغرب کی عورتوں کی سچی مقلد معلوم ہوتی تھیں اور یہ بزرگ ان کا کچھ بھی نہ کر پاتے تھے۔ حبیب میاں عورت کی آزادی اور مساوات کے سچے دل سے حامی تھے۔ وہ اسے میدان عمل میں پوری پوری آزادی دینے کے حق میں تھے۔ تاکہ وہ دیس اور قوم اور خاندان کی وہ سچی خدمت اور صحیح رہنمائی کر سکے جو عورت ہی کا حق ہے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ اس میدان کارزار میں ہندوستانی عورت کے فطری جوہر حیا اور شرافت قدم قدم پر اس کے ساتھ رہیں۔ مردوں میں بھی نیک چلنی اور اخلاقی بلندی پر وہ اسی قدر مُصر تھے۔ خاص کر جو لوگ قومی خدمت کو اپنائیں، ان میں اگر سیرت کی مضبوطی نہ ہو، تو ان کا خیال تھا کہ سب کیا دھرا اکارت

ہو جاتا ہے۔ اسی لئے نوجوان حبیب میاں سے زرا سہمے ہوئے رہتے تھے، اور صفیہ بیگم سے بے تکلف ہو جاتے تھے۔ جو اخلاقی اصولوں میں سخت ہوتے ہوئے بھی نرم اور ماں کا ممتا بھرا دل رکھتی تھیں۔

کملانگر سے واپس آتے ہی حبیب میاں اس کی ترقی اور بہبود کی اسکیم بنانے میں جُٹ گئے اور جب وہ مکمل ہو گئی تو صوبے کی حکومت کے پاس بھیج کر اس کوشش میں لگ گئے کہ وہ جلد سے جلد منظور ہو جائے۔ مگر لال فیتے کی کارروائی کے لئے تو برسوں کی مدت بھی کم ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ کوشش بھی شروع کی کہ چھوٹے پیمانے ہی پر سہی مگر کملانگر میں فوراً سماجی بھلائی کا کام شروع ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے کارکنوں کی ضرورت تھی۔ ایسے پُرخلوص انتھک کام کرنے والے نوجوانوں کی جو اس کام کی ابتدا میں جو کٹھنائیاں پیش آتی ہیں ان سے گھبرا نہ جائیں۔ انویم ان کا بڑا عزیز نوجوان ساتھی تھا۔ سب سے اہم اور کٹھن کام وہ اسی کے سپرد کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ سکندرپور سے پچیس میل پر ایک گاؤں میں کام کر رہا تھا۔ وہاں حبیب میاں نے دوسرا آدمی بھیجا اور انویم کو کملانگر روانہ کیا۔ اب وہ اس فکر میں تھے کہ کملانگر کے اسکول کے لئے، جو مڈل تک کا ہونے والا ہو گیا تھا، کوئی مناسب ہیڈ ماسٹر مل جائے۔

کچھ ہی دن بعد ایک دن ندیم زیدی آ نکلا۔ یہ بڑا جوشیلا، ترقی پسند، محنتی نوجوان تھا۔ مگر مزاج میں استقلال نہ تھا۔ جم کر کسی کام کو نہ کر سکتا تھا۔ فسادات کے زمانے میں حبیب میاں کے ساتھ اس نے بڑی بے جگری سے کام کیا تھا۔ مگر اس کے بعد دوسری رَو میں بہہ گیا۔ اور ان کے پاس سے کہیں اور چلا گیا۔ اب اسے پھر کام کی تلاش تھی۔ حبیب میاں نے اسے ٹٹولا۔ دیکھا بھالا۔ اور کملانگر

روانہ کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ انوپم اور ندیم مل کر کام کریں گے تو ایک دن کملا نگر کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔

۸

سماج سدھار کا کام فوجی حکومت کا سا ہو نہیں سکتا کہ ڈنڈے اور بندوق کے زور سے انقلاب پیدا کر دیا جائے یہ تو چمن بندی ہے جسے برسوں ماتھے کے پسینے اور جگر کے لہو سے سینچنے کی ضرورت پڑتی ہے، کٹھن تپسیا کرنی ہوتی ہے۔ صبر کے ساتھ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس میں دریا کی اوپری سطح تک نہیں اس کی گہرائیوں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اوپری خیالات کو نہیں ذہنوں کو بدلنا ہوتا ہے۔ صرف گھروں ہی کی صفائی کرنی نہیں ہوتی، دماغ کی کھڑکیاں کھولنا، ذہن کے جالے لینا اور دلوں کو بدلنا پڑتا ہے۔ یہ جانوروں کو سدھانا نہیں انسانوں کو سکھانے کا کام ہے۔

اس تھوڑی مدت میں کملا نگر میں کسی خاص تبدیلی کی امید کرنا خیالِ خام ہے۔ لیکن پھر بھی حبیب میاں کی آمد، ان کی باتوں اور ان نئے آئے نوجوانوں کی کوشش نے دماغوں میں کچھ ہل چل اور دلوں میں کچھ لرزش ضرور پیدا کر دی تھی۔ کملا نگر کا سدھار ہونا چاہیئے۔ یہ بات اکثر کے ذہن میں جم گئی تھی۔ کیسے؟ کب تک؟ کیونکر؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر کام کچھ نہ کچھ شروع ہو گیا تھا۔ گاؤں کے بعض حصوں میں کچھ صفائی نظر آنے لگی تھی۔ مدرسے میں لڑکوں کا داخلہ بڑھ گیا تھا۔ اگرچہ موجودہ ماسٹر سے لوگ مطمئن نہیں تھے، وہ غریب ان لوگوں میں تھا جسے تعلیم سے کوئی بھی مناسبت نہیں ہوتی۔ کہیں اور جگہ نہ پا کر مجبوراً ٹریننگ لینی پڑی اور پیٹ پالنے کی خاطر اس گاؤں کے اسکول میں آ گیا تھا مگر وہ اپنی

ذات کے ساتھ ساتھ اور ہر کسی سے بھی بیزار رہتا تھا۔ ٹھاکر سندر سنگھ کے ہاں رات کا اسکول شروع ہو چکا تھا جس میں دس پندرہ آدمی آتے ۔ اور اگرچہ زیادہ وقت گپ شپ، حقہ پینے، اپنا دکھ درد ایک دوسرے کو سنانے اور غیر موجود لوگوں کے دکھڑے رونے ہی میں گزرتا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ شُد بد ہندی جان گئے تھے۔ ٹھاکر سندر سنگھ اور صدیق حسن کو بھی شوق پیدا ہو گیا تھا کہ ان کا گاؤں ترقی یافتہ دیہات کی صف میں شامل ہو جائے۔ حبیب میاں کی وجہ سے ان کو بڑی امید بندھ گئی تھی کہ وہ کملا نگر کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں، اور ابھی سے جانے کتنی دیگیں خیالی پلاؤ کی تیار کر چکے تھے۔ گاؤں سے کہیں زیادہ فکر اس کی تھی کہ ان اسکیموں کی وجہ سے ان کو کیا کیا فائدے حاصل ہوں گے۔ گاؤں میں جو چند نوجوان گاؤں سدھار کا کام کرنا چاہتے تھے انھیں ان لوگوں سے کوئی خاص مدد نہیں مل سکی اس لئے کہ وہ بچائے خود بھی نہ جانتے تھے کہ اس کام کو کس طرف سے اور کیسے شروع کیا جائے۔

ہاں نئی زندگی کی لہر، دھیمی سہی، مگر جو ابھری تھی وہ باہر نہیں گھروں کے اندر دکھائی دے سکتی تھی۔ گیتا ان دو ڈھائی مہینوں میں کچھ زیادہ کام تو نہ کر سکی تھی پھر بھی جو کچھ ہوا وہ امید افزا تھا۔ اس کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ٹھاکر کے گھرانے کی روایات تھیں جو نہ اسے کسی کے گھر جانے دیتی تھیں اور نہ گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت تھی۔ بس اتنی ہی اجازت مل سکی تھی کہ وہ دوپہر کے وقت، گاؤں کی جو عورتیں اور لڑکیاں آجائیں، ان کو پڑھا دیا کرے۔

شروع میں گنتی تین سے زیادہ نہ تھی۔ ساجو، اس کی نند اور چودھری نرائن کی پوتی مدھو۔ پھر آہستہ آہستہ تعداد بڑھنے لگی اور اب کوئی پچیس کے قریب عورتیں اور لڑکیاں اس کے مرکز میں آنے لگی تھیں۔ کسی کسی دن تو تیس چالیس تک ہو جاتیں۔ عورتوں کو شوق دلانے کا سہرا ساجو کے سر تھا۔ وہ گاؤں کے ہر ہر گھر میں جاتی اور

اپنے "مدرسے" اور اپنی "ماسٹرنی" کی تعریفوں کے پل باندھا کرتی۔ گاؤں والیوں کی نظر میں اس نے گیتا کو ایک دیوی بنا دیا۔ پہلے پہل عورتیں نئے زمانے کی اس پڑھی لکھی "دیوی" کے درشن کو آئیں۔ پھر کچھ شوق پیدا ہوا۔ ساتھ ہی "ماشٹرنی" کی من موہنی باتوں نے انھیں موہ لیا اور اس طرح اکثر کو پڑھنے اور کچھ لکھنے کی چاٹ لگ گئی۔

خالدہ اوتار ادل وجان سے گیتا کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ گیتا انھیں اچھی خاصی ٹریننگ دے رہی تھی۔ ساتھ ہی خود ان کو بھی پڑھاتی اور نئے نئے کام سکھاتی تھی۔ وہ دونوں بھی جو گیتا کہتی بے چون وچرا مان لیتیں۔ گیتا ان کی آئیڈیل بن چکی تھی لیکن تا کو ان کاموں کا کچھ زیادہ شوق نہ تھا۔ ان گنوارنوں کے ساتھ سر مارنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ گیتا کے بہت اصرار پر اس نے کچھ لڑکیوں کو بننا اور کاڑھنا سکھانے کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا مگر اکثر اسے بھی گول کر جاتی۔ نانی کو گیتا کی یہ دلچسپیاں کانی آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ انھوں نے سوچا تھا کہ بے داموں کی ایک لونڈی گھر میں آ جائے گی۔ دنیا بھر کے کام کرے گی۔ دل بہلائے گی، اور اُلٹا احسان انہی پر ہوگا۔ مگر یہاں تو دن بھر گاؤں والیاں چھاتی پر سوار رہنے لگیں اور اس کے اشاروں پر چلنے کو تیار۔ ایسا لگتا انھیں بعض وقت کہ گھر پر ان کی نہیں گیتا کی حکومت ہے۔

سیتا دیوی کا مزاج اب تک گیتا کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ کبھی اتنی مہربان، اتنی پُر محبت کہ گیتا کو لگتا اس کی ماں ہیں جیسے۔ کبھی اتنی بیزار، اتنی بیگانہ جیسے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ کبھی غصے میں آ جاتیں تو اتنا چیختیں اور ڈانٹتیں کہ گیتا بڑی مشکل سے ضبط کر پاتی۔ پھر بھی اسے ان سے ہمدردی اور ایک قسم کا لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ وہ انھیں نفسی مریض سمجھتی اور کوشش کرتی کہ ان کو خوش رکھے۔

ٹھاکر سندر سنگھ البتہ اسے بہت چاہنے لگے تھے۔ ابتدا میں وہ صرف اس بے اعتنائی کی تلافی کرنا چاہتے تھے جو انھوں نے گیتا کی ماں کے مرنے کے بعد برتی تھی۔

مگر جلدی ہی ماموں بھانجی میں دوستی ہوگئی۔ ان کی انگریزی کی تعلیم کم مگر اردو فارسی پر اچھی نظر تھی اور گیتا کو اردو ادب اور شاعری سے عشق تھا۔ اس کے باپ اردو کے بڑے اچھے شاعر تھے اور بیٹی کے دل میں اپنی زبان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ پہلے سندر سنگھ بہت کم گھر میں آتے اور تھوڑی ہی دیر بعد باہر بھاگ جاتے تھے۔ مگر اب وہ گھنٹوں بیٹھے لڑکیوں سے ادبی اور علمی گفتگو کرتے رہتے یا پھر ان کے مرکز، اپنے اسکول اور گاؤں کے سدھار کی باتیں ہوتیں۔ بڑے ٹھاکر کو گھر کی یہ روش سخت ناپسند تھی مگر کم گو آدمی تھے زیادہ تر باہر ہی رہتے۔ بس وہ اور ابن میاں دو ہم خیال تھے اور دونوں میں روزانہ اس مسئلے پر باتیں ہوا کرتیں۔ کہ کملا نگر میں یہ کیسی ہوا چلی ہے؟ اور ان بدعتوں کا انجام کیا ہوگا؟ اور یہ نئی لڑکی تو دونوں بڈھوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

خالدہ کے ساتھ گیتا کی، اس کے گھر بھر سے دوستی ہوگئی تھی۔ بڑی اماں سے خوب گھٹ گھٹ، باتیں ہوتیں۔ سکینہ اس سے اردو کی کتابیں لیکر پڑھا کرتیں اور سلائی کٹائی میں مشورہ لیتیں اور اسے کھانا پکانا سکھاتی تھیں۔ صدیق حسن بھی بہت خصوصیت کرتے تھے۔ ماموں کے گھر میں تو ہمیشہ ہنگامہ ہی رہا کرتا تھا، اس لئے اسے جب سکون کی خواہش ہوتی، خالدہ کے ہاں چلی آتی اور جب تک جی چاہتا اکیلی بیٹھی خاموشی سے لکھا پڑھا کرتی۔ اور کوئی اس میں خلل انداز نہ ہوتا۔ ہاں جب کام کر چکتی تو سب مل کر باتیں کرتے یا کوئی کھیل کھیلتے۔ کلو اس سے بہت مانوس ہوگئی تھی اور اسکول سے آکر گیتا کے ارد گرد گھوما کرتی تھی۔ ابن میاں کی اب تک گیتا نے محض جھلک دیکھی تھی، وہ اس سے بہت بھڑکتے تھے اور اگر کبھی ان کے آنے کے وقت گیتا گھر میں موجود ہوتی تو وہ اس طرح پلٹ کر بھاگتے کہ سب کو ہنسی آجاتی۔ ان کی باتیں سن سن کر گیتا انھیں کوئی عجیب و غریب مخلوق سمجھنے لگی تھی۔

اس کی سب سے گہری دوستی ساجو سے تھی۔ اپنایت اور خلوص کا جو احساس اسے ساجو سے مل کر ہوتا وہ اور کسی سے نہ ہو سکا تھا۔

ساجو جمن کی بہو اور شبراتی کی بیوی تھی۔ ان کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس کی پیداوار پر کسی طرح اتنے بڑے کنبے کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ اس لئے گھر میں بھینس پال رکھی تھی۔ اپنے ہاں کام نہ ہوتا تو باپ بیٹے دوسروں کے کھیتوں پر مزدوری بھی کرتے اور ساجو بھی اپنے گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ کام میاں کے یا ٹھاکر کے ہاں کر کے سہارا لگا دیتی تھی۔ ساجو عمر میں گیتا سے تین چار سال ہی بڑی ہوگی، مگر چار بچوں کی ماں بن چکی تھی جس میں سے ایک اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں جب وہ پانی پت سے کملا نگر بیاہ کر آئی تو اس "تالیم یافتہ" بہو کو دیکھنے سارا گاؤں اُمنڈ آیا تھا، اس لئے کہ اس نے پانچویں جماعت تک حالی مسلم گرلز اسکول میں پڑھا تھا اور کملا نگر میں عورت کا کیا ذکر، کسی مرد نے بھی اتنی اونچی ڈگری نہ لی تھی۔ ساجو کو اپنی اہمیت، اپنی اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی کا پورا احساس تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے "رفیقِ حیات" کا کیا تصوّر تھا؟ یہ بات کئی بار اس نے گیتا کو بتائی تھی۔

"گیتا بی ـــ میں سوچوں تھی میرا میاں بڑا جنٹلمین ہوگا۔ کسی اسکول کا ماسٹر۔ وہ کوٹ پتلون پہنے، لمبے لمبے بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالے سگریٹ کا دھواں اڑاتا ہوا ـــ اور میں ـــ میں بھی ساڑھی پہنوں گی، ٹھاٹ سے رہوں گی۔ جیسے ہمارے اسکول کی استانیاں تھیں ـــ مگر ـــ"

وہ ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس "مگر" کو ادا کرتی اور پھر بتاتی کہ قسمت نے اسے کملا نگر لا پھینکا۔ ٹھیٹ گنوار جاہل دیہاتی شبراتی سے اس کا جوڑ ملایا جو موٹے کھدر کی میلی بنڈی پہن کر اور چارخانے کی چھوٹی سی دھوتی

باندھ کر ننگے سر، ننگے پیر سارے دن چلچلاتی دھوپ، بارش اور پالے میں کھیت میں جُتا رہتا ہے، جو ساجو کو سوسی کی شلوار اور گاڑھے کی چادر پہننے کو دیتا ہے۔ سال میں دو جوڑے بھی مشکل سے بن پاتے ہیں۔ اس پر بھی ساس تعلیم اور فیشن کے تانے دے دے کر کھائے جاتی ہے اور سارا گاؤں الگ نکو بنائے رکھتا ہے۔ کوئی بات کہی اور تعلیم یافتہ ہونے کا تانا موجود ہے۔ ایک بار جانے شبراتی کے دل میں کیا آئی کہ اس کے لئے نقلی ریشم کی ایک لال سبز ساڑھی خرید لایا۔ کنجوس کی دولت کی طرح ساجو اسے سنبھال کر رکھتی اور ساس سے چھپ کر کبھی کبھار پہن لیتی ہے۔

بڑی سادگی اور روانی سے وہ گیتا کو اس وقت کی کیفیت سناتی۔ "گیتا بی۔ پہلے تو میں بہت روئی پیٹی۔ کئی وقت کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ ان سے بات نہ کی۔ منی کے باوا کو دیکھ کر مجھے ایسا غصہ آتا کہ بس کیا کہوں — اسے ہاتھ ہی نہ لگانے دیا۔ پہلے اس نے خوشامد درآمد کی، پھر چیخا پیٹا — اور ایک دن تو موئے نے مجھے مارا بھی — پر میں کیا ایسی نرم چارا تھی کہ اس سے ڈر جاتی؟ وہ مجھے اس وقت بہت ہی برا لگے تھا۔ گنوار۔ اجڈ۔ کپڑوں میں سے بو آوے تھی۔ بیڑی کی بو سے مجھے آوے ابکائی، اور اس کے ہاتھ میں جب دیکھو موئی بیڑی موجود — مگر — پھر — جانے کیسے — مجھے اس پر دیا آنے لگی — پھر دھیرے دھیرے وہ اچھا بھی لگنے لگا۔ دیکھنے سننے میں کچھ برا بھی نہیں خاصا سجیلا ہے۔ کوٹ پتلون پہنا دو تو پورا صاحب لگے گا۔ ایسی بڑی بڑی آنکھیں ہیں اس کی گیتا بی — وہ جب پریم سے میری اور تاکے ہے تو — بس اب تمھیں کیا بتاؤں — تم کنواری بالی کیا سمجھو گی —"

گیتا کھل کھلا کر ہنس پڑتی۔ "یوں کہو آخر سمجھوتا ہو گیا۔"

"کیا کرتی۔ کرنا ہی پڑا۔ پھر بےچارا گنوار اور جاہل سہی۔ ہے بڑا محبت والا۔ دیالو۔ اور سیدھا، ایسا جیسے گائے ہو۔ غصہ مجھے اس پر نہیں اس اُجڑے گاؤں پر آوے ہے جہاں اس کے کارن رہنا پڑا۔ میں نے کتنا چاہا کہ وہ کسی شہر میں چل کر رہے۔ مگر اسے تو اپنا گاؤں، اپنی زمین جان سے زیادہ پیاری ہے۔ وہ ٹھہرا پکا کسان اور میں گیتا بی شہر کی چھوکری۔"

حالانکہ یہ "شہر کی چھوکری" اتنی سیدھی سادی پرخلوص پکی دیہاتن تھی کہ خود کملانگر میں اس کی سی ملنا دشوار تھی۔ گیتا مسکراتی۔ "پر اب تو ساجو تم پکی دیہاتن بن گئی ہو۔ اچھا سچ سچ بتاؤ اب تو تمھیں شبراتی سے پریم ہے نا؟"

ساجو شرما کر کہتی "چل ہٹ" اور پھر دوپٹے میں مُنھ چھپا کر کھل کھل ہنستی اور کہتی۔ "نا، بی۔ میں پریم وریم نہ کروں۔ بنا پریم ہی کے یہ نگوڑے اتنے سارے بچے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ لو اگر کہیں پریم وریم ہو جائے تو جانے....؟"

گیتا گھبرا کر بات بدل دیتی۔ "ساجو دیدی کیا یہ سچ ہے کہ شبراتی تمھیں مارتا ہے؟ تم تو کہتی ہو وہ تمھیں بہت چاہتا ہے، پھر بھی....؟"

ساجو کے چہرے پہ ایک ہلکا سا یہ آیا اور گزر گیا۔ کچھ دیر چپ رہی پھر اس کے موٹے رسیلے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایسا کوئی روز روز تو ہووے نہیں ہے گیتا بی۔ کبھی کبھار۔ جب میں۔ جب میں اس کا کہنا نہ مانوں۔ تو پھر وہ جھنجلا کر مارتے ہے۔ پر یہ مار بھی تو پیار ہی کے کارن۔"

گیتا خفا ہو کر کہتی۔ "واہ۔ بڑا پیار۔ تم کیسے یہ بےعزتی سہارتی ہو، اس کی یہ مجال کہ تم پہ ہاتھ اٹھائے؟"

ساجو کھل کھلا کر ہنس پڑتی ۔" کتنی بھولی ہے میری بھینا ۔ کچھ نہیں سمجھتی ۔ اری اس مار میں جو مزا ہے ۔۔ وہ ابھی کیسے جان سکو ہو ۔۔ اور پھر برداشت کون کرے ہے ۔ وہ ایک تھپڑ مارے ہے تو میں بیس کوسنے گالیاں دے ل ہوں اور سو بار ناک رگڑوا کر، ہاتھ جڑوا کر موئے کو پاس پھٹکنے دوں ہوں ۔۔ اور کیا ۔"

گیتا کھسیا کر، جھنجلا کر، شرما کر کہتی ۔" اُنھ بند کرو یہ اپنی وحشیانہ پریم کتھا ۔"

تو ساجو اس کی گردن میں باہیں ڈال کر پیار بھری نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگتی ۔" جب اس چاند سے مکھڑے کا چاہنے والا آوے گا ۔۔ تب پوچھوں گی تم سے !"

ساجو ہنستی ، بل کھاتی چلی جاتی اور گیتا حیرت سے اسے دیکھتی رہتی ۔ اتنی غریب ، اتنی کٹھنائیوں میں پھنسی ساجو کیسے اتنی خوش ، ہنسوڑ اور مطمئن ہے ! کیا راز ہے اس میں ؟ ساجو سے اس کی محبت روز بروز گہری ہوتی جاتی تھی ۔ اور اس محبت نے گھر بھر کو ساجو کا مخالف بنا دیا تھا ۔ تارا ۔ لتا ۔ سیتا دیوی اور دادی سبھی اس سے خار کھاتی تھیں ۔ لیکن ساجو اسکول کے کاموں میں گیتا کا داہنا ہاتھ بنی ہوئی تھی ۔ گھیر گھیر کر عورتوں اور لڑکیوں کو وہی لاتی تھی ۔ اسکول کے دس کام چٹ پٹ کر ڈالتی ۔ خود گیتا سے اردو ہندی پڑھتی اور خالدہ اور تارا کے ساتھ گاؤں کی عورتوں کو قاعدہ پڑھانے کی کوشش کرتی ۔ کتنے عرصے بعد ساجو کو ان گاؤں والیوں پر اپنی برتری ثابت کرنے کا موقع ملا تھا ۔ گیتا نے اس کے اس جذبے کو اور سہارا دیا ۔ اور رفتہ رفتہ اسے یہ یقین دلایا کہ بڑائی اور بزرگی پانے کا ایک ہی راستہ ہے ۔ سیوا اور پریم کا راستہ ۔ ساجو جس تیزی سے ذہنی ترقی کر رہی تھی اور جس خوبی سے نئے خیالات کو قبول کرنے

کی اس میں صلاحیت بھی اس نے گیتا کو حیران کر دیا تھا۔
مگر ساجو کے گھر میں اس نے خاصا محاذ قائم کر دیا تھا۔ ساس کی گالیاں اور کوسنے اور بڑھ گئے تھے اور شبراتی کا غصہ ناک پر رہنے لگا تھا۔ ماں بیٹے دونوں کو اس کی یہ "آوارگی" سخت ناگوار تھی۔ اور گیتا سے تو شبراتی کو رقابت ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر ٹھاکر مندر سنگھ کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ساجو کو ان کے گھر جانے ہی نہ دیتا۔ روز گھر میں ہنگامہ ہوتا اور ساجو اپنی مجروح خودداری کو سینے سے لگا کر چپ چاپ آنسو بہا لیتی مگر گیتا کو کچھ نہ بتاتی تھی۔ اور یہ وہ جانتی تھی کہ شبراتی کی اتنی مجال نہیں کہ وہ گاؤں کے سرپنچ اور زمیندار سے بیر مول لے سکے۔ اور خود ساجو ہی کب اس کے قابو میں آنے والی ہے بھلا؟

اگرچہ گیتا کا جی اپنے کام میں لگ گیا تھا مگر اس تنگ ماحول میں بعض وقت اسے اپنا دم سا گھٹتا محسوس ہوتا۔ صفیہ بیگم اور حبیب میاں کی یاد دل سے کسی طرح نہ جاتی تھی۔ ان کی پر مسرت اور مطمئن زندگی سے اس کی محروم زندگی کو جیسے غذا ملتی تھی اور ان کی محبت اور دلداری اس کے دکھے دل پر مرہم کا کام دیتی تھی۔ ان رشتے داروں کی محبت اور خصوصیت میں اسے وہ اپنایت وہ پیار نظر نہ آتا جو ان دونوں کی ڈانٹ ڈپٹ میں بھی ملتا تھا۔ پھر سکندر پور میں دس طرح کی دلچسپیاں تھیں۔ مرکزوں میں جلسے ہوتے۔ ڈرامے کئے جاتے۔ اچھے اچھے فلم دیکھنے جا سکتی تھی۔ اپنا کالج تھا اس میں کلاس فیلو لڑکیوں اور استانیوں سے اچھی خاصی دوستی تھی۔ اور یہاں لے دے کے بس ایک خالدہ کا گھر جس میں اپنے ماموں کے یہاں سے بھی زیادہ اسے قدامت پرستی نظر آتی۔ بعض وقت اس کا جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سکندر پور چلی جائے اور پھر اپنے "میاں"

اور "آپا" کے سایۂ عاطفت میں اپنے لئے کوئی راستہ سوچے۔ مگر حبیب میاں
ناراض ہوں گے؟ ان کا حکم ماننا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یوں بھی اس کی خودداری
اب یہ اجازت نہ دیتی تھی کہ ان پر جا کر پڑے۔ مانا کہ وہ لوگ اسے نرجس کی
طرح سمجھتے ہیں مگر وہ خود ایسے کہاں کے رئیس ہیں! تھوڑی سی آمدنی میں جانے
کتنے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ آخر کہاں تک اس کا بار اٹھائیں گے۔ وہ
چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو، مگر کیسے؟ اس کے لئے ملازمت
تو حبیب میاں ہی ڈھونڈ سکتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسے کملا نگر میں رہ کر سیوا
کا کام کرنا چاہیئے وہ بچارے کیا جانیں کہ یہاں کیا کیا مشکلات، کیا کیا رکاوٹیں
کیا کیا ہنگامے ہیں۔ ان بے حس، بے جان، اپنے خول میں بند لوگوں کے
ساتھ کام کرنا کتنا کٹھن ہے۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے کہے؟ ہائے
بابا آپ مجھے چھوڑ کر سدھار گئے، آپا جی بھی چل بسیں --- اور مجھے جانے کس سے
منسوب کر گئے --- ایک اور انجانی مصیبت! اف یہ بنجر ویران زندگی --- یہ
کٹھنائیاں، یہ تنہائی، بے کیفی --- اداسی!! کبھی کبھی تو گیتا پوری رات
اسی ادھیڑ بن میں گزار دیتی اور آنکھوں سے ستارے ٹوٹتے اور تکئے میں جذب
ہوتے رہتے جن کو دیکھنے والے صرف آسمان پر چمکتے ہوئے تارے ہی ہوتے
سکتے۔ اور کبھی کبھی ان ٹوٹتے تاروں کو دیکھنے کے لئے خود آسمان کے
تارے ٹوٹنے لگتے۔

۹

برسات کے مہینے ایک کے بعد ایک نکلے چلے جا رہے تھے مگر اب تک اچھی

بارش نہ ہوئی تھی۔ پیاسی زمین ہر وقت ملتجی نظروں سے آسمان کی طرف تکا کرتی اور
زبان حال سے خوشامد کرتی رہتی۔ آسمان پہ بادل آتے، اُمس بڑھتی، حبس دم
گھونٹنے لگتا۔۔۔ امید ہوتی اب برسا۔ اب برسا۔۔ مگر پھر تیز ہوا کے جھکڑ چلتے
اور ہزاروں آدمیوں کی امید و تمنا کو اڑا کر کسی اور خوش نصیب بستی کی طرف لیجاتے۔
گاؤں والے ریڈیو پہ سُنتے کہ دیس میں فلاں جگہ بارش نے قیامت مچا رکھی ہے
فلاں جگہ سیلاب آگیا ہے، چھوٹی ندیوں تک میں باڑھ آگئی ہے تو وہ حیران
رہ جاتے۔ اپنے ہاں سوکھا پڑ رہا ہے اور دوسری جگہوں پہ اتنا مینہہ!! خدا کی
باتیں خدا ہی جانے۔

کملا نگر میں بھی بارش کی کمی تھی۔ کبھی کبھار ایک آدھ چھینٹا پڑ جاتا تو عید کی
سی خوشی منائی جاتی۔ آج بھی مطلع ابر آلود تھا۔ اُمس بڑھ گئی تھی۔ ہوا بند تھی،
آثار کہہ رہے تھے کہ آج ضرور برسے گا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گیتا خالدہ کے یہاں دالان میں ایک چارپائی پر پاؤں
لٹکائے بیٹھی صفیہ بیگم کو خط لکھ رہی تھی۔ وہ کچھ لکھتی پھر کاٹ دیتی۔ پھر لکھتی
پھر کاٹ دیتی۔ آج کل دل زیادہ ہی اُچاٹ تھا۔ گاؤں میں بیاہ براتوں کا زور
تھا۔ ابھی لگن نکل آئی تھی چنانچہ ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی تقریب ہو رہی تھی
بیاہ، بارات، گونا، بداگی، لگن، منگنی کچھ نہ کچھ روز ہوتا رہتا۔ ظاہر ہے کہ
گاؤں بھر کی عورتوں اور لڑکیوں کا سارا شوق اور جوش آج کل ان مبارک
تقریبوں پہ صرف ہو رہا تھا۔ آٹھ نو برس کی بچیوں سے لے کر ساٹھ پینسٹھ برس کے
دھاجو بڈھوں تک کی شادیاں رچ رہی تھیں۔ اصول و قانون ہوں گے پڑھے
لکھے اور شہر والوں کے لئے۔ دیہاتوں میں تو اب بھی وہی پرانی رسمیں، قدیم رواج
چلے آرہے ہیں کم عمر بچوں کا گڑیوں کی طرح بیاہ کرنا اور چھوٹی بچیوں کو پیرِ فرتوت

سے بیاہ دینا کوئی انوکھی چیز نہیں یہاں۔ یہی سب باتیں گیتا بیٹھی صفیہ بیگم کو لکھ رہی تھی۔

گاؤں سے ڈھول اور گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آج گیتا کی گیارہ سالہ شاگرد سُندریا کی بارات آئی تھی۔ گیتا نے لاکھ لاکھ اس کی بیوہ ماں اور بڈھی دادی کو سمجھایا کہ ابھی اس کی عمر بیاہ شادی کی نہیں مگر انھوں نے اس کی بات پر ذرا بھی دھیان نہ دیا بلکہ اُلٹی ان "نئے پھیشن کی پڑھی لکھیوں" کے بڑی عمر تک بیٹھے رہنے اور بیاہ نہ ہوسکنے پر پھبتیاں کسیں۔ یوں بھی گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اکثر اسے ترحم کی نظروں سے دیکھتیں اور کہتیں ان بچاریوں کو بر جُڑتا نہیں اس لئے دوسروں کا بیاہ ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ بدگمانی ایسی تھی جس پر گیتا تلملا کر رہ گئی۔ لیکن ساجو اس کی طرفداری میں ہر ایک سے لڑنے کے لئے سینہ سپر رہتی تھی۔ گیتا بڑی تلخی سے لکھ رہی تھی۔ "آپا جہاں ایسا ماحول، ایسے خیالات، اتنی تنگ نظری اور بے خبری ہو وہاں آدمی کر کیا سکتا ہے؟ میں میاں کے حکم سے مجبور یہاں پڑی تو ہوں مگر سوا تضیع اوقات کے اور کیا کروں گی؟"

تارا اور خالدہ دیوار پر چڑھی سُندریا کی بارات کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ زینب بی حسب عادت کوٹھڑی میں گھسی سڑ بڑ کر رہی تھیں اور سکینہ چولہے پر توا چڑھائے باپ کے انتظار میں بیٹھی تھیں کہ کب وہ آئیں، اور وہ گرم روٹی ڈالیں۔

ابن میاں ایک بجے سے کچھ پہلے ہی آج اندر چلے آئے تھے۔ باہر اس قدر شور تھا کہ وہ پڑھ نہ سکتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی پتلی سی پرانی جلد کی کتاب تھی اور وہ سر جھکائے کوئی شعر گنگناتے ڈیوڑھی سے صحن میں آئے تو لڑکیاں انھیں دیکھ کر دھم دھم دیوار پر سے کود پڑیں۔ ان کو گاتے دیکھ کر تارا

کو ہنسی آگئی اور اس کو ہنستے دیکھ کر خالدہ کو بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ اب یہ منظر کہ دونوں بیچ صحن میں کھڑی ہیں، منہ میں دوپٹہ ٹھنسا ہوا، آنکھوں سے آنسو جاری، چہرہ سرخ مگر ہنسی سے بیقرار۔ اور شیر کا سامنا....

"کیوں؟ ہنس کیوں رہی ہو؟ کس پہ ہنس رہی ہو؟" ابن میاں کی دہاڑ پورے گھر میں گونجی۔ خالدہ کی ہنسی ایک دم غائب ہوگئی۔ چہرہ سفید پڑگیا۔ تارا لپک کر گیتا کی پیٹھ کے پیچھے جا چھپی۔

"نالائق، بے وقوف، احمق، گدھی، ہنستی ہے۔ شعر کو سمجھتی نہیں اور ہنستی ہے! جانتی ہے شعر کیا ہوتا ہے؟ وہ جنگل والا شیر نہیں — یہ — یہ کتاب کا شعر — غزل کا شعر — اونہہ — کن کوڑھ مغزوں سے پالا پڑا ہے۔" اور اس کے بعد جو موٹی گالی ان کے منھ سے نکلی اس نے گھر بھر کو لرزا دیا۔

"بول — کیا معنی ہیں اس شعر کے؟ بتا — جلد مطلب بتا اس کا" — اور ابن میاں نے اپنی گونج دار آواز میں لحن کے ساتھ پڑھا ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے　　　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

خالدہ مطلب کیا بتاتی اور بھی سہم گئی۔ ابن میاں کا غصہ اور بڑھا۔ "ہنسنا آتا ہے، بولنا نہیں آتا؟ کیوں؟" مگر خالدہ کو روتا دیکھ کر وہ گھبرا گئے "اے رے رے، روتی کیوں ہے؟ رونے کی کیا بات ہے؟ درد کا یہ شعر اتنا مشکل تو نہیں کہ تو رونے لگے — احمق چھوکری —" اب لہجے میں تیزی کی جگہ تمسخر پیدا ہو چلا تھا۔

زینب بی اتنی دیر سے تیل کڑھائی ہو رہی تھیں۔ "ابن میاں میں کہتی ہوں سٹھیا تو پہلے ہی سے گئے تھے اب تو بالکل سترے بہترے ہو کر عقل کھو بیٹھے ہو اور نہیں تو اب بچوں سے بھی الجھنے لگے۔ آئے بڑے وہاں سے شعر پڑھنے والے۔ نوج! خدا نہ کرے۔ میری کنواری لڑکی ان بے ہودہ شعروں کا مطلب کہنے، واہ۔"

ابن میاں سے گھر بھر میں بس وہی تو نہیں ڈرتی تھیں۔ ابن میاں ان کی باتیں سن کر اور بھی لال پیلے ہو گئے۔ "بیہودہ شعر! بیہودہ؟ میر درد جیسے ولی اللہ کو تم بیہودہ گو کہتی ہو؟ تم خود بیہودہ ہو — جاہل —" اور ساتھ ہی ان کی نظر اٹھی تو انھوں نے دیکھا گیتا تیوری چڑھائے عجیب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیوں صاحبزادی؟ تم بھی خالدہ کی طرح جاہل ہو یا اس شعر کا مطلب سمجھتی ہو؟"

گیتا نے اپنی کنول جیسی شفاف آنکھیں ان کی بوڑھی آنکھوں سے بے دھڑک ملائیں۔ "یہ تو بہت سادہ شعر ہے۔ اس کا مطلب تو ہر کوئی سمجھ اور بتا سکتا ہے خالدہ کو تو آپ نے سہما دیا اس لئے وہ نہ بتا سکی۔"

"یعنی — یعنی کہ — تمھارا مطلب ہے کہ تم شعر — شعر سمجھتی ہو — یعنی کہ... اردو جانتی ہو؟"

"جی ہاں — جانتی ہوں۔"

ابن میاں کو یقین نہیں آیا۔ "اچھا تو ذرا اس شعر کا مطلب تو بتاؤ —

"ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اس نے راہ رو رشک کی جا ہے سفر پہ وانہ"

گیتا نے بڑی روانی اور صفائی سے شعر کا مطلب بتا دیا۔ ابن میاں کا چہرہ کھل اٹھا۔

"شاباش۔ شاباش۔ سمجھ دار چھوکری ہے۔ واہ۔ شعر سمجھتی ہے۔ صاحب ذوق — درد کے شعر! خوب بہت خوب۔" اور وہیں گیتا کے قریب تخت پر بیٹھ گئے۔

گیتا کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لو بیٹی یہ دیوان — اور ذرا مجھے سناؤ تو کوئی درد کی پھڑکتی ہوئی غزل۔ ہائے کیا عارفانہ کلام ہوتا ہے اس صوفی منش انسان کا۔"

گیتا گھبرا گئی، مگر ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے درد کا دیوان لے لیا۔ پرانی

دیمک لگی جلد، روگرٹی زرد کاغذ پر چھپا ہوا جس کو چھوتے ڈر لگے کہ اب پھٹ کر ہاتھ میں آجائے گا۔

چند لمحے وہ تذبذب میں بیٹھی رہی۔ پھر کتاب کھولی۔ دیکھتے دیکھتے دیوان کے صفحات میں سے اسے جانے پہچانے چہرے جھانکتے ہوئے نظر آنے لگے۔

ابن میاں چند لمحے غور سے اسے دیکھتے رہے۔ "پڑھو ــــ کچھ پڑھو نا بیٹی ــــ"

گیتا نے ورق پلٹنے شروع کئے ــــ یہاں تک کہ دیوان کے آخری صفحات پر پہنچ گئی ــــ درد کی مشہور غزل سامنے تھی ؎

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے   کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

بہت آہستہ سے گیتا نے یہ شعر پڑھا۔ آواز اتنی مدھم کہ خود اسے بھی اپنی آواز شاید سنائی نہ دے رہی تھی۔ ابن میاں، خالدہ، تارا سب شوق سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زینب کی تیوری ابھی تک چڑھی ہوئی تھی اور سکینہ کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے تھے۔ گیتا نے شروع ہی کیا تھا کہ صدیق حسن اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک گورا لمبا نوجوان بھی تھا۔ دونوں ٹھٹھک گئے۔ گیتا کی سریلی آواز جس میں درد کی لہک تھی، دھیرے دھیرے بلند ہوتی جا رہی تھی ؎

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے	کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا	ایک دم آئے اِدھر اُدھر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں	چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
جوں شرارِ ہستیٔ بے بود یاں	بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

گیتا کی بے خودی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بھول گئی کہ وہ کملا نگم کے قفس میں بند ہے۔ بھول گئی کہ اس کے پیارے اس سے بہت دور جا چکے ہیں۔ موت اور زندگی کی ناقابلِ عبور خلیج ان کے درمیان حائل ہے۔۔ اُسے محسوس ہوا کہ سامنے بابا اپنی بیاض ہاتھ میں لئے فکرِ سخن میں محو ہیں۔ پہلو میں ماں بیٹھی سوئٹر بن رہی ہیں۔ گیتا کے گانے کی آواز پر ان کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں۔ بابا کے چہرے پر فخر ہے، پیار ہے، تحسین ہے۔ ماں کی آنکھوں میں ممتا کی دمک اور آرزوؤں کی جوت جگمگا رہی ہو۔ بابا اپنے محبوب شاعر کے ہر ہر شعر پر جھوم رہے ہیں۔ آنکھوں میں درد کے آنسو لئے۔

وہ بے خودی کے عالم میں گا رہی تھی۔ آنکھیں بند، ہاتھ میں کچھ ایسی جنبش جیسے کسی ساز پر چل رہا ہو اور دوسرا ہاتھ دل کو تھامے ہوئے ؎

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا سب   تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

سارا گھر محو تھا۔ صدیق حسن آ کر بیٹھ گئے تھے۔ نووارد نوجوان صحن میں سحر زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔ زینب بی کا پوپلا منھ کھلا ہوا تھا اور ان کی پن کٹی کی ننھی سی موسلی بجائے پن کٹی کے چبوترے کی کچی زمین پر پڑ رہی تھی۔ سکینہ کھانسنا بھول گئی تھیں۔ توا تپ کر دھواں دینے لگا تھا۔ مگر وہ اس سے بے خبر بیٹھی تھیں۔ آنکھوں کی حسرت کچھ اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ خالدہ اور تارا بھوچکی بیٹھی تھیں۔ گیتا جسے انھوں نے کبھی گنگناتے بھی نہ سنا تھا اتنا اچھا گاتی ہے۔ وہ تو ان کے فلمی گانوں کا بے طرح مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ اس وقت "فلمی گانے سے بھی اچھا گا رہی ہے۔" ابن میاں پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔

گیتا گائے جا رہی تھی ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب   کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

آخری شعر نے گیتا کو ماضی کی حسین جنت سے حال کی سخت، بے درد دُنیا میں لا پھینکا۔ آواز تھرائی، شعر ٹوٹا، ہچکیوں نے گلا گھونٹا، سسکیاں اُبھریں، بند آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ٹوٹی مالا کے دانوں کی طرح لڑھک لڑھک کر اس کے دامن میں مُنھ چھپانے لگے۔ عین اسی وقت اس کے ساتھ ساتھ آسمان نے بھی رونا شروع کر دیا۔ پانی کی ویسی ہی موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ خشک زمین پہ گرنے لگیں۔

سب لوگ پریشان ہو گئے۔ تارا اور خالدہ بجائے گیتا کو چپ کرانے کے اس سے لپٹ کر خود بھی رونے لگیں۔ زینب بی اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر سمجھا رہی تھیں۔ سکینہ پانی کا کٹورا منھ سے لگا کر پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ صدیق حسین کسی سوچ میں معلوم ہوتے تھے اور ابن میاں کا عجیب حال تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اس بچی کو کلیجے سے لگا لیں۔ اتنی سی لڑکی اور ایسا ذوقِ شعر! تصوف اور بھگتی کا ایسا جذبہ جو بڑے بڑے صوفیوں پہ بھی کبھی کبھار ہی طاری ہوتا ہے۔ ان کیلئے یہ سمجھنا محال تھا کہ یہ بھگتی اور جذب کی کیفیت نہیں بلکہ ماضی کی درد انگیز یادیں ہیں جنھوں نے اسے بے حال کر دیا ہے۔

گیتا کو اس وقت کسی کی ہمدردی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ محبت بھرے الفاظ اس کے زخم کو کھرچ رہے تھے۔ وہ خاموشی چاہتی تھی، سکون چاہتی تھی۔ تصور اور تخیل کے لئے فرصت اور تنہائی چاہتی تھی جو اس ہنگامہ پرور ماحول میں عنقا تھا۔ اسے اتنے لوگوں کے سامنے بے قابو ہو جانا بہت ناگوار تھا۔ جیسے ہی طبیعت قابو میں آئی وہ چپ چاپ اُٹھ کر گھر جانے لگی تو صحن میں کھڑے ایک بے حس و حرکت نوجوان پہ نظر پڑی جو مینھ میں بھیگ کر شرابور ہو چکا تھا۔ گیتا

ہوش میں آچکی تھی مگر وہ ابھی تک مدہوش تھا۔ دم بھر کے لئے چار آنکھیں ملیں اور جھک گئیں۔

صدیق حسن نے چونک کر کہا۔ "ارے ندیم میاں تم ابھی تک وہاں بارش میں کھڑے ہو۔ اماں دیکھئے — یہ صفدر بھائی کا لڑکا ندیم آیا ہے اپنے اسکول میں ماسٹر بن کے۔"

ندیم آہستہ آہستہ دالان کی طرف بڑھا، زینب بی نے بڑھ کر گلے لگایا اور خالدہ کی نگاہیں چوری چوری اس وجیہہ نوجوان کو دیکھنے لگیں۔

ابن میاں بھی چونک پڑے۔ "میں کہتا ہوں آج تم سب کو ہو کیا گیا ہے۔ دو بج گئے اور اب تک مجھے کھانا نہیں ملا۔ اس گھر کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔"

سکینہ نے توے پر پھلکا ڈالنا شروع کیا اور خالدہ برتن لینے اندر چلی گئی۔

١٠

گرمی کی شدت میں کمی آگئی۔ امس نے دم توڑ دیا۔ گلابی جاڑوں کی آمد نے پھر سے زندگی میں اُمنگ اور رجحان پیدا کر دی۔ سانجھ سویرے کی خوشگوار خنکی اور دوپہر کی ہلکی ہلکی گرمی دونوں پُر لطف تھیں۔ اندر اور باہر چہل پہل نظر آتی تھی۔ کسان منھ اندھیرے ہل اور بیل لے کر کھیتوں پر چلے جاتے اور دن بھر ربیع کی فصل کے لئے زمین کو جوتنے، مٹی کو بھربھرا کرنے میں تندہی سے جُتے رہتے۔ برسات کے بعد زمین کافی نرم ہو گئی تھی، نئی فصل کیلئے

زمین تیار کرنے کا بہترین وقت یہی تھا۔ جیسے ہی زمین تیار ہو جائے، جو، چنا، مٹر، السی اور سرسوں وغیرہ بو دی جائے۔

اُدھر گھروں میں دیوالی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، پتائی اور سفیدی کی جا رہی تھی، کمہاروں کے ہاں ہزاروں دیئے، مٹی کے کھلونے، ہنڈیاں، قندیلیں وغیرہ بن رہی تھیں جو ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں۔ تیلی کی بھی بن آئی تھی۔ منوں تیل بک رہا تھا۔ ہر گھر والی روز حساب لگاتی کہ اب کی دیوالی پر کتنا تیل خرید اجائے کہ سارا گھر جگمگا اُٹھے۔ حلوائیوں نے ابھی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ دکانوں کو سجایا جا رہا تھا، کاغذ کے پھول، رنگین قندیلیں، ایکٹرسوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ لچھمی دیوی کی مورتیاں اور تصویریں بھی لگائی جا رہی تھیں۔ بیوپاریوں کے ہاں سال بھر کا حساب دن رات کیا جا رہا تھا۔ ایک ایک نئے پیسے کی غلطی نکالنے کے لئے کئی کئی آنے کا تیل چاہے جل جائے۔ مگر حساب جوں جوں ضرور ہونا چاہیئے۔ اس مثل کے آخری کرتے سے البتہ وہ ناواقفِ محض تھے۔ نئے بہی کھاتے تیار ہو رہے تھے اور لکشمی دیوی کی پوجا کی تیاریاں زور شور سے کی جا رہی تھیں۔ اُدھر جواری ابھی سے جوا کھیلنے میں جٹ گئے تھے۔ کتنے گھروں کے مرد برتن بھانڈے، بیوی کے کپڑے اور زیور تک اُٹھا لے گئے تھے۔ بیویاں روتی پیٹتیں، بُرا بھلا کہتیں، قسمت کو کوستیں اور صبر کر کے بیٹھ جاتیں۔ مرد دیوتا جو ٹھہرا۔ اس کے کاموں میں دخل کیسے دیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ تہوار جو نیک کردار شوہروں کی بیویوں کے لئے مسرت و شادمانی کا سندیسہ لے کر آتا ہے ان کے لئے غربت و مصیبت کے تحفے اور آنسوؤں کے ہار ہی لاتا تھا۔ ان کے جواری مرد گھر کا تنکا تنکا ہار ڈالتے اس امید پر کہ شاید اب کی بار جیت جائیں اور سب کسر پوری ہو جائے۔ بہت سے

گھروں سے رونے پیٹنے، مار دھاڑ، گالیوں اور کوسنوں کی خوش آئند آوازیں اکثر شام کے وقت ہی بلند ہوتی تھیں۔ چوروں نے بھی قسمت آزمائی کی مہم شروع کر دی تھی۔ روز ہی کسی نہ کسی گھر سے چور چور کا شور بلند ہوتا۔ کسی خوش نصیب کے ہاں وقت پر جاگ ہو جاتی، کسی بد قسمت کا سب کچھ چور ہوس کر لے جاتے۔

کملا نگر میں بھی یہ ساری چہل پہل، سارے ہنگامے، سارے جھگڑے برپا تھے۔ کسان کھیتوں کی سیوا اور عورتیں دیوالی کی تیاریوں میں انہمک تھیں۔ جواری اور چور اپنے کاروبار میں لگے تھے۔ گاؤں کے بنئے کی بن آئی تھی۔ ہر ایک کو کڑے سود پر دل کھول کر قرضہ دینے کا نیک کام اس شبھ تہوار پر کرنے کو وہ ہر وقت تیار نظر آتا تھا۔ بیوپاری حساب کتاب میں محو تھے اور کمہار اور حلوائی مٹی اور شکر کے کھلونوں کی تخلیق میں مگن۔ بچوں کے لئے ابھی سے عید آگئی تھی۔

کملا نگر کے بچوں کے اسکول میں اپنے نئے جیون کے ساتھ ساتھ جوش اور اُمنگ نظر آنے لگی تھی۔ دو مہینے پہلے جب ندیم نے اس کا چارج لیا تو عجب حال تھا۔ ایک ٹوٹے پھوٹے چھوٹے سے گھر میں پھٹی ٹاٹ، دو ٹوٹے بلیک بورڈ، ایک پرانی میز اور پاؤں ٹوٹی کرسی، ایک بد دل بد مزاج ماسٹر اور پچیس روتے بسورتے بچے جن کو ہر وقت ماسٹر کی مار اور گالی بھی کھانی پڑتی تھی اور دن رات اس کی خدمت بھی انجام دینی ہوتی تھی ندیم نے اس مختصر مدت میں ہی اپنی جان لڑا کر اس کی حالت بہت کچھ سدھار دی تھی۔ پہلا ماسٹر بدل گیا تھا۔ ندیم کے ساتھ کام کرنے کیلئے جو نیا ماسٹر آیا تھا وہ بہت مستعد اور پر خلوص نوجوان تھا۔ روپیہ کچھ گورنمنٹ سے منظور ہوا،

کچھ حبیب میاں نے بھیجا، کچھ بھاگ دوڑ کر کے چندہ کیا اور مدرسے کیلئے
ضروری سامان فراہم کیا گیا۔ مکان کی مرمت تو ندیم کے ساتھ اسکول کے
بچوں اور ان کے بزرگوں نے مل کر خود ہی کر ڈالی۔ طالب علم بڑھانے کی
مہم بھی جاری تھی۔ اسکول میں اب پچاس کے لگ بھگ بچے آتے تھے
جن میں نو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی تھیں۔ تیسری جماعت میں صرف کلو عرف
موتی بیگم تھی جو روز "ماساب" کا ہاتھ پکڑ کر اسکول آتی۔ وہ اپنے سب
ہم سن بچوں کی لیڈر بن گئی تھی۔

ندیم اور سوشل سروس کے انچارج انوپم میں جان پہچان تو پہلے ہی
سے تھی مگر اب ہر وقت کے ساتھ نے زیادہ بے تکلفی اور خلوص پیدا کر دیا
تھا۔ یہ سبھی کارکن جانتے تھے کہ حبیب میاں انوپم کو بہت چاہتے اور "چڑھاتے"
ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اس خاموش، دبلے پتلے، سیدھے سادے نوجوان
کے دل میں خدمت کا اتنا گہرا جذبہ، ان تھک محنت کی ایسی قوت اور لوگوں
کو پرچانے کی وہ مقناطیسی طاقت ہے جو ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ سیوا اور
پریم کی جو آگ اس کے دل میں ہے وہ اس کی چنگاری دوسروں کے دلوں میں
بھی ڈال سکتا ہے۔ اور حبیب میاں کی تحسین اور قدر نے اسے اپنے ساتھیوں
میں کافی غیر مقبول بنا دیا تھا۔ ندیم بھی پہلے اس سے کھچا کھچا رہتا تھا، اور
گیتا کو بھی انوپم سے خواہ مخواہ کا رشک اور چشمک پیدا ہو گئی تھی۔ انوپم
ندیم سے پہلے کملا نگر آیا تھا اور تھوڑے دن ہی میں اس نے گاؤں والوں
سے اچھے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ اس نے سب کو جمع کر کے اپنے کام کے
مقاصد انہیں سمجھائے۔ ان سے مدد کی درخواست کی اور صرف اتنا ہی نہیں
ان میں سے جو کام کے لوگ نظر آئے ان کے ذمے مختلف کام کر دئے۔ وہ

کم بولتا تھا مگر جب بولتا تو اس کے انداز میں کچھ ایسی بات ہوتی جو دوسروں کو اس کے خلوص اور سچائی کا یقین دلا دیتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو صاف ظاہر تھی کہ وہ بجائے اپنی اہمیت جتانے، اپنی بڑائی کرنے کے لوگوں کے اعتماد اور احساسِ خودی کو اُبھارتا، ان کے ہاتھ سے کام کراتا اور خود جو بھی کرتا پس منظر میں رہ کر۔ اپنے کیے کا سہرا بھی وہ دوسروں کے سر باندھ دیتا پھر وہ دوسروں کے مسئلوں اور الجھنوں کو بالکل اپنا مسئلہ سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کرتا۔ دوسروں کے کام میں اسے اتنی دلچسپی، اتنی فکر، اتنی جدوجہد ہوتی تھی کہ خود اپنے کام میں کبھی نہیں ہوئی۔ لوگ اپنی مشکلوں کا بوجھ اس پر ڈال جاتے اور اب اسے ان لوگوں سے زیادہ اس کی چینک لگ جاتی کہ یہ کام کیسے ہو؟ یہی دو باتیں اسے ہر جگہ ہر دلعزیز بنا دیتی تھیں۔ کملا نگر میں بھی اس کے کئی ساتھی نکل آئے تھے جو دیہات سدھار کی مہم میں اس کے دل و جان سے شریک بن گئے تھے۔ شبراتی، ناتھولال اور کلوان میں سب سے نمایاں تھے۔ شام کو مدرسے میں بالغوں کے لئے کلاسیں لگتیں۔ دوپہر میں نوجوان کلب کھلتا اور صبح میں بچوں کا مدرسہ ہوتا۔ ایک ہندی اور ایک اردو کا اخبار بھی جاری ہو چکا تھا۔ دو تین قسم کے کھیل جیسے کیرم، تعلیمی تاش وغیرہ بھی منگا لئے گئے تھے۔ دوپہر کو نوجوان اسے پڑھوا کر سنتے اور شام کو بڑے بوڑھوں کو سنایا جاتا جو سر ہلا ہلا کر ان عجیب و غریب خبروں پر بڑے دلچسپ انداز میں اظہارِ رائے کیا کرتے۔ انوپم چاہتا تھا کہ ایک بیٹری کا ریڈیو بھی کہیں سے آ جاتا مگر فی الحال اس کی امید نہ تھی۔ کبھی کبھار ندیم صدیق حسن کا ریڈیو مانگ کر لے آتا تو دیہاتی پروگرام سننے کے لئے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کا ہی نہیں عورتوں تک کا مجمع ہو جاتا اور

بولتے گاتے باجے کو سب ہی لوگ بہت شوق سے سنتے۔
کملا نگر اسکول میں دیوالی کے تہوار کی تیاریاں بہت زور شور سے ہو رہی تھیں۔ سب شاگرد اور استاد اسکول کو سجانے اور سنوارنے میں لگے ہوئے تھے۔ ندیم اور انویم نے دیوالی پر ایک مزیدار ڈراما کرنے کی اسکیم بھی بنائی تھی جس میں گاؤں والے خود بھی حصہ لے سکیں اور جواریوں، چوروں اور بد معاشوں کو ٹھیک کو رِ مچائے اور وہ اس پوتر رات میں اپنی "دلچسپیاں" ترک کر کے اس میں شرکت کریں۔ کچھ گانے بجانے والوں کو اکٹھا کر کے نئے نئے گیت سکھائے۔ ایک چھوٹا سا ناٹک خود انویم نے تیار کیا اور اب روزانہ اس کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ اس کام میں بھی شبراتی انویم کا دستِ راست بن گیا تھا۔ شبراتی کو جانے کیسے، اب یہ لگن لگ گئی تھی کہ وہ پڑھ لکھ جائے۔ اس نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ ذرا سا فرصت کا وقت بھی ہوتا تو وہ کتاب لیکر انویم کے سر پر سوار ہو جاتا۔ ذہن کند تھا مگر بے حد محنتی ہونے اور نئے نئے شوق کی بدولت وہ خاصی تیزی سے ابتدائی مرحلے طے کر رہا تھا۔ ساتھ ہی انویم اور ندیم کے ساتھ گاؤں کی صفائی کی مہم اور بالغوں کو پڑھنے کا شوق دلانے کی کوشش میں بھی لگا رہتا۔ اس طرح اب ان تینوں میں بڑی گاڑھی چھننے لگی تھی۔

گیتا کا اسکول اب اور بھی جم گیا تھا۔ عورتیں پڑھتی لکھتی تو کم تھیں، مگر دستکاری کے کام اور سلائی وغیرہ شوق سے سیکھتی تھیں۔ ساتھ ہی قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی مزیدار خبریں سننے کی چاٹ بھی لگ گئی تھی۔ دوپہر کو وہ ہزار جتن کر کے آتیں اور گھنٹے دو گھنٹے "مدرسے" میں صرف کر جاتیں۔ کچھ لڑکیاں

ایسی بھی تھیں جن کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مدھو، کامنی اور شبراتی کی بہن سعیدن ان میں سب سے آگے تھیں۔ گیتا جو پہلے بے دلی اور مجبوری سے یہ کام کر رہی تھی اب شوق اور لگن سے اسی میں جٹ گئی تھی۔ اسے یہ خیال رہتا تھا کہ وہ "کچھ" کر کے دکھائے۔ اس کا مدرسہ "کچھ" بن جائے اور دوسروں سے گھٹ کر نہ رہے۔ خالدہ، تارا اور ساجو اس کی مددگار تھیں۔ اس لگن میں دو باتوں کا ہاتھ تھا۔ ندیم کی دوستی کا اور انوپم سے مقابلے کا۔ گیتا کا مرکز انوپم کے مرکز سے کسی طرح کم نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے حبیب میاں کی اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ انوپم سب کچھ کر سکتا ہے اور دوسرے نالائق ہیں۔ ساجو اس کی مخبر تھی، اسکول اور مرکز کی ساری خبریں گیتا تک پہنچاتی رہتی تھی۔ اور وہاں کا پروگرام سن کر اب ان سب نے بھی طے کر لیا تھا کہ دیوالی پر ان کا مدرسہ بھی ایک خاص پروگرام عورتوں کے لئے پیش کرے گا۔

خوش قسمتی سے حالات سازگار ہو گئے تھے۔ ٹھاکر سوہن سنگھ کچھ عرصے کے لئے اپنے ایک وکیل دوست کے پاس انبالے چلے گئے تھے جہاں وہ اپنی بچی کھچی زمینوں اور جائداد کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ حکومت رہی سہی چیزیں بھی ان سے نہ چھین لے۔ وہ بچارے یہ سمجھتے تھے کہ ان کی کوشش سے دیش کی بنیادی پالیسی بدل جائے گی اور وہ زمانے کے دھارے کا رخ موڑ دیں گے۔ ابن میاں کو کسی کام سے دلی جانا پڑا تھا اور دادی اپنی بہن کی نواسی کے بیاہ میں گئی ہوئی تھیں۔ صدیق حسن مدت ہوئی اپنی ملازمت پر جا چکے تھے۔ دونوں گھروں پر زیادہ تر نوجوانوں کا راج تھا۔

اس سنہرے موقعے سے فائدہ اٹھا کر گیتا نے پہلے تو سندر سنگھ کو ہموار کیا۔

محبت تو وہ اس سے پہلے دن ہی سے کرنے لگے تھے مگر اب تو وہ اس کا حکم اس طرح
مانتے جیسے وہ ان کی کوئی بزرگ ہو۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کی بدولت خود
ان کے گھر ہی میں زندگی کے سوتے نہیں پھوٹے بلکہ سارے گاؤں میں اس نے
جان ڈال دی ہے۔ مردوں میں جو کام ہو رہے تھے اس کا سہرا ابھی وہ اپنی لاڈلی
بھانجی کے سر ہی باندھ دینا چاہتے تھے۔ "شروع تو سب اسی نے کیا۔" ان کی
لڑکیوں کو بھی کوئی بات کہنی ہوتی تو گیتا کی معرفت کہلواتیں۔ سیتا دیوی تو پہلے
ہی سے قدامت پرستی کے خلاف تھیں اور کملا نگر کی گھٹی زندگی سے بیزار۔ وہ
خوشی سے لڑکیوں کی اسکیموں میں شریک ہوتیں۔ اگرچہ اکثر اپنے مزاج کی وجہ سے
بے بات خفا ہو کر الگ ہو جاتیں۔ رنگ میں بھنگ ہو جاتا۔ پھر بھی لڑکیوں کو
ان کی حمایت کی وجہ سے بڑا سہارا ملتا تھا۔ کسی دن چاندنی رات میں جمنا کی
سیر کا پروگرام بنتا۔ سب کی سب مل کر وہاں خوب اودھم مچاتیں، نہاتی دھوتیں
یا کسی ناؤ میں بیٹھ کر سیر کرتیں۔ کبھی بہت سویرے اٹھ کر، جب گاؤں میں سناٹا
ہوتا، کھیتوں کے اس پار نکل جاتیں اور ٹھنڈی ہوا اور سبزے کی لہک کا لطف
اٹھا کر واپس آجاتیں۔ ٹھاکر سندر سنگھ گاؤں کے رسم و رواج کے بڑی سختی سے
پابند تھے۔ ان کے ہاں کی عورتیں پہلے پالکیوں پر نکلا کرتی تھیں۔ اب بدرجۂ
مجبوری اسٹیشن وغیرہ جانا ہوتا تو چادریں اوڑھ کر، منہ ڈھک کر اکّے یا بہلی پر
سوار ہوتی تھیں۔ پھر بھی گیتا کے اصرار پر وہ مجبور ہو جاتے اور یہ مان جاتے
کہ اگر ان کی بیوی ساتھ جائیں تو لڑکیاں صبح کے دھندلکے یا رات کی تاریکی
میں باہر کی ہوا کھا سکتی ہیں۔ ہاں خالدہ کے لئے مشکل تھی۔ ابن میاں نہ
ہوں، بڑی اماں کیا کم تھیں؟ پھر بھی گیتا کی خوشامد درآمد سے اتنا ہوا کہ
دو ایک بار اس شرط پر بڑی اماں خالدہ کو بھیجنے پر تیار ہوئیں کہ سکینہ جائے

تو اسے بھی لے جاؤ۔ مگر سکینہ بیگم کو راضی کرنا تو اور بھی مشکل تھا۔ انھیں نہ اس دنیا سے کوئی دلچسپی تھی نہ دنیا والوں کے ہنگاموں سے۔ ان کی بے کیف بنجر زندگی نے محبت و انبساط کے سوتے خشک کر دیے تھے۔ پھر بھی وہ اپنی کمزور طبیعت کی وجہ سے سب کے اصرار پر مجبور ہو جاتیں۔ اور خالد کی خاطر لڑکیاں ان کی بے لطف صحبت کو گوارہ کر لیتیں جن کی موجودگی ہی ساری فضا کو اداس اور پھس بنا دیتی تھی۔

ایسے ہی کسی موقع پر گیتا گاؤں کے کسی گھر میں جانے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی اور اسی طرح وہ کملا نگر کے کئی گھروں میں جا کر دیہاتی عورتوں کی گھریلو زندگی کی جھلک دیکھ چکی تھی۔ اور اس سے اس کو ان کے مسئلوں اور ذہنی حالت کو سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ ساجو کے گھر تو وہ کئی بار گئی۔ اب شبراتی کی اور اس کی رقابت ختم ہو گئی تھی۔ گیتا اسے بھیا کہتی اور وہ بڑے ادب سے دیدی کہا کرتا تھا۔ ایک دن گیتا نے سنا کہ مدھو بیمار ہے۔ وہ گیتا کی بڑی عزیز شاگرد تھی، اس کی بیماری کا حال سن کر گیتا بے چین ہو گئی اور کسی نہ کسی طرح سندر سنگھ سے اجازت لے کر اگلے دن منھ اندھیرے وہ چودھری نرائن کے ہاں جا پہنچی۔ مدھو بخار میں بیہوش پڑی تھی۔ دادی بڑھیا اور اپاہج تھی۔ چودھری سر پر ہاتھ رکھے، پریشان پوتی کے سرہانے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ساری رات جاگتا رہا ہے۔ دادی رو رہی تھی۔ اس کے ماں باپ بہت چھوٹا چھوڑ کر گزر گئے تھے اور اس یتیم بچی کو دادا دادی ہی نے پالا تھا۔ گیتا نے چودھری کو سندر سنگھ کے پاس دوا لینے بھیجا اور خود مدھو کے پاس بیٹھ کر تیمارداری کرنے لگی۔ دن بھر وہ اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کا کپڑا رکھتی رہی۔ کونین کی گولیاں دیں اور ہومیوپیتھی دواؤں کا جو بکس سندر سنگھ کے پاس رہتا تھا اس میں سے دوائیں اسے دیتی رہی۔ دو بار اٹھا کر بچی کو

لینے آئے مگر اس نے انکار کر دیا۔ "ماموں آپ دیکھ رہے ہیں کہ بچی کا کیا حال ہے؟ کیسے میں اس کو چھوڑ کر چلی جاؤں؟" ہر بار سندر سنگھ کو واپس جانا پڑا۔ خدا خدا کر کے شام کو مدھو کا بخار ہلکا ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور "دیدی" کو سرہانے دیکھ کر خوشی اور احسان مندی کے جذبے سے اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ گیتا نے بڑے پیار سے اسے تھوڑا دودھ اور چائے پلائی اور عشاء کے وقت، چودھری کے ساتھ گھر واپس آئی اور کئی دن تک گھر والوں کے کھلے منہ اور بند بند طنز و طعن کا نشانہ بنتی رہی۔ گیتا نے اب ان لوگوں کی باتوں کو اس انداز سے سننے کی عادت ڈالی تھی جیسے وہ گونگی اور بہری ہے۔ وہ بکے جاتے، یہ سُنے جاتی، مگر کرتی وہی تھی جو اپنے من میں آتا۔ یہی بات وہ تارا کو سمجھاتی تھی کہ ان لوگوں کی باتوں پر رونے دھونے کی جگہ چپ چاپ سہہ لیا کرے مگر ان کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔

مدھو کے گھر جانے کے بعد وہ بہانے بہانے اور کبھی کبھی شاگردوں کے ہاں جا چکی تھی۔ ٹھاکر سندر سنگھ اب بھی چھوت چھات، اونچ نیچ کو مانتے، اور بے پردگی اور آزادی کو بُرا سمجھتے تھے مگر کیا کرتے کہ بھابی کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالنے پڑتے تھے۔ گیتا کو اب کملا نگر بور نہ لگتا تھا۔ تارا اور خالدہ کے علاوہ اب لتا سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس بچاری میں گہری دوستی کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ طبیعت میں اس قدر اُتھلا پن تھا کہ نہ کسی مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر سکتی تھی نہ خود اپنی کوئی رائے رکھتی تھی۔ نظر اتنی محدود تھی کہ اپنی ذات اور اپنی ماں سے آگے وہ دیکھ ہی نہ سکتی تھی۔ ہر چیز، ہر مسئلہ، ہر مشکل اور ہر کام کو وہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھتی کہ اس پر اور ماں پر اس کا کیا اثر پڑا۔ ماں اس کی آئیڈیل تھیں۔ ان کی "مظلومی اور بے زبانی" کا احساس

صرف اسی کو تھا اور ان کی سیرت اور صفات کو بھی صرف وہی اپناتی تھی۔ اگرچہ ان کی بدمزاجی کا اثر پورے گھر پر پڑتا اور سبھی کے مزاجوں کو خاصا خراب کر دیتا تھا۔ وہ خود جب ماں کے غصے کا شکار ہوتی تو اس وقت ان کی "مظلومی" اور "بے زبانی" کی جگہ ان کی سخت گیری اور بد زبانی کی شکایت ہو جاتی تھی۔ گیتا جہاں تک ہوتا اسے سمجھانے کی اور راہ پر لانے کی کوشش کرتی۔ مگر ماں کی بے تکی خصوصیت اور ہمدردی اس کی سب کوششوں پر پانی پھیر دیتی تھی۔ تارا البتہ اس کا اچھا اثر قبول کر رہی تھی اور خالہ وہ تو گیتا پر جان ہی دیتی تھی۔ ان سب کی محبت اور خلوص کو گیتا دل سے محسوس کرتی اور ممنون تھی۔

مگر کچھ دن سے دل میں ایک نیا ولولہ، نیا جوش، نئی مسرت کا احساس کیا ہے؟ زندگی میں اتنی دلچسپی، کاموں میں اتنا انہماک، اور خود اپنی ذات کا اتنا خیال تو اُسے کبھی نہیں ہوا تھا؟

کملا نگر میں اس بار دیوالی پر جو رونق نظر آئی وہ اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ چھوٹی دیوالی کے دن گاؤں کے گھروں اور مندر میں روشنیاں کم تھیں، مگر مدرسے کی عمارت تو پرستان کی طرح جگمگا رہی تھی اور سارا گاؤں اسکول کی طرف اُمڈا چلا آ رہا تھا تاکہ دیکھیں کی اس سندر روشنی میں اس ناٹک کو دیکھیں جس کی تیاریاں اتنے دن سے ہو رہی تھیں۔ بچے اور نوجوان ہی نہیں بڈھے تک اس کو دیکھنے کیلئے بیقرار نظر آتے تھے۔

اسکول کے سامنے کچے چبوترے پر بانس گاڑ کر ایک چھت گیری لگائی گئی تھی اور سامنے لال رنگ کا بڑا سا پردہ ٹانک کر اسٹیج گویا مکمل کر دیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے سینکڑوں دیے جگمگا رہے تھے اور اس سے آگے کے

وسیع میدان میں پہنچتی ہی زینت پرکئی سو آدمیوں کا ہجوم تھا جو اشتیاق میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ عورتوں کے لئے اسٹیج سے بائیں طرف ایک حصے کو رسّیاں باندھ کر الگ کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر دیکھ سکیں۔ سرِ شام ہی سے وہ حصہ عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ بہوویں، بوڑھی بوڑھی بھی گھونگھٹ کاڑھے ہوئے تھیں۔ گاؤں کی کنواری لڑکیاں اور بیاہی بیٹیاں جوان اور خوبصورت بھی منھ کھولے سے بیٹھی تھیں۔ "بہو" سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا تو ہر دیور کو حق ہوتا ہے مگر دیہات کے آئین میں گاؤں کی بیٹی کو بری نظر سے کیا بے باک نظروں سے دیکھنا بھی سخت اخلاقی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ نوجوان بھی گاؤں کے اس قانون سے واقف ہوتے ہیں۔ "بہوؤں" سے مذاق کرتے، فقرے کستے، چھینٹے اڑاتے مگر "لڑکیوں" پہ نظر ڈالنے کی ہمت نہ پڑتی۔ یہ دل کو کیا کرتے؟ اپنی دلرباؤں کو دیکھنے سے خود کو باز تو نہیں رکھ سکتے تھے مگر اس انداز سے دیکھتے کہ ع "دل تیری طرف نظر کہیں اور" فقرے کستے، چھیڑ چھاڑ کرتے، دل کی بات سناتے مگر کسی اور پہ رکھ کر۔ جانتے تھے کہ سمجھنے والی سمجھ جائے گی کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔ دھڑکتا دل بتا دے گا کہ مقصود و محبوب کون ہے؟

گیتا نے جانے کیسے کیسے جتن کئے، کیا کیا ترکیبیں لڑائیں، ماما اور نانی کو ہموار کیا اور کسی نہ کسی طرح ٹھاکر سے اس ڈرامے میں جانے کی اجازت لے لی۔ صرف اپنے لئے ہی نہیں لتا، تارا، ماما اور نانی کے لئے بھی۔ خیر نانی نے تو انکار کر دیا مگر اور سب وہاں پہنچ گئیں۔ خالدہ اور سکینہ بھی موجود تھیں۔ زینب بی کی اجازت لیتے ہی بنی۔ جب سارا گاؤں اور ٹھاکر کے گھرانے تک کی سب عورتیں جا رہی ہیں تو خالدہ نامراد کا بھی تو دل ہے۔

یہ ان کی موٹی سمجھ میں آ ہی گیا۔ اس وقت یہ سب کی سب موٹی موٹی لٹھا کاڑھے کی سفید چادریں اوڑھے اور ان کے گھونگھٹ کاڑھے بالکل گاؤں والیوں میں مل گئی تھیں تاکہ گاؤں والوں کو پتہ بھی نہ چلے کہ "میاں" اور "ٹھاکر" کے گھرانوں کی عورتیں بھی یہ بدعت کر رہی ہیں۔ مگر گیتا کو ان باتوں کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ اور ساجو پہلے تو عورتوں کو قرینے سے بٹھانے اور بچوں کو چپ کرانے میں مصروف رہیں مگر جیسے ہی ناٹک شروع ہونے لگا، وہ سب ساتھیوں کو چھوڑ کر چپکے سے دوسری سمت جا کر اگلی صف میں بیٹھ گئیں۔ گیتا جانتی تھی کہ گاؤں والوں کی توجہ اس وقت ان کی طرف نہیں ناٹک کی طرف ہے۔

پروگرام لکشمی پوجا سے شروع ہوا اور قومی ترانے پر ختم۔ بیچ میں لوک ناچ لوک گیت ہوئے جن میں چمن، شبراتی، بندو، ناتھولال، رام لال ہنگل وغیرہ کے علاوہ انوپم اور ندیم نے بھی حصہ لیا۔ گانے کے وقت گاؤں والے اکثر جوش میں خود بھی ساتھ ساتھ گانے لگتے۔ ناچ کے وقت کتنے پاؤں تھرکنے لگتے اور بھانگڑا ناچ کا سین جب سامنے آیا تو تین پرجوش نوجوان مجمع سے تھرکتے ہوئے نکلے اور اسٹیج پر پہنچ کر اور سب کے ساتھ مل کر ان سے زیادہ آہنگ اور صحت کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔

پروگرام زوروں پر ہو رہا تھا۔ ساجو نے گیتا کے کہنی ماری۔ "گیتا بی، انہیں دیکھنا ذرا غور سے۔"

گیتا نے دیکھا۔ ایک دُبلا پتلا، سانولا نوجوان لال پگڑی باندھے، گلابی صدری ڈانٹے، ناچنے والوں کے بیچ میں کچھ بے ڈھنگے انداز میں ناچ رہا ہے۔

"کون ہے یہ؟ ذرا بھی ناچنا نہیں آتا۔"

"ارے تم تو کہو تھی انھیں جانو ہو ——— یہی تو ہیں انوپ بھیا۔ انوپم۔"

"ارے یہ انوپم ہیں ؟" حیرت سے گیتا نے کہا۔ اس حلیے میں وہ پکا دیہاتی لگ رہا تھا۔

"بڑا اچھا لگ رہا ہے نا ؟" ساجو نے گیتا کو چھیڑا۔

"کون ــ یہ انوپم ؟ ہنہ مجھے کیوں اچھا لگتا۔ مغرور، خود پسند، جانے اپنے کو کیا سمجھتا ہے۔" ناک چڑھا کر گیتا نے جواب دیا۔

"واہ خواہ مخواہ۔ بچارے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ الٹا وہ تو تمہاری تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔"

"وہ کون ہوتا ہے میرا ذکر یا تعریف کرنے والا۔ واہ۔" پروگرام کی کامیابی پر خواہ مخواہ گیتا جلی جا رہی تھی۔ انوپم نے اتنا عمدہ پروگرام مرتب کر لیا۔ اور خود اس کا پروگرام ؟ جانے کیسے ہوگا۔

ذرا دیر بعد ناچ ختم ہو کر ناٹک شروع ہو گیا۔ شبراتی ہیرو تھا۔ ندیم بڑھا چودھری بنا تھا۔ انوپم اس کا جواری شرابی بیٹا جس کے تین شوق تھے۔ جوا کھیلنا۔ ہار کے غم کو دارو میں ڈبونا اور گھر آنے پر بیوی کو پیٹنا۔

"ارے ساجو دیدی ــ دیکھنا دیکھنا ــ یہ ندیم صاحب۔ افوہ۔ سفید مونچھیں، جھکی کمر، پوپلا منھ ــ ارے ــ کون پہچان سکے ہے اس حلیے میں لگیں جیسے سچ مچ ستر برس کا بڈھا ہو۔" گیتا نے جوش میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں ــ سوا ان کے جو ــ جو ــ اچھا تم نے کیسے پہچان لیا؟" ہنس کر ساجو نے پوچھا۔

"آنکھوں سے۔ ان کی آنکھوں کی سی دیکھت اور کسی کی ہٹی نہیں دیکھی۔"

عین اسی وقت بوڑھے چودھری کی نظریں اٹھیں اور گیتا کی نظروں سے ٹکرائیں۔

"سنبھل کے ۔ گیتا بی سنبھل کے ۔۔ لڑھک نہ جانا۔" ساجو نے گیتا کو ذرا سا دھکیل کر کہا۔

چند منٹ ناٹک چلتا رہا۔ اب چودھری کے سپوت پیئے ہوئے جھومتے جھامتے تشریف لائے اور آتے ہی بیوی کو گالیاں دینا اور مارنا شروع کر دیا۔

"ہائے اللہ۔ یہ انوپ بھیا تو خوب بدمعاش بنے ہیں۔ دیکھنا۔ دیکھنا۔ بیوی کو کتنے زور سے مار رہے ہیں ۔۔ ہائے توبہ ۔۔ میرا میاں بھی جب مارے تھا تو ایسا ہی وحشی لگنے لگے تھا۔"

گیتا کی نظریں تو اسٹیج پر تھیں مگر اتنا پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ "اب تو نہیں مارتے وہ تمھیں؟"

"اوں ہوں۔ اب کبھی ہاتھ اٹھا کے دیکھے، پھر میں بھی بتا دوں گی ۔۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ تم سے اور انوپ بھیا سے بھی بہت ڈرے ہے کہ کہیں تم لوگوں نے سن لیا کہ وہ مجھے ۔۔ وہ مجھے ۔۔ اے ارے ۔۔ گیتا بی۔ دیکھنا ۔۔ دیکھنا ۔۔ کیسا جنٹل مین لگ رہا ہے میرا مرد ۔۔ ہائے کیسا سُندر لگے ہے۔" جوش میں ساجو کی آواز خاصی اونچی ہو گئی تھی، ایسی کہ پاس بیٹھے کئی لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔

شبراتی صاحب کھدر کے سفید کرتے پر کالی جواہر جیکٹ ڈانٹے، سفید گاندھی ٹوپی اوڑھے، سفید پاجامہ پہنے، ہاتھ میں چمڑے کا بریف کیس پکڑے اسٹیج پر وارد ہوئے تھے اور گیتا نے دیکھا کہ وہ سچ مچ بڑا "اسمارٹ" اور بقول ساجو کے بڑا "جنٹلمین" لگ رہا تھا۔

ناٹک سے لوگوں نے اتنا لطف تو نہیں اُٹھایا جتنا ناچ گانے سے، پھر بھی بہتوں نے اسے پسند کیا۔ کچھ لوگ سر ہلا ہلا کر ایک دوسرے سے

کہہ رہے تھے ۔" ہاں بھتیا ۔ یہ دارو اور جوا ہے بری بلا ۔ گھر بار، بال بچے
سب کا ستیاناس مار دے ہے اور بے اجت کرے وہ الگ ۔"

آخر میں کرشن لیلا کا چھوٹا سا سین ہوا ۔ کلّو اپنے رنگ کی مناسبت
سے کرشن بنی تھی اور اسکول کی اور چھوٹی چھوٹی بچیاں رادھکا اور گوپیاں ۔
کلّو منھ پر مدھر مسکراہٹ ، کالی آنکھوں میں شرارت کی چمک ، سر پر دمکتا ہوا
مکٹ ، ہاتھ میں ہونٹوں سے چھوتی بنسری لئے بڑی اچھی لگ رہی تھی ۔
خالدہ نے آس پاس بیٹھی عورتوں اور لڑکیوں کو کھسوٹ ڈالا ۔
" دیکھیو ۔۔ دیکھیو ۔۔ ہائے مرے اللہ ۔۔ کتنی پیاری لگ رہی ہے
مری کلّو ۔۔ پھپی دیکھنا تو ۔۔"

اس کے بعد سب کام کرنے والے اسٹیج پر آ گئے اور انوپم ، ندیم ، شبراتی
اور چند اسکول کے لڑکوں نے " جن گن من ....." شروع کیا ۔ پہلے چند
لوگ کھڑے ہوئے ۔۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر کچھ اور کھڑے ہو گئے اور
ذرا دیر میں سبھی کھڑے تھے اور بہت سے نوجوان گانے والوں کی آواز میں
آواز ملا کر گا رہے تھے ۔

جن گن منگل نائک جے ہو ۔۔ بھارت بھاگ ودھاتا ۔

قومی ترانے میں پہلے گیتا کی سریلی آواز شامل ہوئی اور پھر ساجد
اور بہت سی اور لڑکیوں کی ۔ مردوں کی بھاری پر وقار اور بچوں کی
ننھی ننھی آوازوں میں عورتوں کی مدھر ، سریلی ، رسیلی تانوں نے مل کر ایک
عجیب اثر اور دلکشی پیدا کر دی ۔

اور اس ہنگامے میں ٹھاکر سندر سنگھ کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ قومی ترانا
گانے میں صرف گیتا ہی نہیں تارا ، لتا اور خالدہ تک شامل تھیں ۔

۱۱

بڑی دیوالی کے دن چہل پہل اور بھی زیادہ تھی۔ ہر ہر گھر، دوکان، مندر، اسکول بھی تو جگمگا رہے تھے۔ یہ چراغاں صرف ہندوؤں ہی کے ہاں نہ تھا بلکہ بستی کے اکثر مسلمانوں کے گھروں میں بھی تھوڑے بہت دیئے یا موم بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی خونی دور کو چھوڑ کر جب باہر کی زہریلی ہواؤں نے کچھ نہ کچھ کملا نگر کی فضا کو بھی مسموم کر دیا تھا، وہاں ہندو مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے روٹھتے، جھگڑتے لڑتے ضرور تھے مگر پھر اسی طرح مَن بھی جاتے تھے جیسے لڑاکو مگر محبت کرنے والے بھائی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی خوشی میں خوش اور دُکھ میں دُکھی ہوتے۔ ایک دوسرے کے جھگڑوں میں ٹانگ اڑاتے۔ منھ پر اور پیٹھ پیچھے بھی ایک دوسرے پر تنقید کرتے، بُرا بھلا کہتے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا شوق تو ٹھیرا ہندوستانی فطرت میں۔ کملا نگر والے کیا خدانخواستہ ہندوستانی نہ تھے؟ ان میں تُو تُو میں میں، گالی گلوچ، لپاڈگی بھی ہوتی رہتی۔ کبھی کبھار "کافر" اور "مُسلّے" کے الفاظ بھی کسی کے مُنھ سے نکل جاتے۔ مگر یہ سب اوپری باتیں تھیں۔ دل کی گہرائیوں تک ان کا اثر نہ پہنچتا۔ ابھی لڑے ابھی پھر مَن گئے۔ ابھی جھگڑ رہے ہیں ابھی پھر ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ محبت کا یہ بندھن اتنا مضبوط تھا جس کو فسادات کے دَور کی ہولناک آندھیاں بھی نہ توڑ سکیں۔ کچھ عرصے ذرا کشیدگی رہی، ایک دوسرے پر چھینٹے اڑاتے رہے، پھر دھیرے دھیرے سب بھول بھال گئے۔ یہ سیدھے مخلص دیہاتی اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود تعصب اور تنگ نظری کے اس

زہر سے پاک تھے جو قوم کو تباہ کرتی اور ملک میں بربادی اور تفریق پیدا کرتی ہے۔

آج کملا نگر کے ہر گھر میں غیر معمولی رونق اور مصروفیت نظر آرہی تھی۔ لکشمی پوجا، مٹھائی کی تقسیم، دیئے جلانے اور ایک دوسرے کے ہاں حصے بھیجنے یا ملنے جانے کا اہتمام، مہمانوں کی آؤ بھگت سبھی کچھ تو کرنا تھا، اس لئے گیتا کے اسکول کا جلسہ یا پروگرام، جو بھی کہیے دیوالی سے اگلے دن ہونا طے پایا۔ کل کا مردوں کا جشن دیکھنے کے بعد ساری لڑکیاں اور زیادہ اسی فکر میں تھیں کہ ان کا پروگرام کسی طرح مردوں سے گھٹ کر نہ رہے۔

دوپہر کو شبراتی اور ساجو نے ندیم اور انوپم کو مٹھائی کھانے کے لئے بلایا تھا ان میں اور ساجو میں دیور بھاوج کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ تینوں میں خوب نوک جھوک چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ انوپم تو کم گو اور شرمیلا تھا مگر ندیم اس رشتے کی بے تکلفی سے خوب فائدہ اُٹھاتا اور ساجو کو چھیڑتا، بناتا اور خصوصیت کرتا۔ اس وقت تیل کا پکوان اور مٹھائی پیٹ بھر کھانے کے بعد چادروں میں کھسر پسر ہو رہی تھی۔

"بھیّا اب تم دونوں خدا کے لئے اپنے گھر جاؤ۔ مجھے بھی اپنے مدرسے جانا ہے۔" ساجو نے کہا۔

"واہ بھابی! گھر سے نکال رہی ہو؟ ایسی بھی کیا بے مروتی!" ندیم نے جواب دیا۔

"بھابی جی آپ بھی تو کوئی نہ کوئی پارٹ کر رہی ہوں گی ڈرامے میں؟" انوپم نے پوچھا۔

"تمہیں کیوں بتائیں؟" اٹھلا کر ساجو نے جواب دیا۔

"جانے بھیّا اسے کیا ہوگیا ہے۔ رات میں بھی بُدبُداتی رہے ہے۔ ضرور ناٹک میں کچھ بنی ہے پر بتاوے نا ہے" کچھ شکایت کچھ فخر کے ساتھ شبراتی نے کہا۔

"تو پھر ساجو بھابی ــ پکی رہی؟ پھر نہ جانا؟" ندیم نے جاتے جاتے رُک کر کہا۔

"مجال ہے بھیّا کہ یہ پھرے۔ جانے ہے مجھے خوب۔ ہاں نہیں تو۔" شبراتی نے اکڑ کر خاوند کی شان دکھائی۔

"اے ہے۔ آئے بڑے رعب گانٹھنے والے۔ لو تو جاؤ۔ ہم یہیں سے پھرے جارہے ہیں۔ دیکھوں کیا کرلو گے" ساجو نے اٹھلا کر، اترا کر انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی تم دونوں تو لڑنے لگے، اور ہمارا کھیل بگڑا جارہا ہے" انویم نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی خدا کے واسطے شبراتی میاں اس وقت اس اکڑ کو رہنے ہی دو ــ کسی اور وقت دکھانا اور ساجو بھابی تم جو کہو ہم مانے لیتے ہیں، مگر وعدہ نباہنا" ندیم نے خوشامد کی۔

"اور خبر نہ ہو کسی کو نہیں تو؟" سہمے لہجے میں انویم نے کہا۔

"نہیں تو بھیّا ــــ ٹھاکر تم لوگوں کا سر مونڈ کر گاؤں سے نکال باہر کریں گے۔ ہاں ــ" ساجو نے ڈرایا۔

"تو پھر ــ رہنے ہی دو ــ" انویم گھبرایا۔

"اجی واہ ۔ یہ ان کی اٹکھیلیاں ہیں۔ بھلا ان جیسی چالاک عورت کے ہوتے"۔ ندیم نے شوخ نظروں سے ساجو کو دیکھا۔

"اوہو جی — ہمیں بناتے ہیں۔ کہیں میں سچ مچ ہی بھانڈا نہ پھوڑ دوں"
ساجو اور اترائی۔

"جا جا۔ بہت نخرے نہ بگھار۔ آپ ہی تو اکسایا انھیں اور اب آپ ہی ڈرا رہی ہے"۔ شبراتی کو بیوی کی چہلیں اچھی نہ لگ رہی تھیں۔

"پر یاد رکھنا بھیا — میری چیز اگر تمھارے اس یار نے نہ لا کر دی تو پھر — ہاں —" ساجو نے تنبیہہ کے طور پر انگلی ہلائی۔

"اجی وہ نہ لایا تو ہم کس لئے ہیں"۔ ندیم نے ہنس کر کہا۔ نورو کے رونے کی آواز پر ساجو باہر صحن میں بھاگی۔ تینوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ سر ہلے اور باہر نکل گئے۔

ٹھاکر سندر سنگھ کا گھر ہزاروں دیوؤں اور موم بتیوں سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ ایک گیس کا ہنڈا بھی کہیں سے منگا لیا گیا تھا۔ لڑکیاں صبح ہی سے ناٹک کی تیاری میں مصروف تھیں اور گاؤں کے ہر ہر گھر میں یہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تہواروں اور شادی بیاہ وغیرہ کو چھوڑ کر ان عورتوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی چیز صرف ان کے لئے ہو۔ ان کی ہو۔ کسی "غیر" کا اس میں دخل نہ ہو۔ کچھ قدامت پرست بڑھیوں نے جن میں ساجو کی ساس پیش پیش تھی، اس کی مخالفت ضرور کی۔ مردوں میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جنھوں نے ڈنڈے کے زور سے بیوی بیٹیوں کو "ناٹک" میں جانے کو منع کر دیا تھا۔ عورتوں کی یہ بڑھتی ہوئی آزادی اور خود اعتمادی خود رائی انھیں کسی خوفناک طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی اور نامعلوم اندیشوں سے ان کے دل کانپ رہے تھے، لیکن زیادہ تر لوگوں نے عورتوں

کو نہ صرف جانے کی اجازت دی تھی بلکہ خود بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ اگر جوان مرد اپنی "بہو" کو سنگھار بناؤ کرتے، شوق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے تو بڈھے بھی کنکھیوں سے اپنی گھروالی کو کڑوے تیل سے پٹیاں جماتے اور آنکھوں میں کاجل پاڑھتے دیکھنے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکے تھے۔ اس جلسے نے ایک اچھے خاصے تہوار کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ شام ہوتے ہی عورتوں کے گروہ کے گروہ اپنے بہترین کپڑوں اور سارے زیوروں سے آراستہ، چھم چھم کرتے ٹھاکر کے گھر کی طرف جانے شروع ہو گئے اور آٹھ بجے سے پہلے گھر کے وسیع صحن چبوترے اور ڈیوڑھی تک کا چپہ چپہ بھر چکا تھا۔ وہ شور وغل، وہ ہنگامہ، وہ توتو میں میں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ گیتا اور تارا سخت پریشان کہ یہ حال رہا تو ڈرامہ کیسے ہو سکے گا، جب منتظم لڑکیاں عورتوں کو چپ کرانے کی کوشش کرتیں تو عورتیں الٹا ان سے جھگڑنے لگتیں۔ سیتا دیوی، سکینہ بیگم، بڑی اماں اور دادی سبھی انتظام میں شریک ہو گئی تھیں۔ اور اپنے اپنے انداز میں گاؤں والیوں کو ڈسپلن سکھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ "اری آفت ماریو ذرا تو چپ رہو۔"

"اری بے نصیبو! بچوں کو تو ذرا سنبھالو۔ کیسا ہڑدنگا پن مچا رکھا ہے۔"

"ارے غارت ہو جاؤ تم — سارے میں گندگی پھیلا دی۔"

"اے بہن — دیکھ تو تیرا لڑکا سارا موت گوئیں لتھڑ گیا ہے۔"

"کمبختو — ان اپنے پلّوں کو کیوں لے کر آئی ہو۔"

"ہائے ہائے سارا آنگن ستیاناس کر دیا۔ ہگ ہگ اور موت موت کے ان .... نے۔"

مگر عورتیں بھی ٹھہریں ان باتوں کی اور اسی انداز کی عادی۔ نہ انھوں نے زیادہ برا مانا نہ کہنا مانا۔ برابر سے سوال جواب کیے گئیں۔

"اے جاؤ بھی بڈھی ماں ۔ تمھارے کو تو بکنے کا مرج ہے۔"

"اوئی رہنے دو ٹھکرانی ــــ تم تو بے بات لڑا کرو ہو ۔"

"تو بولو بھینا ــــ بچے آویں گے تو گو موت آپ ہی ہو گا ــــ تم تو بہو جی بھگوان کی کرپا سے بال بچے والی ہو ــــ ایسے تو نہ ٹوکو بالکوں کو۔"

"سکینہ بی ــــ بتاؤ تو بھلا کریں کیا؟ بچوں کو کس پر چھوڑ کر آتے بھلا؟"

ساجو نے گیتا کو سمجھایا ۔ ابھی کچھ نہ کہو جلسہ شروع ہو جائے گا تو سب آپ ہی چپ ہو جائیں گی اور یہی ہوا جب بڑے دالان کے سامنے بڑا ہوا پردہ ہٹا اور اندر کیلے کے پتوں، جھنڈیوں، قندیلوں اور کاغذ کے پھولوں سے سجا ہوا اسٹیج نظر آیا تو چند لمحے بے حد شور و غل ہو کر آپ ہی آپ گم ہو گیا ۔ عورتیں منھ کھولے، حیرت اور شوق سے "تماشا" دیکھنے لگیں۔ چھوٹے بچے روئے تو ماؤں نے زبردستی ان کے منھ میں دودھ ٹھونس دیا اور بڑے روئے یا بولے تو تھپڑ یا گھونسہ مار کر اور رلا دیا ۔

پروگرام میں تین لوک گیت ، ایک فصل (بونے ، کاٹنے ، چھاننے پھٹکنے) کا ناچ ایک چھوٹا سا ڈراما اور ایک قوالی شامل تھی ۔ ڈانس میں لڑکیاں پگڑیاں باندھ کر ، دھوتی پہن کر ، کاجل کی مونچھیں لگا کر مردوں کی نقل کر رہی تھیں ۔ قوالی میں بھی مرد قوالوں کے لباس اور انداز میں لڑکیوں نے بڑے مزے سے قوالی گائی ۔ گیتا اور خالدہ دونوں رہنمائی کر رہی تھیں اس لئے کہ دونوں ہی کی آواز بہت سریلی اور خالدہ کی پاٹ دار بھی تھی ۔ لتا ڈھولک خوب بجاتی تھی اور مدھو کو طبلہ بجانا آتا تھا ۔ عورتوں کو اپنا پروگرام مردوں کے پروگرام سے کہیں زیادہ اچھا لگ رہا تھا ۔ اول تو اپنائیت کا احساس ۔ یہ ان کا اپنا "جلسہ" اپنا "ناٹک" ہے ۔ ان کے لئے کیا گیا

ہے۔ پھر جو رنگینی، حسن، نزاکت یہاں تھی وہ وہاں کہاں سے آتی۔ وہاں دو تین مردوں نے عورتوں کا بہروپ بھرا ضرور تھا مگر بھاری آواز، لمبے قد، بے ڈول جسم، ذرا بھی تو وہ روپ ان پہ نہ پھبا تھا۔ پھر عورت کے بغیر تفریحی پروگرام کیا زندگی ہی بے رنگ اور بے کیف رہتی ہے۔

"ساس بہو" ایک چھوٹا سا ڈراما گیتا نے اس موقع کے لئے لکھا تھا اور دو ہفتے سے اس کی روزانہ ریہرسل ہو رہی تھی۔

ڈراما شروع ہوا۔ ساجو، ساس بنی چکی پیستی نظر آئی۔ بار بار کوٹھے کی طرف منھ کر کے بڑبڑاتی جاتی۔ ذرا دیر بعد بہو مخمور آنکھیں ملتی جن سے سارا کاجل گلوں پہ پھیل گیا تھا، اور جمائیاں لیتی کوٹھے میں سے نکلی۔ چھوٹتے ہی ساس نے لتاڑا "اٹھ گئی مہارانی —— باوا کے گھر یہی لچھن سیکھے تھے؛ بڈھی ساس ہڈیاں پیلے اور جوان بہو بے سرمی سے کھسم کو لئے پڑی اینڈتی رہے"۔

بہو نے تیکھے انداز میں جواب دیا۔ "تمھیں تو ماں جی بجے کا مرج ہے اتنا تو سویرا ہے۔ اور کیا آدھی رات کو اٹھ جاؤں؟ تم بڈھی ٹھڈی، نیند نہ آوے تو ہم کیا کریں؟"

"بڈھی ٹھڈی" نے ساس کے پتنگے ہی تو لگا دیے۔ ایک تو بے حیائی کرے اوپر سے زبان چلائے اور پھر بڈھی کا تانا!! بس مہابھارت کہیں لینے جانا تھی؟ ساس ہاتھ چلا چلا کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر بہو کو کڑاکے کے کوسنے دے رہی۔ اس کے میکے والیوں پہ تانے کس رہی تھی اور بہو بھی برابر سے تیکھے تیکھے جواب دیتی جاتی تھی، اور دونوں ہی بات بے بات "ماں کے پوت" اور "جورو کے گلام" کو بیچ میں لاتیں اور اسے برا بھلا کہتیں۔

"وہ ایسا نہ ہوتا تو ان کی یہ درگت ہوتی بھلا؟ دونوں کی دلیل ایک ہی تھی۔

محلے پڑوس کی کئی عورتیں، کچھ مرد، بہت سے بچے کوٹھوں پر اور گھر کے اندر سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ ہنس رہے تھے، کچھ سمجھا رہے تھے، کچھ آگ پر تیل چھڑک رہے تھے۔

"ماں کا پوت" یا "جورو کا گلام" چند منٹ کوٹھے کے دروازے پر کھڑا یہ سین دیکھتا اور غصے میں بل کھاتا رہا۔ آخر ضبط نہ ہوا تو گالیاں بکتا ہوا لاٹھی ہاتھ میں پکڑے آگے بڑھا......

اب ڈرامے میں اسے ماں کو برا بھلا کہہ کر بیوی کو لاٹھی سے دھنک کر گالیاں بکتے ہوئے باہر نکل جانا تھا اور ساس کو چھاتی پیٹ پیٹ کر بیٹے کو کوسنا، بیوی کا اپنے بچے کو دھواں دھوں مارنا اور پھر سب کا ایک ہی سُر تال میں رونا تھا۔

ساجو ساس کا پارٹ بڑی اچھی طرح کر رہی تھی عورتیں ہنستے ہنستے بے دم ہوئی جا رہی تھیں۔

"اری دیکھیو — دیکھیو — ساجو بالکل اپنی ساسو لگ رہی ہے۔ اس کی تریوں کوسے ہے۔ اسی کی تریوں منہ ٹیڑھا کر کے گالیاں بکے ہے۔ اے دیکھنا ہاتھ بھی ویسے ہی مٹکا رہی ہے — جانو جیسے سبراتی کی ماں ہو بالکل؟ شکر ہے کہ شبراتی کی ماں اس وقت نہیں موجود تھی ورنہ ان کی باتوں سے بپھر کر ممکن تھا کہ اصلی ناٹک شروع ہو جاتا۔

بہو کا رول گیتا کر رہی تھی۔ مدھو اور ساجو نے اسے بالکل دیہاتی بہو بنا دیا تھا۔ لچکا لگا گھوم دار سرخ لہنگا، نیلی کرتی، گوٹ لگا سبز دوپٹہ۔ موٹے موٹے چاندی کے زیور ہاتھ، پاؤں اور گلے میں، ناک میں نتھنی۔ بچے کو لینے کا وہی انداز اور لڑنے اور رونے کی وہی ادا۔ البتہ ایک بات پر وہ کسی طرح راضی

نہ ہوئی کہ بچے کو سنبھالتے ہوئے وہ اسی طرح سینے سے لگائے جیسے وہ دودھ پی رہا ہو۔ شرم اور غصے سے گیتا کا منہ لال ہوگیا، اس تجویز پر" ہٹ بدتمیز میں نہیں کروں گی یہ پارٹ "

آخر اس خیال کو چھوڑنا پڑا۔ گیتا اس روپ میں بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا۔ میاں کا کردار نا تھو لال کی تیس بتیس سالہ لمبی تڑنگی ہوئی کو سونپا گیا تھا۔ اس کا پتی اسے مارنے میں گاؤں بھر میں مشہور تھا اور سا جو کی مدد سے گیتا نے اس کا حلیہ بالکل نا تھو لال کا سا بنا دیا تھا۔ اسے خوب سمجھا دیا گیا تھا کہ جب وہ بیوی پر لکڑی چلائے تو اس طرح کہ گیتا کی پیٹھ کی بجائے زمین پر پڑے، اگرچہ دور سے دیکھنے والے کو یہ لگے کہ بہو پر لاٹھیاں پڑ رہی ہیں۔ ریہرسل میں وہ کئی بار "کامیابی" سے مار بھی چکی تھی، مگر اس وقت گھبراہٹ اور جوش میں، کچھ اپنی دھوتی اور پگڑی کو سنبھالنے کی فکر میں سارا سبق بھول گئی اور لاٹھی جو چلائی تو بھرپور وار گیتا کی پیٹھ پر پڑا، ایک سچ مچ کی زور کی چیخ اس کے منہ سے نکلی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ایک لمحے تک اسٹیج پر سناٹا رہا اور پھر یکایک گیتا نے پلٹ کر "پتی" کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دیکھنے والے اسے بھی اصل ڈرامے کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے۔ گیتا سچ غصے میں چلا رہی تھی۔" بس بس خبردار —— اب جو مجھے مارا پیٹا تو اچھا نہ ہوگا —— واہ —— یہ روج روج کی مار اب میں نہ سہوں گی —— میں بھی آدمی ہوں گائے بھینس نہیں —— تمہاری پتنی ہوں —— تم میرا آدر کروگے تو میں بھی تمہاری عزت کروں گی، نہیں تو پھر تم جانو ——" "پتی" ہاتھ چھڑا کر بدحواس باہر بھاگا تو بہو نے بجائے رونے چیخنے اور بچے کو پیٹنے کے اسے چھاتی سے لگا لیا اور ترچھی نظروں سے ساس کو دیکھ کر (جو گھبرا گھبرا کر سر و چھاتی پیٹ رہی تھی اور پریشان تھی کہ گیتا نے یہ کیا

گڑبڑ کردی) بولی ۔" ماں، بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم دونوں ماں بیٹی ہو کر یوں بھٹیاریوں کی طرح یوں لڑیں ۔ مرد کی جوتیاں کھا دیں ۔۔ آؤ ماں، آج سے ہم دونوں بھگوان کے سامنے قسم کھا دیں کہ اب لڑیں گے نہیں اور نہ کسی کو اپنی بے عزتی کرنے دیں گے ۔۔ دیکھیں تو اب کس کی مجال ہے کہ ہم پر ہاتھ اٹھاوے یا کچھ کہوے ۔" اور "ساس" نے جب کچھ کہنے کے لئے سمجھ میں نہ آیا تو لپک کر "بہو" کو گلے سے لگا لیا اور پردہ گر گیا ۔

اس بے ساختہ تبدیلی نے ڈرامے میں نئی روح پھونک دی ۔ ایک ایسا انجام جس کا خیال خود گیتا کو بھی اس سے پہلے نہ آیا تھا اور اگر "پتی" کی لاٹھی نہ پڑتی تو آتا بھی نہیں ۔

سب گیتا کی طرف دوڑ پڑے "کیا ہوا ؟ کیا ہو گیا ؟ زور سے تو نہیں لگی ؟ کہاں چوٹ آئی ؟" سب لڑکیاں گھبرا گھبرا کر گیتا سے پوچھ رہی تھیں ۔ اور نتھو لال کی بیوی سر جھکائے مجرم بنی کھڑی آنسو بھری آنکھوں سے گیتا کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

"ارے بھئی کیا ہے یہ سب ۔ جاؤ تم لڑکیوں قوالی شروع کرو ۔ کوئی زیادہ چوٹ تھوڑا ہی آئی ہے اور پھیندن بوا تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو ۔ جاؤ کپڑے بدل لو جا کر ۔۔۔ اور ہاں خالدہ تم قوالی شروع کردو، میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں ۔۔۔"

جب سب چلی گئیں اور صرف ساجو رہ گئی تو اس نے کہا "ساجو دیدی دیکھنا تو ذرا میری پیٹھ ۔۔۔ آگ سی جل رہی ہے ۔" ساجو نے کرتی ہٹا کر دیکھا ایک موٹی سرخ بدھی ابھر آئی تھی ۔

"ہائے ہائے ۔ کیسا منحوس نے زور سے مارا ہے ؟" ساجو بدھی کو سہلانے لگی۔
"ساجو ۔۔۔ جب میں چیخی تو یوں تو باہر صحن میں سے بھی کئی " ادئی " کی آوازیں آئی تھیں مگر ادھر پیچھے سے مجھے ایک گھٹی ہوئی سی چیخ سنائی دی۔ کسی مردانہ آواز کی ۔۔۔ کون ہے یہاں ؟ " آخری جملہ سختی سے کہا گیا۔
ساجو کے چہرے پر ایک شوخ مسکراہٹ لہرائی ۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی، گیتا کا ہاتھ پکڑا اور دائیں طرف کی چھتی کے سامنے جو روئی کا پردا پڑا ہوا تھا اسے ذرا سا ہٹایا۔ اندر کاٹھ کباڑ کے بیچ میں تین ہیولے گیتا کو دبکے ہوئے نظر پڑے اور اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کو ساجو کے ہاتھ نے دبا دیا۔

گیارہ بجے کے بعد کہیں عورتیں اپنے اپنے گھروں کو پہنچیں۔ وہ خوش بھی تھیں اور معترض بھی، تعریفیں بھی ہو رہی تھیں اور نکتہ چینی بھی۔ جہاں نو بجے سے سناٹا ہو جاتا، کتے بھونکنے، گیدڑ چیخنے، مینڈک ٹرانے اور جھینگر گنگنانے لگتے تھے، اس رات ہر گھر میں آدھی رات تک جاگ اور چہل پہل رہی۔ عورتیں جوش میں بھری مردوں کو اپنے "ناٹک" کا حال سناتی رہیں۔ کچھ گھروں میں اس رات زیادہ رومانس لڑے۔ کچھ میں زیادہ ہنگامے ہوئے دو ایک جگہ بیویوں پر ایک آدھ ہاتھ بھی پڑ گیا جو "پڑھ لکھ کر بے راہ ہوئی جا رہی تھیں۔ یعنی پتی دیو یا مجازی خدا کے حکم کو ٹالنا چاہتی تھیں۔
ساجو اور شبراتی میں بھی آدھی رات تک جھڑپ ہوتی رہی۔ شبراتی خفا تھا کہ ساجو نے بے ایمانی کی اور ساڑھی کے وعدے سے پھر جا رہا تھا۔ مگر ساجو نے جان جوکھوں میں ڈال کر جو مہم سر کی تھی، اس کا صلہ وہ کیسے

پچھوڑ دے بھلا۔

"تو پھر تو نے گیتا بی کو کیوں دکھایا؟"

"نہ دکھاتی تو کیا کرتی؟ وہ تیرا کون سا بدھو یار چیخ پڑا تھا۔ اسی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

"تو نے کچھ بات بنادی ہوتی"

"بات بنادی ہوتی۔ بات کیسے بن سکے تھی۔ گیتا نے اپنے کانوں سے کسی مرد کی چیخ سنی اور میرا انگا پکڑا کہ بتا کون ہے۔ پھر؟ کیا کرتی؟ شکر کرو تم لوگ کہ صرف گیتا ہی کو پتہ چلا۔ ٹھاکر کو خبر ہو جاتی تو تینوں کی چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیتے اس بدمعاشی پر ——"

"اور تو کیا بچ جاتی۔ تیرا بھی تو سر مونڈ لیتے۔" شبراتی نے ہنس کر کہا۔ جانتا تھا کہ ساجو جرم میں برابر کی شریک ہے۔ ساجو بھی ہنس پڑی۔

"گیتا دیدی —— ٹھاکر سے کہہ تو نہ دیں گی؟" شبراتی ابھی تک ڈرا ہوا تھا۔

"نہیں —— ایسی بدھو نہیں۔ ٹھاکر مدرسہ ہی نہ بند کر دیں گے۔ اچھا یہ بتاؤ چیخ کس کی نکلی تھی؟ ندیم بھیا کی یا انوپ بھیا کی؟" ساجو کو بڑی فکر تھی یہ معلوم کرنے کی۔

"ارے میں کیا جانوں —— میں تو تجھے دیکھ رہا تھا مرخ میں سے۔ جانے کون سا بزدل چیخ پڑا —— یہاں اپنی بیوی کی چیخ پر بھی دل نہیں ہلتا۔" شبراتی نے سینہ پھلا کر کہا۔

"ہائے ہے —— بڑے بہادر سورما مرد ہونا۔"

"اور نہیں ہوں کیا؟" شبراتی اب موڈ میں آ گیا تھا۔

"اچھا بتاؤ میں کیسی لگ رہی تھی؟"

آہ عورت کی کمزوری۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟ کیسی لگ رہی تھی؟" جب تک

چاہنے والے کے منھ سے اپنے حسن کی تعریف نہ سن لے چین نہیں آتا۔ شاید سب سے پہلے یہ سوال اماں حوّا نے باوا آدم سے کیا ہوگا۔ اور تب سے آج تک ان کی بیٹیاں باوا آدم کے سپوتوں سے یہی سوال پوچھتی چلی آ رہی ہیں۔ شبراتی کا نرم اندازِ گفتگو، آنکھوں کی چمک، لبوں پر پریم بھری مسکان ساجو کیلئے کافی نہ تھی۔

"اری کیا کہنے تیرے۔ واہ میری رانی خوب ساس بنی تھی... بس عین مین ماں جی لگ رہی تھی" آواز دبا کے شبراتی نے کہا۔

"ہنھ ساس بنی کیا سندر لگتی۔ یہ بتاؤ ناچتے سمے جب میں نے لال لہنگا نیلی کرتی پہنی تھی اور لچکا لگی چندری اوڑھ کر، منھ پر پوڈر، سرخی ہونٹوں پر لگائی تھی ـــ اس سمے کیسی لگ رہی تھی تمھیں"

اور اب کہیں شبراتی کی موٹی عقل میں یہ بات آئی کہ ساجو اپنے حسن و سنگار کی تعریف کرانا چاہتی ہے۔

"بڑی سندر لگ رہی تھی۔ سچ۔ بس جیسے سنیما کی پری ہو عین مین"۔ اس نے ایک ہاتھ سے بیوی کی ٹھوڑی اپنی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سب سے سندر؟" ساجو کو اب بھی پورا اطمینان نہ ہوا تھا۔

"ہاں سب سے سندر۔ مجھے تو ساری عورتوں میں سب سے پیاری اپنے بچوں کی ماں ہی لگی"۔ شبراتی نے کچھ اس انداز سے ہونٹ سکیڑ کر، نظروں میں نظریں ڈال کر اور آنکھوں میں جوت جگا کر کہا کہ بچوں کی ماں "نئی نویلی دلہن کی طرح لجا گئی اور ان حیا آمیز مسکراتی آنکھوں نے کئی بوتل کا نشہ شبراتی کو چڑھا دیا۔

۱۲

گیتا روزانہ دوپہر کو خالدہ کے ہاں آجاتی تھی۔ کبھی بڑی اماں کا کوئی کام کردیتی کبھی سکینہ بیگم کا کوئی کپڑا کاٹتی یا خالدہ کو پڑھایا کرتی اور خود اپنا لکھنے پڑھنے کا کام بھی ساتھ ساتھ کرتی جاتی۔ ایک بجنے سے کچھ پہلے ہی سے اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھنے لگتیں۔ یہ وقت ابن میاں کے اندر آنے کا ہوتا تھا اور ان سے اور گیتا سے اب بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ کبھی وہ اس سے غالب، درد اور میر کے اشعار سنتے، کبھی خود سناتے، کبھی ادبی بحثیں کرتے۔ لیکن ابن میاں تنہا نہ ہوتے تھے۔ اسکول سے فارغ ہوکر ندیم ان کے ساتھ ہی اندر آتا، ساتھ کھانا کھاتا اور جب تک وہ رہتے اندر ہی رہتا تھا۔ ان کی اور ندیم کی بھی دوستی ہوگئی تھی۔ ابن میاں کو نہ صرف شعر و ادب کا ذوق تھا بلکہ خود اپنے کو وہ بڑا اچھا شاعر سمجھتے تھے اور ندیم پر اپنا کلام بلا عنت نظام لادتے رہتے تھے۔ اندر لڑکیوں کے سامنے اس بڑھاپے میں عشق و محبت کے راگ گاتے انھیں ہچکچاہٹ آتی مگر ندیم کو وہ اس دولت سے محروم نہ رکھنا چاہتے تھے اور اسے بادلِ نخواستہ ان کے عاشقانہ اور متصوفانہ کلام سے کسبِ فیض کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ ان چیزوں سے بیزار ہونے کی بجائے اپنی کھلنڈری طبیعت کی بدولت لطف اٹھاتا اور باہر دوستوں میں یا موقع ملتا تو اندر گیتا اور خالدہ کے سامنے مزے لے لے کر ان باتوں کا ذکر کرتا اور ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ جوانی اور بڑھاپے کی اس دوستی میں کیا راز پنہاں ہے؟ یہ صرف ندیم ہی جانتا تھا۔ دونوں ایک ہی ہستی کے گرویدہ تھے۔ ایک اس کے ذوقِ شعر و ادب، شائستگی، خوش بیانی اور سریلی آواز کا دلدادہ تھا تو دوسرا اس کے حسن و جوانی، خوش ادائی اور

روشن خیالی پر فریفتہ۔ ایک ہی دن دونوں کا اس سے تعارف ہوا تھا اور ایک ساتھ ہی دونوں اس سے مسحور ہوئے تھے۔

اگر کسی دن اتفاق سے گیتا نہ آسکی تو ابن میاں اندر گھستے ہی پوچھتے۔ "خلن آج گیتا بیٹی نہیں آئی" اور خالدہ محسوس کرتی کہ جو سوال ان کی زبان پر ہے وہی ندیم کی آنکھیں پوچھ رہی ہیں۔ اس کے دل میں جانے کیسی چبھن محسوس ہوتی۔ وہ کہتی "دادامیاں بلالاؤں گیتا دیدی کو؟" مخاطب دادا میاں ہوتے مگر نظر کسی اور طرف ہوتی۔ مگر ندیم کو اس کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ دو متجسس نظریں اس کے دل کی گہرائی میں جھانکتی رہتی ہیں۔

ابن میاں سے اب لڑکیاں ڈرتی نہ تھیں۔ دوپہر کو بعد کھانے کے تارا، خالدہ کبھی کبھی لتا اور گیتا سب ان کو گھیر کر بیٹھ جاتیں۔ ندیم بھی موجود ہوتا اور دنیا بھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ وہ بھی اب ان سے کھل گئے تھے اور اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں کیا کرتے۔ لیکن ان کو اس کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا کہ وہ جو لڑکیوں کے سامنے اپنے عاشقانہ شعر پڑھنا معیوب سمجھتے ہیں بے تکان موٹی موٹی گالیاں لڑھکاتے رہتے ہیں جو ان کا تکیہ کلام بن چکی تھیں بعض وقت وہ یہ دیکھتے کہ ایک دم لڑکیوں کے چہرے سرخ ہو گئے اور ندیم پریشان ہو گیا ہے، مگر بچارے کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس کی وجہ وہ خود ہیں۔ ایک بار کسی ایسے ہی موقعے پر انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیوں؟ کیا بات ہے؟ تم لوگ چپ کیوں ہو گئے؟ گیتا بیٹی کیا ہم نے کچھ کہہ دیا؟" انھوں نے اس معصومیت سے پوچھا کہ گیتا بے اختیار مسکرا پڑی اور خالدہ تو کھلکھلا پڑتی اگر دادا میاں کا خوف غالب نہ ہوتا۔ زینب بی جو کہیں قریب ہی بیٹھی پن کٹی میں پان کوٹ رہی تھیں جھلا گئیں۔ "ابن سچ مچ اب تم سترے بہترے ہو گئے ہو۔ بالکل ہوش

نہیں کہ کیا بکتے رہتے ہو۔ غضب خدا کا کنواری لڑکیوں اور جوان لڑکوں کے سامنے فحش گالیاں بکتے ہو اور پھر انھیں سے پوچھتے ہو کیا ہوا؟" اور یہ کہتے ہوئے وہ اتنے زور زور سے موسلی کو پن کٹی میں مارتی رہیں جیسے پان نہیں ابن میاں کی زبان کچل رہی ہوں۔

ابن میاں ایک دم غصے میں آپے سے باہر ہو کر دہاڑے۔" ہم — ہم گالیاں بکتے ہیں؟ گالیاں.... بھاوج — تمھارا دماغ بالکل خراب ہو گیا ہے میں اور گالی — بچوں کے سامنے — لاحول ولا قوۃ —" اور اس ایک جملے میں کئی گالیوں کی چاشنی موجود تھی یہ بھی وہ نہیں سمجھ پائے۔" خرافات — بکواس — حماقت — بدنفسی — مہمل —" وہ بکتے ہوئے باہر چلے گئے۔ زینب بی بڑبڑاتی رہیں۔ سکینہ نے منھ چھپا کر رونا شروع کر دیا اور لڑکیاں مجرم بنی سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟

اس واقعے کے بعد سے اکثر ایسا ہوتا کہ باتیں کرتے کرتے ایک دم ابن میاں رک جاتے — روانیٔ گفتار میں جیسے روڑا سا اٹک جاتا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر کوئی اور بات شروع کر دیتے۔ لاکھ چاہا مگر ستر برس کی پڑی ہوئی عادت چھوڑنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

انوپم اور ندیم کے ٹھاکر سندر سنگھ سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے۔ خاص طور پر انوپم سے وہ بہت متاثر اور مرعوب تھے۔ ہر مسئلے میں وہ اس سے مشورہ کرتے۔ اور تو اور اپنی لڑکیوں کی شادی کے سلسلے میں بھی اس کی مدد چاہتے تھے۔ انوپم انھیں بہت پسند تھا مگر اول تو غریب اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ذات میں ان سے نیچا۔ مگر جانتے تھے کہ اس کے بہت سے دوست احباب ہوں گے۔ لڑکیاں جوان تھیں اور ان کی برادری میں اتنی

عمر تک شادی نہ ہو سکنا سخت معیوب تھا۔ اور گاؤں کا ہر فرد اور خاندان کا
ہر شخص اس سلسلے میں ان سے بازپرس کرتے رہنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا جس
کی وجہ سے بچارے اور زیادہ پریشان ہوتے تھے۔ کچھ عرصے سے انوپم ان کے
گھر کے اندر بھی آنے جانے لگا تھا۔ یہ بات دادی کو ناگوار تھی۔ مگر سیتا دیوی سے
اس کی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ ادھر سندر سے بھی اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔
پہلے کملا نگر میں اس کا ذرا بھی جی نہ لگتا تھا مگر اب ہر چھٹی میں بھاگ آتا اور
انوپم نے اسے بھی اپنے ڈھرے پر ڈال لیا تھا۔ ہاں لڑکیوں کے سامنے جھیپا
جھیپا رہتا۔ وہ بڑی عمر کے لوگوں کے سامنے خوب باتیں کر سکتا تھا تقریریں
جھاڑتا تھا مگر نوجوان لڑکیوں میں بیٹھ کر جیسے اس کی زبان کوئی پکڑ لیتا۔
اور گیتا کے سامنے تو وہ اور بھی جھجکتا تھا۔ سکندر پور میں اکثر اسے گیتا کے
فقروں اور طنز کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا مگر وہاں فوراً حبیب میاں اس کی کمک
پر آ جاتے اور صفیہ ہنس ہنس کر باری باری دونوں کی طرف داری کرتیں۔ یہاں
تو کوئی بھی اس کا طرفدار نہیں ہوتا۔ ندیم ہر بات میں گیتا کا ہم زبان تھا۔ لڑکیاں
سب کی سب گیتا کی چاہنے والیاں اور سندر سنگھ تو گیتا کی ہر بات کو گیتا کا
اشلوک ہی سمجھتے۔ اس لئے وہ ان محفلوں میں زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔
گیتا اب بھی اس پر فقرے کستی مگر وہ کبھی مسکرا کر بات ٹال جاتا کبھی نہایت
آہستہ سے کوئی معقول جواب دیدیتا۔ اس کے پیچھے بھی گیتا اس کا مذاق اڑانے
یا اعتراض کرنے سے نہ چوکتی تھی۔ کبھی کبھار دبی زبان سے خالدہ مخالفت کرتی
"نہیں تو دیدی ـــ انوپم بھیا اتنے اچھے ـــ اتنے شریف تو ہیں ـــ کسی کی
طرف آنکھ تک نہیں اٹھاتے۔"

"بہت خوب شرافت کی پہچان بتائی تم نے۔ اس معیار پر تو بس تم اور

وہ ہی پورے اتر سکتے ہیں۔ جھینپو — بزدل۔" ہنس کر گیتا کہتی اور انوپم کی مخالفت کے ساتھ وہ خالدہ کو بھی احساسِ کمتری میں مبتلا کر رہی ہے اس کا اسے احساس ہی نہ ہوتا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ انوپم شاید ہی کسی عورت کے چہرے کی طرف زیادہ دیر تک دیکھتا ہو۔ لڑکیاں اس پر اسے جھینپو سمجھتی تھیں اور اس کے دوست بزدل، نامرد اور جانے کیا کیا کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ ہاں ایک ہستی اس حلقے میں ایسی بھی تھی جس کے دل میں انوپم کی عقیدت اور محبت کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ مگر تارا کی کبھی یہ ہمت بھی نہیں پڑی کہ خود اپنے دل ہی سے اس بات کا اعتراف کرے۔

ہاتھ میں تصویروں کی کچھ کتابیں، کاپیاں اور ڈرائنگ کے چھوٹے بڑے کاغذ لئے کلّو گھر میں داخل ہوئی اور تخت پر اوندھی پڑ کر تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک ٹانگ ہوا میں لہرا رہی تھی، دوسری نیچے لٹک رہی تھی۔ خالدہ دیر سے کھانا لئے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے سخت حیرت ہوتی تھی کہ کلّو جو پڑھنے کے نام سے بدکتی تھی اور دن بھر کھایا کرتی تھی اب اسکول کے کاموں میں محو ہو کر اسے کھانے کی بھی سدھ بدھ نہیں رہتی۔

"اے کلّو — اب یہ کیا ہو رہا ہے۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھالے۔" خالدہ کے لہجے میں بڑی بہن کا رعب تھا۔

"ہم نہیں آتے — تصویریں بنا رہے ہیں۔" اگرچہ وہ تصویریں ابھی اس کے تخیل ہی میں تھیں مگر اپنی اہمیت کا احساس اور ذمہ داری کا غرور لہجے سے ٹپک رہا تھا۔

"ہاں ہاں — بنتی رہیں گی تصویریں۔ کھانا تو کھا پہلے۔ میں کب سے

بھوکی بیٹھی ہوں ۔"

کلّو نے سر اُٹھا کر بہن کی طرف دیکھا۔ بھولتی ٹانگیں ٹھیر گئیں۔ بہن کا شفقت بھرا چہرہ، اور پیالیوں میں سے اُٹھتی ہوئی گرم گرم بھاپ اور اشتہا انگیز خوشبو نے بھولی ہوئی اشتہا چمکا دی۔ چہرے پر اشتیاق و بیقراری کا شوخ رنگ اُبھرا جیسے ایک شرمیلے عاشق کی طرح اس نے چھپانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئی۔ کود کر تخت پر سے کھڑی ہوگئی۔ "کیا پکا ہے آپا؟ بیسنی روٹی — آہاہا —" اور دونوں بہنیں کھانا کھانے لگیں۔

گیتا پہنچی تو دیکھا کہ کلّو کھانا کھاتی جاتی ہے اور زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر خالدہ کو سمجھا رہی ہے۔ گیتا کتاب ہاتھ میں لیئے، اپنی مخصوص جگہ پر، جہاں ڈیوڑھی نظر آتی تھی، جا بیٹھی۔

"اور کیا آپا — اوپ، بھیا کہتے ہیں بڑا مزا آوے گا — یہ جو میلے اور بزار لگیں ہیں نا آپا؟ بڑے بوڑھوں کے نا؟ ان میں مزا تھوڑا ہی آوے ہے۔ اوپ، بھیا کہتے ہیں آپا کہ بچوں کا میلہ بہت — بو — ہو — ت اچھا ہوئے ہے — اور کیا۔" کلّو جوش میں کہے جا رہی تھی۔ "ہزاروں تو دکانیں لگیں گی۔ کھلونوں کی اور کتابوں کی اور بھئی مٹھائی اور چاٹ اور چائے کی۔ جی اور کیا آپا۔ اور سب چیزیں ہم خود بیچیں گے۔ اور کیا آپا — اس میں بینڈ باجا ہوگا — اور جھنڈیاں اور ہنڈولے۔ اور ہاتھی گھوڑے —" انگلیاں چاٹتے ہوئے آخر کار اس کا جملہ ختم ہو ہی گیا۔

"کیسا میلہ موتی بیگم؟" گیتا اسے ہمیشہ اس نام سے پکارتی تھی۔ اسی لیئے تو وہ دیدی سے اتنی خوش تھی۔ لیکن کلّو نے اپنی دونوں

باہیں گیتا کے گلے میں ڈال دیں۔

"اری گندی چماری — پہلے ہاتھ تو دھولے — دیدی کی ساڑھی تو گندی نہ کر —" خالدہ نے ڈانٹا۔

"گندی تم خود — جاؤ نہیں دھوتے۔ نہیں دھوتے — اور دیدی — دیکھو یہ چماری کو بُرا کہتی ہیں۔ انوپ بھیا کہتے ہیں سب برابر ہیں۔ کوئی اونچا نیچا نہیں۔ چوڑھے چمار سب ہمارے بھائی ہیں۔ ہم جیسے ہیں۔ کیوں دیدی۔" گیتا اور خالدہ ہنس پڑیں۔ "ہاں بھئی، ٹھیک ہی کہتے ہیں تمہارے انوپ بھیا — مگر ہماری موتی بیگم بڑی صاف ستھری ہے ابھی جاکر ہاتھ دھو ڈالے گی۔"

کلّو کی آنکھیں جھک گئیں۔ آہستہ سے پلٹی، پاؤں میں سلیپر ڈالے۔ دالان کی دہلیز پہ بیٹھ ہاتھ منہ دھویا اور پھر گیتا کے پاس آکر نیچے سُر میں بولی۔

"دیدی — اب تو خفا نہیں؟"

اس بے ماں کی بچی کے سانولے چہرے پر محبت کی کچھ ایسی بھوک اور کالی آنکھوں میں، پریم کا ایسا گاڑھا رنگ تھا کہ گیتا کا جی بے چین ہوگیا۔ اس نے کلّو کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں اب آئی میری موتی بیگم۔ جانے اتنی دیر سے کہاں تھی؟ ہاں تو بی بی یہ کیسا میلہ ہو رہا ہے؟"

موتی بیگم نے پھر ساری تفصیلات شروع کردیں۔ مگر وہی جلدی جلدی پھولے پھولے سانسوں میں۔ ایک بات اِدھر کی ایک اُدھر کی۔

اور اب گیتا کی سمجھ میں آیا کہ بچوں کا جیسا فیسٹول کئی سال سے حبیب میاں سکندر پور وغیرہ میں کراتے رہے ہیں ویسا ہی پنڈت نہرو کی سالگرہ پر کلا نگر میں کیا جانا تجویز ہوا ہے۔ مگر یہاں کیسے ہوگا بھلا؟ نہ وہ سامان

نہ لوگوں میں وہ شعور اور سلیقہ۔ نہ حبیب میاں کی رہنمائی اور مدد۔ اُنھ ایک ذرا سا ناٹک کیا کرالیا کہ سمجھتے ہیں اس اُجڑے گاؤں میں سبھی کچھ کرالیں گے۔ جب مہاشے کرنے بیٹھیں گے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ کچھ نہیں دس پانچ تصویریں چپکا کر دو چار اُلٹی سیدھی دکانیں لگا کر میلے کا ڈھونگ رچالیا جائے گا — اور حبیب میاں پر یہ رعب گانٹھا جاسکے گا کہ کملانگر میں اس شان اور دھوم سے میلہ کرا دیا ہم نے۔ جانے ندیم صاحب کیسے اس حماقت کی تجویز میں شریک ہو گئے۔

گیتا ان خیالات میں محو تھی اور موتی بیگم مایوسی سے اس کا منھ دیکھ رہی تھی۔ دیدی تو ذرا بھی خوش نہیں ہوئیں۔ اس سے تو اس کی آپا اچھی — پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوئی۔ "تم بھی چلنا دیدی — آپا کو بھی بڑی اماں سے چھپا کر لے چلیں گے۔ کیوں دیدی ؟"

"ہاں ہاں ضرور — مگر یہ تو بتاؤ موتی بیگم کہ ....." گیتا نے کچھ چونک کر کہا مگر قبل اس کے کہ اس کا جملہ پورا ہو ندیم اندر آتا ہوا نظر آ گیا۔ گیتا کی بات ادھوری رہ گئی اور لکھو دوڑتی ہوئی اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"کیوں بڑے بھائی ؟ ہو رہا ہے نا میلہ ؟ ہمارا میلہ — ہے نا بڑے بھائی ؟ دیدی سمجھتی ہیں میں جھوٹ موٹ کہہ رہی ہوں — ہے نا بڑے بھائی ؟ ہوگا نا بڑے بھائی —"

ندیم نے مسکرا کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "ارے بھئی تمھاری دیدی تو بس — یونہی ہیں — کچھ نہیں سمجھتیں — کچھ بھی نہیں ؟" اس نے کنکھیوں سے گیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو گیتا کی نظریں کیوں جھک گئیں ؟ خالدہ سوچتی رہ گئی۔

ابن میاں کی طبیعت آج صاف نہ تھی۔ وہ کھانا کھاتے ہی باہر چلے گئے کہ ہدن سے بدن دبوائیں۔ کلّو نے پھر اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

"کیوں نا بڑے بھائی ۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا؟ میلہ تو ہوگا۔"

"ندیم بھائی، کلّو گھنٹوں سے بکے جا رہی ہے کہ میلہ ہوگا۔ ہمارے اسکول میں بچوں کا میلہ ہو رہا ہے۔" خالدہ نے کہا۔

"بک نہیں رہی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔

"دیکھا؟" فخر سے کلّو نے کہا اور ندیم کے کندھوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"سیدھی بیٹھ۔" خالدہ نے ڈانٹا اور کلّو نے وہیں سے اس کا منھ چڑھا دیا۔

"تو کیا واقعی آپ لوگ یہاں ۱۴ نومبر کو بچوں کا میلہ کرنے کی سوچ رہے ہیں؟" اب تک گیتا کو یقین نہ آیا تھا۔

"ہاں بھئی انوپم چاہتے ہیں کہ اب کے پنڈت جی کی سالگرہ یہاں بھی اسی طرح منائی جائے جیسے سکندرپور اور بھبوانی پورہ میں منائی تھی۔ صرف کملا نگر ہی کے نہیں آس پاس کے دوسرے دیہات کے بچوں کو بھی بلایا جائیگا اس میں۔"

"مگر یہ کوئی آسان کام ہے کیا؟"

"مشکل تو ضرور ہے۔ مگر آپ جانتی ہیں، انوپم جس کام کا تہیہ کر لے، کر کے چھوڑتا ہے۔"

"آپ بھی ان کی ڈینگوں سے مرعوب ہو گئے؟" ندیم کے منھ سے انوپم کی تعریف گیتا کو بالکل اچھی نہیں لگی۔

"وہ بچارا تو کبھی ڈینگیں مارتا ہی نہیں۔"

"خیر خیر۔ رہنے دیجئے۔ زبان سے نہ کہیں لوگوں پر رعب تو اس طرح کا ڈالتے ہیں۔ وہاں حبیب میاں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا یہاں آپ سب کو۔" گیتا کے لہجے میں طنز بھی تھا اور کچھ غصّہ بھی۔

"مگر گیتا آپ تو خود یہاں دیکھ چکی ہیں۔ دیوالی پر کتنا اچھا جلسہ وہ کرا چکا ہے۔ کیا پہلے یہ خیال بھی آسکتا تھا کہ اس اجڑے گاؤں میں ایسا شاندار پروگرام ہو سکتا ہے؟"

"اجڑے گاؤں" کا جملہ خالدہ کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ واہ یہ سیتا چچی کا جملہ اب ہر کوئی دہرانے لگا؟

"یہ تو ضروری نہیں کہ ہر کام کا سہرا انھیں کے سر باندھ دیا جائے۔ جلسے کی کامیابی میں کسی اور کا بھی ہاتھ تھا یا نہیں؟"

یہ "کسی اور" کون ہے! ندیم کیسے نہ سمجھتا مگر اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی انصاف پسندی پر اتر آیا تھا۔

"نہیں گیتا۔ یہ کامیابی انوپم ہی کی ان تھک محنت کا نتیجہ تھی۔ یوں ہم سب اس کے مددگار رہتے لیکن لوگوں سے کام لینے کا گُر۔ اور ان کے دل میں جوش اور ولولہ پیدا کرنا جیسا اسے آتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔" خلوص کے ساتھ ندیم نے کہا۔

"بعض لوگوں میں انکسار کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔" گیتا کے منھ سے نکلا اور پھر خالدہ کی طرف مڑ کر پوچھنے لگی۔ "ٹھیک ہے نا خالدہ؟"

"جانے دیدی کیوں انوپ بھیا سے خفا رہتی ہیں۔ اتنے تو اچھے ہیں بچارے۔ اور شیخی باز تو ہرگز بھی نہیں۔" خالدہ نے آخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

"خیر جلسہ کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ برا بھلا ایک ہم نے بھی کر ہی لیا"
گیتا نے کہا۔

"برا بھلا؟ واہ دیدی۔ ہمارا پروگرام ان لوگوں سے بھی اچھا تھا۔ ہائے
ندیم بھائی آپ دیکھتے تو مانتے"

ندیم کے ہونٹوں اور گیتا کی آنکھوں میں یہ مسکراہٹ کیوں لہرائی؟ خالدہ
نے تو ایسی کوئی بات کہی نہیں تھی۔

"میں تو بھئی بے دیکھے ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ مجھے یقین ہے
کہ تمہارا پروگرام ہم سے اچھا تھا۔ زیادہ دلکش، زیادہ رنگین، زیادہ دلفریب"

"بڑے بھائی — اب کوئی جلسہ ہوگا نا ان کے مدرسے میں — تو میں
تمھیں چھپا کر دکھا دوں گی — تم برقعہ اوڑھ لینا۔ پھپی کا کالا برقعہ —"

"اچھا بس بک بک نہ کر —" خالدہ نے پھر ڈانٹا۔

"بڑے بھائی — یہ آپا بہت بری ہیں — ہیں نا بری؟ یہ مجھ سے
جلتی ہیں۔ تم مجھے چاہتے ہو — پیار کرتے ہو — انھیں نہیں کرتے۔ اسی
لئے جلتی ہیں۔ ہیں نا بڑے بھائی؟" کلو نے مٹک مٹک کر چلا چلا کر
کہا اور خالدہ کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ "بدتمیز" کہتی ہوئی وہ اٹھ کر باورچی خانے
میں چلی گئی جہاں سکینہ بیگم بیٹھی اپلوں کی راکھ کرید رہی تھیں۔

میلہ کرنے کا فیصلہ دیر سے کیا گیا تھا۔ چودہ نومبر میں دن ہی کتنے باقی
تھے۔ پہلی بار، اتنا بہت سا کام، اور اتنے تھوڑے دن! سارے دوست
اور ساتھی دن رات کام میں جٹے رہتے۔ انویم، ندیم، شبراتی، نتھولال،
جمن، چودھری نرائن اور اسکول کے سارے لڑکے، دوسرے استاد۔ ان کے

علاوہ اور بھی گاؤں کے بہت سے جوان اور بڈھوں کو اس نئی وضع کے میلے سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ انوپم نے کام بھی بانٹ دئے تھے، نرائن چودھری کے سپرد دوسرے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی آؤ بھگت اور سواگت کا کام۔ لالہ بنارسی داس اپنی دکان میلے میں لگانے پر تیار ہوگئے۔ بھولا حلوائی اور نتھو کمہار نے بھی اپنی اپنی دکانوں سے میلہ کی شوبھا بڑھانے کی پیش کش کی۔ حکیم میر احسن نے جوشاندے کی دیگ پکوانے اور چوٹ پھینٹ کے لئے دوا تیار کرنے کا وعدہ کیا۔ کلو چودھری کے ذمے میلے میں گھوم پھر کر دیکھنا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات نوجوان نہ کریں۔ ٹھاکر سوہن سنگھ میلے کا افتتاح کرنے والے تھے اور ابن میاں سے بچوں کے مشاعرے کی صدارت کی درخواست کی گئی تھی جس پر بڑی مشکل سے وہ راضی ہوگئے تھے۔ اگرچہ ندیم کو اندیشہ تھا کہ وہ بچوں کی بلی، کتا، بلبل، پھول، کوئل میں اور منی، امی اور بابا، ہمارا مدرسہ، ہمارا میلہ، دادی اماں، جیسی غیر شاعرانہ نظمیں سن کر بھڑک نہ اٹھیں، اور رنگ میں بھنگ نہ ڈال دیں۔ مگر انوپم کا اصرار تھا کہ انھیں کسی طرح گھسیٹ کر اس میلے میں لانا ہے جس کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ رہے ٹھاکر سندر سنگھ تو میلے کے کارکنوں کے سرپرست، مشیر، مددگار سبھی کچھ تھے۔ انوپم اپنے ہر کام کا سہرا انھیں کے سر باندھ دیتا تھا۔

انوپم اور ندیم کی خواہش تھی عورتوں اور لڑکیوں کے کام کی نمائش بھی میلے میں ہونی چاہیئے۔ یہی نہیں ان کی دکان بھی لگے۔ مگر نہ ٹھاکر اور نہ ابن میاں اور خود ان کے گھروں کی عورتیں یہ بات سنتی تھیں اور نہ گاؤں والے یہ برداشت کر سکتے تھے کہ لڑکیاں "مردانے میلے" میں کچھ کریں۔ جس طبقے میں مرد عورت تہواروں میں خوب مل کر ناچتے اور گاتے اور دھوم مچاتے ہیں،

انھیں بھی اس کی سہار نہ تھی کہ اس "فیشن ایبل" میلے میں عورتیں "ناٹک" کریں۔ آخر سوچ کر یہ ترکیب نکالی گئی کہ میلے کے لئے بچوں کی جو فلمیں شہر سے منگائی گئی ہیں ان کے ساتھ ایک فلم "چھوٹا بھائی" منگائی جائے جس کو دکھانے کا انتظام صرف عورتوں کے لئے ہو۔ اور عورتیں یہ سن کر ابھی سے خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں کہ ہنستی، بولتی، گاتی، ناچتی تصویریں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی؟

گیتا کے مدرسے میں آج کل ہر وقت میلے کا چرچا رہتا۔ ابتدا میں گیتا نے کچھ رشک کچھ رقابت کی وجہ سے میلے سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ انوپم اتنا شاندار میلہ کر رہا ہے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ اس نے سوچا بھی کہ کیوں نہ وہ بھی اسی زمانے میں عورتوں کا مینا بازار لگائے سب لڑکیوں نے اس خیال کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ مگر جب گیتا نے اس کی مشکلوں اور رکاوٹوں پر غور کیا تو کم سے کم اس وقت یہ ناممکن نظر آیا۔ انوپم بہت چاہتا تھا کہ میلے میں گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں بھی ہاتھ بٹائیں۔ لیکن پہلے تو اس کی بات سنی ہی نہیں گئی۔ مگر خالدہ، تارا اور رساجو وغیرہ کا جوش اور شوق دیکھ کر اسے یہ بھی گوارا کرنا پڑا کہ "انوپم کے میلے" کے لئے اسی کے مرکز میں کام ہو۔ چنانچہ کاغذ کے پھولوں کے ہار، رنگین جھنڈیاں، قندیلیں، گلدستے وغیرہ اب یہاں بن رہے تھے اور بہت بحث مباحثے کے بعد یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ عورتوں کے مرکز کی دکان بھی میلے میں لگے گی مگر اس پر چھوٹی لڑکیاں دکاندار بن کر بیٹھیں گی اور بڑی عورتیں پردے کے ادھر دکان کے پیچھے رہیں گی۔ عورتوں میں اس فیصلے نے نیا جوش بھر دیا اور دن رات ایک کر کے دستکاری کا بہت سا سامان تیار کیا جانے لگا اور ایک چھوٹی موٹی دکان کو بھرنے اور سجانے کا

سامان پندرہ دن کے اندر تیار ہو گیا۔

آخر سخت انتظار کے بعد ۱۴ر نومبر کی مبارک تاریخ آ ہی گئی۔ صبح سات بجے میلے کا افتتاح ہونا اور جھنڈا لہرایا جانا تھا۔ دس پندرہ میل ادھر تک کے دیہاتی اپنے بچوں اور عورتوں کو لے کر اس نئے طرز کے میلے کو دیکھنے کے لئے اُمڈ آئے تھے۔ میلے ٹھیلے کا شوق تو ٹھیرا ہندوستانی کی فطرت میں، اور نئی چیزوں کا شوق تو سبھی کو ہوتا ہے اور اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انوپم نے اس ٹھیٹ پرانے اور جاہل ماحول میں یہ تعلیمی میلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

انوپم کا خیال ٹھیک نکلا۔ لوگوں نے بہت دلچسپی لی۔ صبح سات بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک میلے میں اس قدر چہل پہل، اتنی رونق، اتنی گہما گہمی تھی جو کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ بچے مرد عورتیں یوں جوق در جوق آ رہے تھے جیسے کسی مذہبی نہان پر یا اب یوم جمہوریت دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اس کثرت اور ہجوم کی وجہ سے کافی گرد بڑ مچی۔ کھانے پینے کی چیزوں اور چائے کی جو دکانیں بچوں نے لگائی تھیں وہ دوپہر تک ہی خالی ہو گئیں۔ البتہ بھولا حلوائی اور لالہ بنارسی داس کی دکان پر تازہ تازہ مال آتا رہا۔ جوشاندہ بہت سے بچوں اور عورتوں نے محض مزے کی خاطر پیا اور کئی بچوں کے چوٹ آئی۔ اس پر حکیم جی نے مرہم پٹی بھی کی۔ رات تک ان کی جوشاندہ کی دیگ تو خالی ہو گئی مگر ان کی شہرت آٹھ دس گاؤں ادھر تک پھیل چکی تھی۔ دیس بدیس کے بچوں کی تصویروں کی جو نمائش بڑی محنت اور کوشش سے لگائی گئی تھی، اس کی بہت سی تصویریں بچوں یا بوڑھوں نے پھاڑ کر اتار لیں۔ گیتا کی دکان جو ایک قنات کی آڑ میں صرف عورتوں کے لئے تھی ان کی قنات

گر گئی اور عورتوں نے ایسا دھاوا بولا کہ چیزیں تتر بتر ہوگئیں۔ کلو اور اس کی
دوست لڑکیاں جو دکانداری کے فرائض انجام دے رہی تھیں سخت گھبرا گئیں۔
اور یہ دیکھ کر گیتا اور ساجو قنات کے پیچھے سے نکل آئیں اور عورتوں کو
ڈانٹ کر سمجھا کر ہٹایا۔ چیزیں پھر قرینے سے لگائیں، جو گم ہوگئی تھیں ان کو صبر
کیا اور باقی چیزیں فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگیں، مگر عورتیں خریدتی بہت
کم تھیں دیکھتی زیادہ تھیں۔ بھلا اتنا فالتو پیسہ کہاں تھا ان کے پاس کہ یہ شیشے
ٹکے بلاؤس، ٹاٹ پر کڑھے تھیلے، سلمہ ستارے کے بٹوے، کامدانی کی ساڑھیاں
اور لچکا ٹھپا لگے کپڑے پہنے گڑیاں خریدیں؟ دو چار تھیلے، دو تین دوپٹے،
کچھ بٹوے، ایک دو میز پوش وغیرہ ضرور بک گئے مگر زیادہ تر چیزیں الگنی پر
لٹکی اور چوکیوں پر سجی خریداروں کو حسرت کی نظر سے تکتی ہی رہ گئیں۔ عورتیں
للچائی نظروں سے ان چیزوں کو دیکھتی، دام زیادہ ہونے کی شکایت کرتی،
تارا، ساجو اور گیتا پر فقرے کستی اور ہنستی وہاں سے کسی اور طرف آگے بڑھ
جاتی تھیں۔

بینڈ باجا پورے وقت بجتا رہا۔ ایک چھوٹا سا "ریڈیو اسٹیشن" ایک خیمے کے
اندر قائم کیا گیا تھا جہاں سے برابر کوئی نہ کوئی پروگرام گانے، بجانے، ڈراما،
کہانی، نظم وغیرہ کا نشر ہوتا اور لاؤڈ اسپیکر سے میلے بھر میں اس کی آواز
سنائی دیتی رہی۔ نوکا انتظام تو نہ ہو سکا تھا مگر جھولے، ہنڈولے وغیرہ
کئی لگے ہوئے تھے۔ بچوں کا ناٹک دوپہر کے کھانے سے پہلے رکھا گیا تھا
اور مشاعرہ تیسرے پہر کو۔ کھانا کھانے کوئی بھی نہ گیا زیادہ تر لوگوں نے
تو اپنی اپنی پوٹلیاں کھول کر ساتھ لائی روٹی بھاجی کھائی اور کچھ نے وہیں
سے کچھ خرید کر پیٹ بھرا۔ مشاعرے کے وقت اتنے آدمی پنڈال میں گھس گئے

کہ شروع میں تو کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ مگر لاؤڈ اسپیکر جو جانے کس کس شکل سے فراہم کیا گیا تھا اس وقت بہت کام آیا اور اکثر دیہاتی، آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے آنے والی آوازوں سے بھوچکا ہو کر خاموش سننے لگے۔

ابن میاں سے گیتا، خالدہ اور ندیم نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر یہ درخواست کی تھی کہ بس وہ چپ چاپ بیٹھیں رہیں گے۔ شعر پسند نہ آئیں تب بھی لاحول نہیں پڑھیں گے نہ کسی کو ڈانٹیں ڈپٹیں گے۔ چنانچہ وہ بچارے دل پر پتھر رکھے، گاؤ سے ٹیک لگائے چپ بیٹھے ان ننھے مُنّے شاعروں کو دیکھتے رہے جو بڑی شان اور اکڑ کے ساتھ ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور سامنے بیٹھے ان سینکڑوں بڈھوں اور بچوں کو غصہ بھری نظروں سے دیکھتے رہے جو مجسم اشتیاق بنے ان شاعروں کا کلام سُن رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ "آئے ہیں شعر سُننے ـــ جیسے سمجھتے ہی تو ہیں شعر ـــ کبھی ان کے باپ نے ـــ دیکھا تھا مشاعرہ ـــ ہنہ ـــ شعر سنیں گے۔ شعر پڑھیں گے ـــ" مگر شکر ہے کہ ان باتوں کا اظہار زبان سے نہیں کیا گیا۔ بچوں کو مشاعرے کی ریہرسل بار بار کرائی گئی تھی۔ شعر پڑھنے، سننے اور داد دینے کے آداب سکھائے گئے تھے جو انھوں نے بہت کامیابی مگر ضرورت سے زیادہ جوش، کے ساتھ ادا کئے۔ صدرِ مشاعرہ سے تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی جو ان کے پھڑکتے "شعروں پر بھی سر تک نہ ہلاتے تھے البتہ سننے والوں کا جوش و خروش اور اپنے مخصوص دیہاتی انداز کی داد و تحسین سے جو گاؤں والے انھیں دے رہے تھے، بچوں کا دل بہت بڑھا۔ یا پھر آخر میں ندیم کی تقریر نے انھیں خوش کیا جس نے ہندوستان کے ان "عوامی شاعروں" کی دل کھول کر تعریف کی، بہت ہمت بڑھائی اور انھیں مستقبل کے ہندوستان کے عظیم شاعر کہا۔

فلم سب سے آخر میں رکھا گیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ مرد اس وقت گاؤں میں گھومیں گے یا اسکول وغیرہ دیکھیں گے اور صرف عورتیں اور بچے فلم دیکھنے جائیں گے۔ مگر ساری اسکیم دھری رہ گئی۔ مرد عورتوں سے کم بیقرار نہ تھے کسی طرح اس پر تیار ہی نہ ہوئے کہ وہ جلسہ گاہ سے اُٹھیں اور عورتوں کے لئے جگہ خالی کریں۔ اگلے حصے میں وقت کے وقت جلدی جلدی رسیاں باندھ کر عورتوں کے لئے جگہ مخصوص کر دی گئی مگر جلد ہی وہ حصہ اناج کے بوروں کی طرح ایسا بھر گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی اور جو عورتیں رہ گئیں انھوں نے اپنے مردوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھ کر ساتھ ہی فلم دیکھا۔ "چھوٹا بھائی" سبھی کو پسند آیا۔ بچے چھوٹے بھائی کی شرارتوں پر خوش تھے۔ مرد دردانگیز مناظر پر ٹھنڈی آہیں بھرتے اور صافے کے یا انگوچھے کے پلّو سے چپکے سے آنسو پونچھ لیتے تھے اور عورتوں کی سسکیاں اور ہچکیاں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

رات کو جب لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو ہر زبان پر میلے کا چرچا تھا اور ہفتوں اس پر رائے زنی ہوتی رہی۔ تعریف بھی تنقید بھی۔ خود میلے کے منتظم اور کارکن جب بیس دن کے تھکے ہارے اور دو تین راتوں کے جاگے، سب سامان ٹھکانے سے رکھ رکھا کر صبح پانچ بجے اپنے بستروں پر لیٹے تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اگرچہ اس گڑبڑ اور ہنگامے نے ان کے لئے بڑی مشکلیں پیدا کر دی تھیں۔ پھر بھی جیسے تیسے انھوں نے اسے سنبھال لیا اور میلہ کامیابی سے ختم ہوا۔ میلے کی غیر معمولی مقبولیت، لوگوں کی کثرت اور اس ذوق و شوق سے میلے کے ہر ہر پروگرام کو دیکھنا ان کی امیدوں اور تمناؤں سے بڑھ کر تھا۔ اور تو اور گیتا تک خوش تھی اگرچہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کاہے کی خوشی ہے؟

۱۳

جاڑے کے دنوں میں سرِ شام ہی سے اندھیرا چھا جاتا تھا اور اس وقت تو خاصی رات آچکی تھی۔ زینب بی اور سکینہ چولھے کے سامنے بیٹھی ہاتھ تاپ تاپ کر ابن میاں کا انتظار کر رہی تھیں۔ توا چڑھا ہوا تھا۔ جب آگ بجھنے لگتی سکینہ اسے چمٹے سے کرید کر ایک اور اُپلا گھسا دیتی۔

کلّو اور خالدہ کب کا کھانا کھا چکی تھیں اور اب ایک ہی پلنگ پر موٹی رضائی کے اندر دبکی پڑی تھیں۔ کلّو کہانی کی فرمائش کر رہی تھی مگر ایک منٹ چپ ہوئے بغیر اپنے اسکول کی باتیں، انوپ بھیا کے قصے، بڑے بھائی کے تذکرے، یہاں تک کہ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے غائب ہو گئی اور چھوٹی سی باہیں خالدہ کے گلے میں زور سے لپٹ گئیں اور اُلجھے گھونگھریالے بالوں سے بھرا سر اس کی چھاتی پر آٹکا۔ خالدہ کچھ دیر تک اس کا سر سہلاتی رہی جب یقین ہو گیا کہ وہ سو گئی ہے تو اس کا سر تکیے پر رکھ کر اور لحاف اس کے چاروں طرف لپیٹ کر اُٹھی کہ خود بھی باورچی خانے میں جا کر ہاتھ تاپے اور سُنے کہ آج بڑی اماں اور پھپی آہستہ آہستہ کیا باتیں کر رہی ہیں؟ وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ سکینہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مگر جی جب تک ادھر سے پیام نہ آئے .... ؟" خالدہ ٹھٹک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ "ادھر کے پیام کا انتظار کیا تو لڑکا ہاتھ سے نکل جاوے گا۔ تم جانوں آج کل تو کال پڑا ہے اچھے لڑکوں کا۔ جو ہے وہ پاکستان بھاگا جاوے ہے۔ یہ صدیق کو بھی پسند ہے۔ ابن میاں کو تو بہت بھاوے ہے۔

پھر پڑھا لکھا، خاندانی ــ" بڑی اماں کا لہجہ سرگوشی سے بڑھ چکا تھا۔
"یہ تو سب ٹھیک ہے بجی مگر جب تک خود ندیم میاں کی مرضی معلوم نہ ہو۔"
خالدہ کے دل نے اتنے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا کہ خود اس کے کانوں میں اس کی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ یہ آواز پورے گھر میں گونج رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے اس نادان دل کو دونوں ہاتھوں سے زور سے بھینچ لیا۔
"دسمبر کی چھٹیوں میں صدیق آوے تو میں کہوں گی کہ وہ خود ہی بات کرے۔ کون آج کل کے لڑکے بڑے شرمیلے ہوں ہیں۔ خود ہی اپنا منگنی بیاہ کرتے پھرے ہیں!" اپنی غرض باؤلی۔ اس وقت زینب بی سارے فرسودہ رواج اور عقیدے بھلا بیٹھی تھیں۔
"نہیں نہیں۔ بھیا کا کہنا تو اچھا نہیں لگتا۔ وہ حبیب میاں سے کہیں کہ ندیم کی مرضی معلوم کریں۔"
خالدہ نے آج تک سکینہ بیگم کو اتنی بہت سی باتیں کرتے نہ سنا تھا۔
"ہاں ں ں ــ یہ تو تم نے بڑی اچھی بات بتائی۔ وہی کریں ہیں یہ کام ــــ" مگر باہر سے آتے قدموں کی چاپ کی وجہ سے ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اور خالدہ یہ محسوس کر کے کہ یہ چاپ ندیم کی ہے لپک کر پلنگ تک گئی، لحاف میں گھسی اور کلو کو اپنے پھڑکتے ہوئے سینے سے زور سے لپٹا کر اس کے سر پر بوسوں کی بارش کر دی۔
ندیم نے باورچی خانے میں گھستے ہوئے کہا۔" ابن میاں آج کھانا نہیں کھائیں گے۔ طبیعت ذرا بھاری ہے۔"
"پہلے ہی سے کہلوا دیا ہوتا۔ خواہ مخواہ جاڑے پالے میں اتنا انتظار

کرایا۔ آؤ بیٹا تم تو کھالو۔" بڑی اماں نے ندیم کے لئے پیڑھی کھسکاتے ہوئے کہا۔
ندیم پیڑھی پر مزے سے بیٹھ گیا۔ "یہ گرم باورچی خانہ اس وقت کتنا اچھا لگ رہا ہے اور پھر پھپی کے ہاتھ کے گرم گرم پھلکے اور بھی زیادہ مزا دے رہے ہیں۔"
سکینہ جلدی جلدی گرم پھلکے ڈال کر دیتی جا رہی تھیں۔
"آج کلو اور خلن کہاں ہیں؟" ندیم نے پوچھا۔
"اے خلن — خلن — اوئی سُنتی نہیں — ذرا آکر ندیم کو پانی تو پلادے۔ توبہ ہے چراغ میں بتی پڑی اور لاڈو میری تخت چڑھی۔ ابھی سے سونے کا کون سا وقت ہے؟" وہ بڑبڑانے سے باز نہ رہ سکیں۔ سکینہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔
"بچی ہی تو ہے بچی۔ دن بھر تو کام کرے ہے۔ گھر کا کام، مدرسے کا کام۔ تھک جاوے ہے۔"
"ہاں پھوپی اس عمر میں نیند آتی ہی بہت ہے۔ ہم بھی جب اس عمر کے تھے تو ایسی ہی بے فکری کی نیند سویا کرتے تھے۔" مسکرا کر ندیم نے کہا۔ خالدہ کو وہ کلو ہی کی طرح چھوٹی سی بچی سمجھتا تھا۔
"اور اب تو بچارا بڈھا پھونس ہو گیا۔" پیار بھرے لہجے میں بڑی اماں نے ٹوکا۔
"اے بڑی اماں دیکھئے — دیکھئے — سارا سر سفید ہے کہ نہیں۔" اس نے اپنے بالوں کی سفید لٹ کو چھوتے ہوئے کہا جو ہمیشہ سے ایسی ہی تھی اور اکثر اس کے ماتھے پر لٹک آتی تھی۔
سکینہ مسکرائیں۔ شاذ و نادر ہی وہ کبھی مسکراتی تھیں۔ ندیم کو خیال آیا کبھی پھپی بڑی خوبصورت ہوں گی۔

"میاں ابھی تو نہیں آیا بڑھاپا مگر آ جائے گا۔ جلدی سے بیاہ کر لو۔ اگر سارا سر سفید بھک ہو گیا تو کون لڑکی دے گا بھلا۔" اور یہ کہتے کہتے وہ جلدی سے توے کی طرف مڑ گئیں۔ کہیں ندیم ان کے دل کی بات بھانپ نہ جائے۔

"ہاں میاں سچ کہے ہے سکینہ۔ بس اب بیاہ کر ہی ڈالو۔ ماں بچاری تو ارمان لئے رخصت ہو گئیں۔ باپ کی ہی تمنا پوری کر دو۔" زینب بی نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ندیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج سب کو اس کے بیاہ کا چاؤ کیوں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے تصنع سے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"اب مجھ بڈھے کو کون بیٹی دے گا بڑی اماں۔"

"ادئی کیسی باتیں کرے ہے۔ تو منھ سے تو کہہ۔ جس کو پسند کرے اسی سے بیاہ کرانے کا میرا ذمہ۔ بھلا ایسا چاند سا لڑکا۔ کون انکار کرے گا بھلا؟" بڑی اماں کا بس نہ تھا کہ ابھی سب بات طے کر ڈالیں۔

مگر ندیم کسی خیال میں محو ہو چکا تھا۔ ایک من موہنی دلکش صورت اس کے تصور میں جگمگا رہی تھی۔ وہ بڑی اماں کی بات کا جواب کیا دیتا، ان کا جملہ پورا سنا بھی نہ تھا۔

گیتا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خالدہ کو ہو کیا گیا ہے؟ دونوں میں گہری محبت اور سچی دوستی تھی۔ اگر ماں اور بڑی بہن کی محبت اور رہنمائی سے محروم خالدہ نے اسے اپنے دل کے اونچے سنگھاسن پر بٹھایا تھا تو گیتا بھی اسے سگی چھوٹی بہن کی طرح چاہنے لگی تھی۔ اس کی ذرا سی اداسی اور پریشانی سے خود بیقرار ہو جاتی۔ ان کی پرخلوص محبت میں نہ عمر کا فرق حارج ہوا نہ قابلیت کا۔ نہ مذہب اور

کی تفریق نے اس میں کوئی رکاوٹ ڈالی تھی۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو نوں سگی بہنیں نہیں ہیں۔

مگر اب خالدہ کو کیا ہو گیا ہے؟ جیسے گیتا سے اسے کچھ کہنا ہی نہیں گیتا کو کیا وہ تو خود اپنے کو جیسے بھول گئی تھی۔ کتنی کتنی دیر گم سم بیٹھی رہتی۔ کتاب پڑھتی تو پڑھتے پڑھتے جانے کہاں پہنچ جاتی۔ کشیدہ یا سلائی کرتی تو اسے یونہی ہاتھ میں لئے کتنی دیر تک خدا جانے کیا سوچتی رہتی۔ اگر کوئی کچھ کہتا تو اول تو سن ہی نہ پاتی اور اگر سن لیتی تو یوں چونک اٹھتی جیسے کوئی چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ جنگل میں بھٹکی ہرنی کی طرح جسے کسی انجانے خطرے کا اندیشہ ہو۔ یا ہر قدم پر راستہ بھٹک جانے کا خوف ستا رہا ہو۔

تھوڑا بہت تو اس کی حالت کا سبھی کو احساس تھا۔ دادی نے دو تین بار پوچھا "خلن تجھے کیا ہوا ہے؟" سکینہ نے کئی بار اس کا ماتھا چھو کر کہا "ہاں اس کا بدن ذرا کچھ پھیکا ہے۔ شاید حرارت ہے۔" اور تو اور ندیم کو بھی خیال آیا۔ وہ اسے بالکل اسی انداز میں چھیڑتا تھا جیسے گلو کو۔ "کہئے بڑی بی آج کل کہاں رہتی ہو؟ کس فکر میں محو؟ کیا ہم لوگوں کے خلاف پھر کوئی محاذ تیار ہو رہا ہے؟" مگر خالدہ کا جواب گلابی چہرہ اور ایک کھوئی سی مسکراہٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

"تم تو روز بہ روز فلسفی بنتی جا رہی ہو اور مجھے اس طبقے کے حضرات سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" زور سے ہنس کر ندیم نے کہا۔ خالدہ نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔ اس کی بادامی آنکھوں میں یہ موتیوں کی سی چمک کیسی؟ یہ ندیم نہ سمجھ سکا لیکن جیسے ہی ندیم دوسری طرف سے آتی ہوئی گیتا کی طرف مڑا یہ موتی ذرا اشک بن کر خالدہ کے گالوں پہ لڑھک آئے جنھیں

اس نے اس ڈر سے پوچھا بھی نہیں کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

گیتا بار بار پوچھتی "خلن سچ بتا تیرا جی کیسا ہے؟ کیا رات کو نیند نہیں آئی؟ کلو نے لاتیں ماری ہوں گی۔ آنکھیں بھی سوج رہی ہیں۔ منھ تمتما رہا ہے۔ بولتی کیوں نہیں؟"

خالدہ کھسیانی ہنسی ہنس کر کہتی۔" واہ دیدی۔ خواہ مخواہ، میں تو اچھی خاصی ہوں۔" مگر یہ ہنسی وہ بے تکلف، کھلنڈری، بے ساختہ ہنسی نہ تھی جو خالدہ کی فطرت کا جزو ہے، یہ گیتا سے چھپا نہ رہ سکا۔ مگر آخر بات کیا ہے؟ خلن چھپا کیا رہی ہے؟ پریشان کیوں ہے؟ یہ اس کا ناتجربہ کار ذہن نہیں سمجھ پاتا تھا۔ ممکن تھا کہ دو چار دن میں وہ کچھ بھانپ بھی لیتی مگر تیسرے دن ہی ایک ایسا قضیہ کھڑا ہو گیا کہ گیتا سب کچھ بھول گئی۔

ایک دن مزدور کھیت سے غلہ لے کر آیا۔ ٹھاکر سوہن سنگھ باہر بیٹھے تھے انھیں بوری ہلکی معلوم ہوئی۔ انھوں نے بھولا سے باز پرس کی کہ بوری ہلکی کیسی ہے؟ بھولا نے ذرا تیکھے لہجے میں اس الزام کی تردید کی۔ ٹھاکر نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بھولا نے صفائی پیش کی تو اس کا لہجہ بھی تیز تھا۔ بھلا ٹھاکر سوہن سنگھ کو اس کی برداشت کہاں کہ یہ "کمینے" ان کے منھ آئیں۔ اُٹھ کر بھولا کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کا بھی جوان خون تھا۔ آزاد دیس کا باسی ہونے کا کچھ کچھ احساس بھی ہو چلا تھا۔ ہندوستان کی بدلتی حالت کا بھی، کتنا ہی مدھم سہی، شعور پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے میاں کی لاٹھی مضبوط پکڑ لی۔

"بس ٹھاکر بس۔ بہت ہو چکا۔ تم مار سکو ہو تو میرے بھی ہاتھ ہیں او

تم سے زیادہ تگڑے۔ اگر خیر چاہتے ہو تو.....؟

ٹھاکر نے بھولا "پرجا" کے منہ سے کاہے کو ایسی باتیں سُنی تھیں، بدحواس ہوکر اور بھی فحش گالیاں بکنے لگے۔ بھولا بھی آپے سے باہر ہوگیا: "بس ٹھاکر اب کی گالی دی تو میں بھی اپنے باپ کا نہیں جو تمھارا سر نہ پھاڑوں۔ تم ٹھاکر سہی پر ہم بھی آدمی ہیں۔ تمھارے برابر کے۔" وہ شیر کی طرح گرج رہا تھا۔

ٹھاکر سناٹے میں رہ گئے۔ اس "رذیل" کی یہ مجال، یہ ہستی؟ ٹھاکر سوہن سنگھ سے مقابلہ کرے؟ یہ آسمان کیسے قائم ہے؟ یہ زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی؟ دنیا اب "شریفوں" کے رہنے کے قابل نہیں رہی۔ شدتِ غضب اور صدمے نے ان کے اعصاب کو مفلوج سا کر دیا تھا۔

سندر سنگھ کوٹھے کے اندر بیٹھے یہ سب سن رہے تھے اور دل ہی دل میں اپنے باپ پر خفا ہو رہے تھے کہ خواہ مخواہ لوگوں سے اُلجھتے ہیں۔ لیکن بھولا کی پھٹکار سن کر ان کا ٹھاکری خون جوش کھا گیا۔ وہ غصے میں بل کھاتے باہر نکل آئے۔ دو ٹکے کے مزدور کی یہ ہمت کہ ان کی زندگی میں ان کے محترم باپ کا اپمان کرے!! وہ گالیاں بکتے بھولا پر جھپٹے۔ وہ بھی تیار کھڑا تھا اس نے ان کے دونوں ہاتھ کس کر پکڑ لئے اور ایک ٹانگ ان کی ٹانگوں میں پھنسائی تو ٹھاکر چاروں شانے چت زمین پر آرہے اور اگر چاروں طرف کے لوگ دوڑ کر بھولا کو پکڑ نہ لیتے تو وہ آج ٹھاکر کی چھاتی پر چڑھ کر شاید گلا ہی گھونٹ ڈالتا۔ دو تین آدمی کانپتے ہوئے ٹھاکر سندر سنگھ کو پکڑے ہوئے تھے اور دو تین نے بھولا کو پکڑ رکھا تھا اور سب کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ شور وغل کی آوازوں پر عورتوں نے اندر سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ دادی اندر سے کرتا کے کوسنے دیے جا رہی تھیں اور سیتا دیوی

پوری آواز سے چلا رہی تھیں۔

"ارے غضب تو دیکھو، ان کمینوں کی یہ مجال! پاؤں کی جوتی سر کو آئی۔ روٹیاں لگ گئی ہیں ان روٹیاں! موئے کم ظرف، چھچھورے۔ کھانے کو ملنے لگا نا۔ اب کاہے کو شریفوں کی شرافت، ٹھاکروں کی ٹھاکری ان کے ہاتھوں باقی رہے گی۔ اے ایشور یہ کیا ستم ہے، یہ کیا غضب ہے۔۔"

"اور کیا بہو جب ہماری زمینیں چھین کر ان کمینوں کو دیدی جاویں گی۔ ہم منگتے، وہ زمیندار بن بیٹھیں گے، وہ راجا، ہم پرجا بن جاویں گے تو یہی ہوگا اے بھگوان۔۔ کون سا پاپ کیا تھا ہم نے کہ انگریز بہادر ہمیں چھوڑ کر چلے گئے اور کالوں کی حکومت......"

"ماں جی اب تک تو یہ حال نہ تھا۔۔ یہ تو اسی سال سے ہوا کہ سب لوگ سر پر ہی چڑھ گئے بالکل۔۔" سیتا دیوی نے نہلے پہ دہلا لگایا۔

"سچ کہو ہو بیٹی۔۔" آج تک ساس بہو میں کبھی ایسا اتفاق رائے نہ ہوا تھا۔

"یہ سب ان شہر کے سر پھرے چھوکرے چھوکریوں کا کیا دھرا ہے دیکھ لیا نتیجہ برابری، ایکتا، مساوات، جمہوریت اور اشتراکیت کا۔" سندر سنگھ نے غصے میں بل کھاتے ہوئے باہر سے اندر آتے ہوئے کہا۔

"میں تو بیٹا پہلے ہی دن سے کہہ رہی تھی کہ یہ کمینے رجالوں کو پڑھانا، یہ چوڑھے چماروں کو سر پہ چڑھانا، اچھا نہ ہوگا۔ مگر مجھ ابھاگن کی سنتا کون ہے سمجھتے ہیں بڑھیا سٹھیا گئی ہے۔ اب تو لونڈے لونڈیوں کا راج ہے اس گاؤں میں اور تم بھی بہہ گئے اسی رو میں۔۔" دادی نے گیتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ششدر و حیران کھڑی یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ کل ہی کی تو بات تھی کہ دادی مہترانی کو گالیاں دے دے کر صفائی کرا رہی تھیں، تو گیتا

نے ان سے کہا تھا: "نانی ایسا نہیں کہتے۔ وہ بچاری بھی تو ہم جیسی آدمی ہے آخر —" اور انھوں نے اسے ڈانٹا تھا۔" اوہو۔ چار دن کی چھوکری مجھے سبق پڑھانے آئی ہے۔ آدمی ہے! آدمی ہے — تم لوگوں نے آکر ان سب کے چھیتے جلا ئے ہیں —"

کل پہلی بار گیتا کو پورا اندازہ ہوا تھا کہ جو زہر صدیوں سے دل و دماغ میں سرایت کئے ہوئے ہے اس کا توڑ کرنا محال ہے۔ لیکن سندر سنگھ بھی ایسے ہی کٹھور، ایسے ہی تنگ نظر، تنگ دل ہیں؟ وہ بھی اونچ نیچ چھوت چھات امیر غریب کو اسی سختی سے مانتے اور یوں ظلم توڑ سکتے ہیں؟ یہ بات تو اس نے کبھی سوچی بھی نہ تھی۔ اس نے تو ان آٹھ مہینوں میں انھیں اس رنگ میں دیکھا تھا کہ ہر اصلاحی کام میں پیش پیش رہتے۔ جو وہ کہتی مان لیتے، جو کراتی کر دیتے۔ گیتا ہی کیا انوپم اور ندیم کی اسکیموں میں دل و جان سے شریک ہوتے تھے۔ ناتجربہ کار گیتا کیسے سمجھتی کہ یہ کچے اور اوپری رنگ تھے جو ایک چھینٹے سے بہہ سکتے ہیں۔ جب تک ان کے اقتدار اور وقار پر حرف نہ آئے وہ وسیع النظر، روشن خیال، ترقی پسند سبھی کچھ ہیں۔ شاید عزت و اقتدار کی گرتی دیواروں کو اس بہانے ہی استوار کیا جا سکے! ہمدرد، مصلح، ریفارمر بن کر ہی وہ پرانی پرجا پر اپنا رعب قائم رکھ سکیں۔ لیکن جس عزت کی خاطر وہ یہ سب ناگوار باتیں گوارا کر رہے ہیں اسی کو ان کی پرجا یوں ٹھوکر لگائے؟ دو ٹکے کا آدمی یوں ان کے باپ کی اور ان کی بے عزتی کر جائے؟ یہ ان کا ہی نہیں ان کے سات پشت کا ایمان ہے۔ کیسی گیتا، کس کا انوپم، کون ندیم، کیسے حبیب میاں ان سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ آستین کے سانپ پال رہے ہیں انہیں سب کی بدولت آج انھیں یہ ذلت اٹھانی پڑی۔ سینکڑوں برس سے ان کے

عالی خاندان میں کبھی ایسی گھٹنا نہ ہوئی تھی۔ کملا نگر جیسے شانتی سے بھرپور گاؤں میں یہ زہر انہیں لوگوں نے پھیلایا ہے۔ یہ سیدھے سادے، اطاعت گزار مالکوں کی سیوا اور آدر کرنے والے دیہاتی سرکشی اور بد دماغی کیا جانیں؟ یہ ادھیکار اور حقوق کے جراثیم انہیں لوگوں نے پھیلائے ہیں۔ یہ سب حکومت کے آلہ کار ہیں ووٹ لینے کے لئے یہ سوشل سروس کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔ یہ تعلیم پھیلانے کے بہانے ہماری زمینیں دوسروں کو بخشنے کی فیاضی، یہ چھوت چھات اونچ نیچ مٹانے کا پرچار یہ سب ڈھکوسلے ہیں، دھوکے ہیں۔

ان خیالات سے سندر سنگھ کا دماغ ابل ہی رہا تھا کہ ایک اور کاری ضرب پڑی۔ خبر آئی کہ ٹھاکر سوہن سنگھ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ پچھتر برس کا سن، اور بلڈ پریشر کے پرانے مریض، اس وقت کا اشتعال بہانہ بن گیا اور بڑے میاں کے دماغ پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ اور سندر سنگھ نے اسے بھی گیتا، انوپم، ندیم حبیب میاں اور حکومت کے کھاتے میں ڈال دیا۔

واقعات کچھ ایسے اچانک پیش آئے کہ گیتا بھونچکا ہو کر رہ گئی۔ اس کا اسکول جگمگا بند کر دیا گیا۔ صدیق حسن کے ہاں مدرسہ لگانا چاہا تو وہاں بھی کوئی راضی نہ ہوا۔ ابن میاں تک نے آنکھیں پھیر لیں۔ "نہیں ہم ٹھاکر سے مخالفت کیسے مول لے سکتے ہیں۔ ہمارا ان کا پشتوں کا تعلق ہے۔ اور پھر —— میں خود کب ان چھوٹے لوگوں کو منھ لگانا پسند کرتا ہوں۔ وہ لاکھ امیر ہو جائیں، ہیں تو رذیل۔ اور ہم غریب ہونے پر بھی "شرافت" کی دولت سے مالا مال رہیں گے ان نو دولتوں کے ہاتھوں ذلت کی زندگی بسر کرنے سے مرجانا ہی اچھا ہے ——" اور گیتا حیرت سے ان کا منھ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کیا اس کا سب کیا دھرا اکارت ہو چکا؟ ساری دوستی، ساری محبت، ساری خدمت،

سارا خلوص خاک میں مل چکا، ہر کوئی چولا اتار کر اپنی اصلی شکل دکھا کر اسے دہشت زدہ کر رہا تھا۔

ادھر گاؤں میں بغاوت کی لہر دوڑ چکی تھی۔ بھولا کے بھائی اور دوست ہی نہیں گاؤں کا سارا جوان طبقہ اس کے ساتھ تھا۔ مزدوروں نے ٹھاکر کے کھیتوں میں کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جب تک ٹھاکر بھولا سے معافی نہ مانگیں گے وہ کام نہ کریں گے۔ اور پھر جب ایک بار ڈر اور رعب کا طلسم ٹوٹ جائے کچلے ذہن اور خوفزدہ دل، نڈر اور بے باک ہو جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان میں خودداری جاگ اٹھتی ہے۔ اپنے حقوق کا پالن کرنے اور مطالبے منوانے کا ولولہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب معاملہ بھولا سے معافی مانگنے تک محدود نہ رہا تھا۔ اب سارے گاؤں کے کھیت مزدور مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کی مزدوری بڑھائی جائے جو اب تک چھ آنے سات آنے روز تھی۔ ناتھولال اور شبراتی اس تحریک میں پیش پیش تھے ان کے پاس تھوڑی سی زمین بھی ضرور مگر نہ اتنی کہ سال بھر کے لئے غلہ پیدا کر سکے۔ اس لئے سال کے کئی مہینے وہ دوسروں کے کھیتوں پر مزدوری کرنے پر مجبور تھے۔ دو چار وفادار قسم کے بڑے بوڑھوں کے سوا سبھی لوگ اس تحریک میں دل وجان سے شریک تھے!

نرائن سنگھ کو اپنے شانتی سے بھرپور وضعدار گاؤں میں یہ "بغاوت" بہت ناگوار تھی۔ انھوں نے اور ان کے دو ایک اور بھائی بندوں نے لوگوں کو بہت اونچ نیچ سمجھائی اور "مائی باپ" کے حقوق کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ مگر نوجوان ان کی بات کیا سنتے الٹا انہیں کو سمجھاتے تھے کہ وہ زمانہ لد گیا۔ اب ہم بھی دیس کے ویسے ہی باسی اور برابر کے حق دار ہیں جیسے وہ ہیں۔ اور

آزاد ہندوستان میں کسی کو کسی کی بے عزتی کرنے یا زبردستی کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کملانگر کے دوسرے "شرفا" نے اگرچہ گاؤں والوں کا ساتھ نہیں دیا مگر خوفزدہ تھے کہ جب ٹھاکر سندر سنگھ جیسے بڑے آدمی کا یہ حشر ہوا تو نہ جانے ان کا کیا انجام ہوگا۔ صرف ابن میاں سندر سنگھ کے سرپرست اور حامی بنے ہوئے تھے۔ سندر سنگھ کے لئے گاؤں والوں کی حرکتوں سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس بغاوت کے سرگروہ ان کے محبوب نوجوان دوست انوپم اور ندیم تھے۔ ان دونوں کے لئے گھر بھر کے کیا جذبات تھے اس کا سمجھنا دشوار نہیں۔ انھیں دونوں گھروں میں نمک حرام، مارِ آستیں، کائیاں، باغی، رنگے سیار، سرپھرا وغیرہ کے معزز ناموں سے یاد کیا جاتا اور ملاحیاں سنائی جاتیں۔ خالدہ اور تارا ہی نہیں گیتا تک، دم بخود یہ سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کریں تو کیا؟

۱۴

عورتوں کا مرکز بند ہونے سے کملانگر کے گھروں میں عجیب اداسی اور بے کیفی سی چھا گئی تھی۔ مردوں میں تو نئی تحریک نے نیا جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔ لیکن عورتوں بچاریوں کا تو پہلے کا بھی مشغلہ چھن گیا تھا اور سب سے زیادہ اس کمی کو جس نے محسوس کیا وہ تھی ساجو۔

اس واقعے کے تیسرے دن ساجو گھر میں ٹک نہ سکی۔ آخر معلوم تو کرے کہ قصہ کیا ہے؟ کیوں گیتا بی نے سنٹر بند کر دیا؟ شبراتی منع کرتا رہا۔ "ساجو وہاں نہ جا۔ ٹھاکر کا آج کل دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جانے کیا کہہ بیٹھیں۔"

مگر ساجو نہ مانی۔ "میرا کیا کر سکیں ہیں ٹھاکر؟" اس نے سر ہلا کر کہا اور اپنی گاڑھے کی سفید چادر اوڑھ کر روانہ ہو گئی۔

ٹھاکر سُندر سنگھ ڈیوڑھی کے قریب نیم کے نیچے بانوں کی کھری چارپائی پر سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے، کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے لیٹے تھے۔ ساجو ڈیوڑھی سے دو گز ادھر ہی تھی کہ ان کی نظر اس پر پڑ گئی۔ کڑک کر بولے "کون ہے ری؟ کہاں جا رہی ہے؟"

"کوئی نہیں ٹھاکر۔ میں ہوں ساجو۔" چھوٹے سے گھونگھٹ کی آڑ سے ساجو نے جواب دیا۔

"یہاں کیوں آئی ہے؟"

"روز آؤں ہوں۔ اپنے اسکول۔" تیکھے لہجے میں ساجو نے کہا۔

"اب میرے ہاں کوئی اسکول وسکول نہیں لگے گا۔ چلی جا واپس۔" گرج کر ٹھاکر بولے۔

"میں تو گیتا بی سے ملنے آئی ہوں۔" قدم بڑھاتے ہوئے ساجو بولی۔

ٹھاکر زور سے دھاڑے۔ "نہیں تو اس گھر میں اب قدم نہیں رکھ سکتی۔ تم لوگوں کے لئے کام کر کے بہت پھل پا لیا۔ سیدھی طرح اپنے گھر چلی جا ورنہ....."

"اوہو ٹھاکر اتنا تیہا کیوں دکھا رہے ہو۔ لو میں جا رہی ہوں۔ اب کبھی پیر بھی نہ دھروں گی۔ واہ۔ وا....." یہ چیخ کر ساجو نے کہا اور پلٹ پڑی۔

"جا جا۔ اپنی اوقات نہ بھول۔ ٹکے کی....."

ساجو باقی جملہ نہ سُن سکی۔ وہ غصّے میں بدحواس دیوانوں کی طرح اپنے گھر کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ اپنے محافظ کے پاس۔ اس کے پندار کو

جو سخت چوٹ لگی تھی اسے تنہا سہارنا اس کے لئے سخت کٹھن تھا۔

اس چند ماہ میں ساجو کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ اس مختصر مدت میں اس گنوار جاہل عورت نے کیا کچھ سیکھا، کیا کچھ حاصل کیا اس کا اندازہ دوسرے تو کیا کرتے وہ خود بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جو منزلیں اور لوگ برسوں میں طے کرتے ہیں وہ اس نے ہفتوں اور دنوں میں سر کر لی تھیں۔ بیاہ کے بعد اپنی جن تمناؤں اور آرزوؤں کو دل کے کسی کونے میں دفن کر کے اپنے کو کملا نگر کی ناگوار زندگی میں کھپا دیا تھا، وہ گیتا کے آنے کے بعد چپکے سے زندہ ہو گئی تھیں۔ کچھ سیکھنے کچھ جاننے کی چاہ اس کی روح کی پیاس تھی گیتا کے آنے کے بعد جو نادر موقع اسے قسمت سے مل گیا تھا اس سے ساجو نے پورا پورا فیض حاصل کیا۔ گیتا بعض وقت اس کے ذہن کی جودت اور تیزئی طبع پر حیران رہ جاتی۔ بارہا اسے احساس ہوا کہ ساجو اس سے زیادہ ذہین ہے۔ گاؤں کی یہ ان پڑھ عورت، جس پر اپنی چھوٹی سی گھر داری کا سارا بوجھ، چار بچوں، ایک بدمزاج بیمار ساس، نکھٹو میاں کی خدمت کا بار تھا اور ساتھ ہی باہر کھیت کا کام بھی کرنا پڑتا تھا، کیسے اس تیزی سے اپنا سبق یاد کر لیتی ہے؟ کیسے ہر کتاب رات بھر میں ختم کر ڈالتی ہے؟ یہ ایک معمہ تھا۔ خالدہ، تارا، لتا کوئی بھی اتنے شوق سے نہیں پڑھتیں نہ اتنی تیزی سے نئی باتیں سیکھنے اور اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں گیتا نے بہت سے تعلیم یافتہ حضرات اور بعض ماہرین تعلیم سے یہ سنا تھا کہ جن طبقوں کی صدیوں سے ذہنی نشو و نما رکی ہوئی ہے اور جن کے دماغوں میں جہالت کا زنگ لگ چکا ہے ان کے لئے لکھنا پڑھنا سیکھنے میں بہت دشواری پیش آتی ہے۔ زنگ چھوٹنے اور ذہنوں کو صیقل ہونے میں دیر

لگتی ہے۔ پھر ماحول کا بھی تو کتنا اثر پڑتا ہے! جو بچے کم سنی سے ترقی یافتہ ماحول میں پرورش پاتے ہیں ان کے ذہن جلا پا جاتے ہیں۔ اور جو جہالت کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں ان کے دماغ بھٹس رہ جاتے ہیں۔

یہ نظریہ کہاں تک درست ہے؟ گیتا کو اس میں شبہ تھا۔ اس نے بہت سے ان پڑھ جاہل خاندانوں کے بچوں کو نہایت شوق سے پڑھتے اور تیزی سے سیکھتے دیکھا تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی اولاد کو بھٹس اور غبی پایا تھا۔ رہی ساجو اس کے بارے میں تو گیتا کا خیال تھا کہ اگر بچپن سے اسے اپنی ذہنی نشو و نما کا موقع ملتا تو خدا جانے آج وہ کیا ہوتی؟ جس نے اتنی کم مدت میں اتنا کچھ سیکھ ڈالا وہ یقیناً غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کی مالک ہوگی۔

ساجو نہ صرف روانی سے اردو اور ہندی پڑھنے لگی تھی بلکہ اس نے لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ لیکن صرف اتنا ہی نہ تھا وہ اور بھی بہت کچھ جان اور سیکھ گئی تھی، جن کو ٹھاکر سندر سنگھ اور ابن میاں تک نہ سمجھ پائے تھے۔ ہندوستان کی آزادی اور آزاد دیس کا مقام، اس کے تقاضے اور ضرورتیں ہندوستانیوں کے فرائض اور دیس پر ان کا اور دیس کا ان پر حق۔ ایک برابری کی سماج کی ضرورت۔ کسی نہ کسی حد تک وہ ان سب باتوں کو سمجھنے لگی تھی۔

مطالعے کی اسے ایسی چاٹ لگی تھی کہ روز ہی گیتا سے کوئی کتاب مانگ کر لے جاتی اور آدھی آدھی رات تک لالٹین کی مدھم روشنی میں پڑھتی رہتی۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اردو ہندی کی جتنی کتابیں چھپی تھیں وہ سب حبیب میاں نے گیتا کو بھیجی تھیں اور وہ ساری کی ساری ساجو پڑھ چکی تھی اور اب تو وہ پریم چند کے ناول اور افسانے اور دوسری آسان انداز اور زبان میں لکھی ہوئی کتابیں روانی سے پڑھ

سکتی تھی۔

اور یہ اس کی شخصیت کا جادو تھا جس نے شبراتی کو بھی دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ انوپم اور ندیم کے گاؤں میں آتے ہی سب سے پہلے جو اُن کا دوست اور شریکِ کار بنا وہ شبراتی تھا۔ سا جو اسے اپنے مقابلے میں اب بھی "جاہل" اور "اجڈ" سمجھتی تھی اور جو باتیں وہ سمجھ نہ پاتا انھیں اسے بالکل اس طرح سکھاتی جیسے کوئی استانی چھوٹے سے بچے کو پڑھاتی ہے۔ مگر اب وہ شبراتی سے اپنے بیاہ کو اپنی بدنصیبی نہ سمجھتی بلکہ خوش ہوتی کہ اس کا پتی گاؤں کے دوسرے لوگوں سے کتنا مختلف ہے اور کتنی جلدی اتنا بدل گیا ہے۔

علم کی اس روشنی نے اس کے دماغ ہی کو منور نہ کیا تھا بلکہ اس کی خودداری خود اعتمادی اور احساسِ عزتِ نفس کو بھی جلا بخشی تھی۔ جو سا جو پہلے شبراتی کی مار، ساس کی گالیاں، نند کے طعنے اور ٹھاکر اور میاں لوگوں کی باتیں، چپ چاپ سہا لیتی تھی۔ دل پر کچھ ہی بیت جائے کم سے کم ظاہر یہی ہوتا تھا۔ اب وہ ٹیڑھی نظر اور کڑوے بول کو بھی نہ سہارتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کی بھی اب اس کو ڈانٹنے یا گالی دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اسکول کی جان نثار اور سرگرم کارکن ہونے کے ناتے گاؤں ہی میں نہیں ٹھاکر اور ابن میاں کے گھرانوں میں بھی اب اس کا آدر ہونے لگا تھا۔ گیتا کی دوستی نے اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا۔ خود سا جو اب اپنے کو کسی سے بھی کم تر نہ سمجھتی اور سوا اپنی ساس کے کسی کی بھی بُری بات نہیں سہارتی تھی۔

لیکن اس وقت ٹھاکر سندر سنگھ نے اس کو جس انداز سے ڈانٹا اور جس حقارت سے بات کی اس نے جیسے اسے پہاڑ کی چوٹی سے ڈھکیل دیا۔ "کیا ہے اس کی اوقات؟ یہ کہ وہ غیر مردوں کی گالیاں کھائے؟" تیہے میں وہ

اندھا دھند دوڑی چلی جارہی تھی۔ اس کی خودداری، خود اعتمادی، اس کے خلوص اور سیوا و پریم کے جذبے کو کتنی گہری چوٹ لگی تھی کہ اس کی ٹیسیں بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ "اوقات" "اوقات" "اوقات"؟ وہ تو اپنی "اوقات" جانتی ہے۔ لیکن خود ان لوگوں کی کیا اوقات ہے؟ ہر وقت کی آنے جانے والی ساجو سے یہ بات چھپی ہوئی نہ تھی کہ یہ سارا بھرم ہی بھرم ہے ورنہ ان حویلیوں کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ دیواروں کو دیمک لگی ہوئی ہے۔ چھتیں جھک آئی ہیں۔ ذہن، دل، دماغ، جسم سب زنگ خوردہ ہو چکے ہیں۔

ڈھول کے اندر پول ہی پول ہے۔ ٹھاکر پھولے کس بات پر ہیں؟ زمینیں رہن ہیں۔ قرضے کا بار الگ ہے۔ ہم غریب ہیں۔ مزدور ہیں، پر کسی کے محتاج تو نہیں، قرضدار تو نہیں۔ کسی کا دیا تو نہیں کھاتے؟ اپنے خون پسینے کی کمائی کھاتے ہیں۔ دوسروں کا خون تو نہیں چوستے، دنیا کو دھوکا تو نہیں دیتے۔

گھر پہنچتے پہنچتے اس کا غصہ بے بسی اور صدمے میں بدل چکا تھا۔ چھوٹے بچے نے اسے دیکھ کر ضد کرنی شروع کر دی تھی۔ سب سے پہلے اس نے دھول دھول اسے مارا اور پھر زمین پر بیٹھ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ لیکن یہ یہ وقتی کمزوری تھی۔ اس کا ذہن اس وقت بھی برابر اس ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ وہ ٹھاکر کو کسی طرح یہ دکھا دے کہ اس کی "اوقات" کیا ہے؟

ساجو کی کوٹھری اب تحریک کا مرکز تھی اور خود ساجو اس کی روح رواں۔ اب یہ چند پرجوش، سر پھرے جوانوں ہی کی نہیں بلکہ گاؤں بھر کی تحریک بن چکی تھی۔ انو پم اور ندیم دونوں اپنے اپنے طور پر حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انو پم اپنے ٹھہرے ہوئے انداز میں لوگوں کو نرمی اور صبر سے کام لینے اور مضبوطی

اور ایکتا کے ساتھ اپنے مطالبے منوانے کا مشورہ دیتا تھا۔ شبراتی اور چند بڑے بوڑھے اس کے ہم خیال تھے۔ لیکن ندیم، ناتھولال، ساجو وغیرہ کو اس کا انداز ناپسند تھا۔ انوپم سمجھاتا۔ "ہنگامہ کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نقصان ضرور پہنچ سکتا ہے۔ بڑے ٹھاکر مفلوج پڑے ہیں، ہم سے آکر معافی مانگ نہیں سکتے۔ ٹھاکر سندر سنگھ سے اس کی امید رکھنا بیکار ہے وہ حکام سے پولیس کی مدد مانگیں گے تو خواہ مخواہ کشت و خون کا اندیشہ ہے۔ ہلکے پولیس والوں میں بدیسی حکومت کے زمانے سے رعونت اور ناانصافی کے جو جراثیم سرایت کر چکے ہیں وہ ابھی زائل نہیں ہوئے بھائی۔"

"ہم اپنے حق کے لئے مرنے مارنے سے نہیں ڈرتے۔ ان گیدڑ بھبکیوں کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔" ندیم نے غصے سے کہا۔

"اور ہم دکھا دیں گے ان سر پھرے مالکوں اور ٹھاکروں کو کہ ہم پاؤں تلے کی چیونٹیاں نہیں ہیں، جنھیں وہ جب چاہیں روند ڈالیں۔" ناتھولال کا منھ لال ہو گیا۔

"اور کیا۔۔۔ ان کو بھی تو معلوم ہو کہ وہ زمانہ لد چکا جب وہ من مانے ظلم توڑتے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی اب ہوش آ چکا ہے۔ ہم میں بھی اپنی عزت کا پاس، اپنے حق کا پالن کرنے کی لگن پیدا ہو چکی ہے۔ ہم ان سے دب نہیں سکتے۔۔۔ وہ ہمیں کچل نہیں سکتے اب۔" اور جب ساجو جوش میں یوں تقریر کرنے لگتی تو جانے کیوں انوپم کو سروجنی دیوی یاد آجاتی تھیں۔

"اچھا اچھا۔۔۔ بس رہنے دے اپنی قابلیت۔ آئی بڑی انوپم بھیا سے بھی بڑھ کر قابل۔" شبراتی نے بیوی کو ٹوکا۔

"انوپم بھیا کیا جانیں ان لوگوں کو۔ ان کے ظلم و ستم تو ہم ہی جانتے

ہیں۔ ہمیں پتہ ہے کہ ان کے دماغ یوں ٹھیک نہ ہوں گے۔" ساجو کے غرور کو شبراتی کی بات سے ٹھیس پہنچی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ساجو بھابی۔ پر میری بات پہ بھی تو ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ سوچو ہمارا مقصد کیا ہے آخر؟ اپنے حق، اپنی مانگیں منوانا؟ یا دوسروں کا غرور توڑنا! ہمارے مطالبے یہ ہیں ناکہ بھولا سے بڑے یا چھوٹے ٹھاکر معافی مانگیں۔ کھیت مزدوروں کی مزدوری بڑھائی جائے بیگار بند ہو۔ ورنہ ہم ان سے تعاون نہیں کریں گے۔ ان کا کام کرنا بند کر دیں گے۔" انوپم نے سمجھایا۔

"اور ہمیں یہ قبول دیں کہ گالی گفتار، تو تکار سے بات نہ کریں گے۔" ناتھو لال نے لقمہ دیا۔

"اور گاؤں کی عورتوں سے جو ان ٹھکرائنوں اور بہبیوں کا سلوک ہے وہ بدلے گا۔ عزت سے بات کی جاوے گی۔ ہر وقت بہانے بہانے ان سے جو کام لئے جاویں ہیں وہ بند ہوں گے۔ فلانی ذرا اناج پھٹک دیجو۔ ڈھمکی ذرا گھر لیپ جائیو آج ۔ اے بہو آٹا کب پیسے گی آکر۔ اے لونڈیا ۔ اپنی ماں سے کہیو آج اب تک اُپلے نہیں پاتھے۔" ساجو نے نقل کرتے ہوئے کہا۔ "اور بدلے میں جی چاہا تو موٹے اناج کی دو تین روٹیاں پکڑا دیں نہیں تو وہ بھی نہیں۔" ساجو اس غصّے اور جوش میں انوپم سے مخاطب تھی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ "کیوں کریں ہم ان کا کام؟"

"ہرگز نہ کرو۔ میں تو شروع سے یہی کہہ رہا ہوں کہ دھونس میں آکر ہرگز کسی کا کام نہیں کرنا چاہیے۔ یوں سیوا اور پریم کے ناتے انسان جو خدمت بھی کسی کی کر سکتا ہے اس سے عزت بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں۔

لیکن زبردستی بیگار کرنا تمہاری ذلت ہے۔ مگر اس کے لئے ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ نوجوانوں نے جیسے کھیت پر مزدوری کرنا بند کر دیا ہے تم عورتیں بھی اسی طرح گھریلو بیگار بند کر دو۔۔۔ ارے بھئی ہمارے پاس تو وہ بے پناہ طاقت ہے جس کا وہ لوگ مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ ہم ان کے ہاتھ ہیں۔ جب ہاتھ ہی بغاوت کر دیں تو کس کا کام چل سکتا ہے؟ وہ لوگ مجبور ہو کر ہمارے سامنے جھکیں گے۔۔ ہماری مانگیں منظور کریں گے۔"

"پر گاؤں میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو ہماری جگہ یہ کام کرنے پر تیار ہو جائیں گے" ناتھو لال نے کہا۔

"تو بھائی اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں خود ایک خیال ایک رائے ہونا چاہیئے۔ جب تک سب یہ نہ سمجھیں گے کہ اس طرح وہ صرف دوسروں کے لئے ہی نہیں اپنے لئے بھی کانٹے بو رہے ہیں تب تک کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ایسی تحریک کی کامیابی کے لئے ایکتا پہلی شرط ہے؟" انو پم چار دن سے یہی بات بار بار دوہرا رہا تھا، مگر اب تک لوگ اس اہمیت کو سمجھ نہ پائے تھے۔

"تم بے وجہ ان لوگوں کی پاسداری کرتے ہو انوپم۔ ٹھاکر سندر سنگھ کا دماغ یوں ٹھیک نہ ہوگا۔" ندیم نے دیکھا کہ ساتھیوں پر انوپم کی بات کا اثر ہو رہا ہے تو اسے ناگوار گزرا۔ "وہ اب بھی ہم لوگوں کو گالیاں دیتے اور جھوٹے الزام لگانے سے باز نہیں آتے ہیں؟"

"تو ندیم بھائی اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ وہ بزرگ ہیں۔ ان کی گالی سے ہماری عزت نہیں جاتی؟" انوپم نے ندیم کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"بس بس رہنے دو یہ باتیں۔ بزرگ بدتمیزی پر اتر آئے تو کوئی وجہ

نہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا جائے۔"

"بہت خوب، تو آپ بھی دل کھول کر ان کو گالیاں دیجیے۔ اگر آپ کے خیال میں مسئلے کا یہی حل ہے تو خدا رحم کرے اس تحریک پر۔" انوپم جھلا پڑا۔

"میں گالیاں کیوں دوں؟ میرے پاس عوام کی طاقت ہے میں انھیں دکھا سکتا ہوں کہ یہ جاگیرداری نظام کھوکھلا ہو چکا ہے۔ انھیں عوامی طاقت کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ ورنہ ہم ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔" ندیم نے انوپم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ساجو اور ناتھو لال نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور کیا بھیا۔ یہ لوگ اس طرح نہیں مانیں گے۔"

"تم غلط طریقہ اختیار کر رہے ہو ندیم۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ چند جوشیلے ناتجربہ کار نوجوان تمھارے ساتھ مل کر کچھ توڑ پھوڑ، کچھ ہنگامہ بپا کر دیں گے اور پھر ان غریبوں کو جیل میں ٹھونس دیا جائے گا اور ہمارا آندولن تباہ ہو جائے گا۔ ابھی نہ عوام آپ کے ساتھ ہیں نہ عوامی طاقت آپ کے پاس۔ ابھی تو خود کملا نگر میں ایکا نہیں۔ بغیر سوچے سمجھے ایسی باتیں کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

انوپم جانتا تھا کہ ندیم غصہ ور اور جوشیلا ہے، وہ اہنسا اور عدم تشدد کا مذاق اڑاتا اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ہر زبردستی کو جائز سمجھتا ہے۔ وہ قومی حکومت سے بدگمان ہے وہ باقاعدہ کسی پارٹی کا ممبر نہ سہی مگر اس کی ہمدردیاں ہمیشہ بائیں بازو کی طرف ہوتی ہیں۔ انوپم خود گاندھی جی کا پرستار نہ رہا تھا اور پُر امن عدم تعاون کی پالیسی پر ایمان رکھتا تھا۔ جواہر لال اس کے ہیرو تھے مگر وہ ان وفاداروں میں سے نہ تھا جس کو اپنوں میں خوبیاں ہی خوبیاں اور دوسروں میں صرف برائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ وہ خاصی سختی سے

اپنی پارٹی اور اپنے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دونوں دوست ایک ہی بات پر معترض ہوتے مگر انداز گفتگو میں فرق ہونے کی وجہ سے آپس میں جھگڑنے لگتے تھے۔ مگر آخر میں دونوں متفق ہو جاتے تھے۔ مگر ان چار ڈنوں میں دونوں کے راستے الگ ہوتے نظر آرہے تھے۔ انوپم چاہتا تھا کہ مطالبات منوائے تو جائیں مگر جھگڑا اور ہنگامہ نہ ہونے پائے۔ ندیم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے خلاف بغاوت کروانا چاہتا تھا بلکہ اس کی کوشش تھی کہ لوگوں پر موجودہ حکومت کی نااہلی، حکام کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو بھی آشکارا کر دیا جائے تاکہ اگلے الکشن میں سوچ سمجھ کر ووٹ دیں۔ دونوں میں ہر وقت بحث ہوتی رہتی، چوٹیں چلتی رہتیں۔ کچھ لوگ انوپم کے ہم رائے تھے، کچھ لوگ ندیم کے ہم نوا تھے۔ لیکن دونوں ہی ابھی یہ طے نہ کر پائے تھے کہ آئندہ قدم کیا ہوگا۔ دونوں ہی ناتجربہ کار تھے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں انوپم نے حبیب میاں کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو ملانے اور نفرت کی آگ کو بجھانے کا کام اپنی جان پر کھیل کر کیا تھا اور اس کام میں دیر سویر جو کامیابی ہوئی اس کی یاد اب بھی اسے بہت عزیز تھی۔ پھر گاندھی جی شہادت نے منافرت اور دشمنی کی آگ کو اپنے خون کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کیا تو انوپم اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں انسانیت کی محبت اور حق پر جان دینے کی تمنا کو کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔

مگر یہ لڑائی دوسرے انداز کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر سمجھداری اور حکمتِ عملی سے کام لیا جائے تو معاملہ صلح سانت سے سلجھ سکتا ہے۔ مگر ندیم یہ بات نہیں مانتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ ایسی آسان بات نہیں جیسی یہ بدھو میاں سمجھ رہے ہیں۔ اپنی صدیوں پرانی روایات اور عادات کو چھوڑنا، اپنی مراعات سے ہاتھ اٹھانا،

عوام کو ان کے حق واپس دینا زمیندار کے دل پر جس قدر شاق گزرتا ہے، اس کا اندازہ انوپم سے زیادہ ندیم کو تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈرا دھمکا کر اور ضرورت پڑے تو زبردستی سے اپنی مانگیں پوری کرانی چاہئیں۔ اس میں خلوص بھی تھا اور جوش بھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ کملا نگر کا بہی خواہ تھا۔ اور ان کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی تھیں ان کو ختم کرانے کا عزم اس کے دل میں موجود تھا۔ مگر اس کی تہہ میں اپنی ذات کو منوانے اور اپنی لیڈری کو چمکانے کی آرزو بھی چھپی ہوئی تھی۔

انوپم کی بات پر ندیم بپھر اٹھا "عوام میرے ساتھ نہیں تو کیا تمھارے ساتھ ہیں؟ کملا نگر کا ہر نوجوان دل وجان سے میرا ساتھ دے گا۔ تم انھیں کھینچ کر اسی گھسی پٹی اہنسا دھرما کی پالیسی کی طرف لے جانا چاہتے ہو جس کا طلسم مدت ہوئی ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن عوام اب اتنے باشعور ہو چکے ہیں کہ ان ڈھکوسلوں میں نہیں آسکتے۔ وہ نیند سے چونکے ہیں اور تم پھر انھیں سلانا چاہتے ہو؟ ان میں اپنے حقوق کا احساس، اپنی عزت کا پاس پیدا ہوا ہے اور تم چاہتے ہو کہ اہنسا کی افیون کھلا کر پھر خوابِ غفلت میں پہنچا دو؟ تمھارے خون میں بورژوائیت کے جراثیم ہیں۔ تم ان کے دوست نہیں دشمن ہو —— تم —— تم —— "

ندیم کا چہرہ سرخ تھا، آواز بہت بلند ہو چکی تھی۔

لیکن ندیم اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ انوپم کا منھ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ جھپٹ کر ندیم کا ٹینٹوا دبا لے گا —— چند لمحے کوٹھری میں مکمل خاموشی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو حریفانہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ انوپم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

مگر یہ لمحے گزر گئے۔ انوپم نے اپنے چوڑے ماتھے سے پسینے کی بوندیں

انگلی سے نچوڑ ڈالیں۔ اس کے سانولے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ اُبھری۔ وہ مسکراہٹ جو صرف اپنے نفس پر فتح پانے کی مسرت ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اس نے ندیم کا بازو تھاما اور دھیرے سے کہا۔ "چلو ندیم۔ تمھیں بھوک لگ رہی ہے۔ اس مسئلے پر بعد میں باتیں ہوں گی"۔

ندیم نے اُسے گھورا اور پھر ہنس پڑا۔ وہ جانتا اور مانتا تھا کہ بھوک میں اسے بہت زیادہ غصہ آجاتا ہے۔ اور دونوں شیراتی کے ہاں سے نکل کر اسکول کی طرف چل پڑے۔ اب ندیم انویم کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ابن میاں نے ایسے خطرناک آدمی کو اپنے گھر میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

۱۵

گیتا دیکھ رہی تھی کہ گھر میں ہر کسی کی نظر بدل چکی ہے۔ نانی اور مامی تو ہر وقت ہی تانے دیتی رہتی ہیں۔ سندر سنگھ نے اسے دوبدو کچھ نہ کہا تھا، مگر ان کی نظروں میں اب محبت اور شفقت کی جگہ نفرت اور غصہ نظر آتا تھا۔ لتا اور تارا تک اس سے کھنچی ہوئی تھیں۔ تارا کچھ شرمندہ سی بھی معلوم ہوتی تھی۔ بعض وقت گیتا کے پاس آکر بیٹھتی تو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا بات کرے، بس پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کریدتی رہتی اور اتنے میں ماں یا بہن کی ڈانٹ سنائی دیتی اور وہ سہم کر وہاں سے بھاگ جاتی۔ اور لتا تو ظاہر بظاہر اسے باتیں سُنایا کرتی تھی، جو گیتا پہلے خوبیوں کا مجسمہ تھی اب وہ برائیوں کی پوٹ بن چکی تھی۔ کملا نگر کی "بغاوت" کا سارا الزام گھر بھر نے انویم اور ندیم کے ساتھ ساتھ گیتا پر بھی رکھ دیا تھا۔

گیتا کے دل کے اندر لاوا سا ابلتا رہتا مگر منھ بند تھا، مرکز بند کر دیا گیا اور

وہ کچھ نہ بول سکی۔ ساجو کی ذلت کی گئی اور وہ چپ رہی۔ ندیم کو گھر سے نکال دیا گیا اور وہ بے بسی سے دیکھتی رہی۔ گھر بھر اس کا اپمان کرتا رہتا اور وہ زبان نہ کھولتی۔ گاؤں کے آندولن میں شرکت کے لئے اس کی روح بے چین تھی مگر وہ گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ گھنٹوں بت کی طرح خاموش خلا میں نظریں گاڑے بیٹھی رہتی۔ کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ خالدہ کے پاس جاتی تو اسے اپنے سے بھی زیادہ پریشان پاتی۔ ندیم کا گھر میں آنا جانا بند کیا جا چکا تھا۔ بڑی اماں سخت برہم تھیں اور سکینہ بیگم کی تیوری کے بل اور گہرے ہو گئے تھے۔ اگر ندیم کو گھر سے نکالنا ان دونوں کو بھی ناگوار گزرا تھا مگر ابن میاں کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اب سندر سنگھ کے مشیر اور سرپرست جو کچھ تھے وہی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تمھارا ذرا سا دبنا تمھاری ہی نہیں تمھاری سات پشت کی بے عزتی ہے۔

ہاں اس گھر میں گاؤں کی سب خبریں ضرور پہنچ جاتی تھیں۔ کلو ساری باتیں جو گاؤں میں سنتی خالدہ اور گیتا کو اپنے حاشیوں کے ساتھ سنایا کرتی تھی۔ الوپم کیا کہتا ہے؟ ندیم کی کیا رائے ہے؟ شبراتی الوپم کے ساتھ ہے اور ندیم کے ساتھ ساجو ہے، ساجو اب گاؤں کی لیڈر بن چکی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ خالدہ اور گیتا یہ سب سنتیں، دیکھتیں اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی مصداق بنی بیٹھی رہتیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک کچھ کم ہو چلی تھی اور صحن میں پھیلی دھوپ میں خوشگوار خنکی تھی۔ ابن میاں کھانا کھا کر باہر جا چکے تھے اور زینب بی اور سکینہ بیگم ٹھاکر سندر سنگھ کے ہاں گاؤں کے حالات پر تبصرہ کرنے اور سننے گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں صرف خالدہ تھی۔ گیتا سب کی نظر بچا کر ادھر چلی آئی۔ پہلے کچھ دیر چپ چاپ کھڑی خالدہ کو دیکھتی رہی پھر خود بھی اسی کے پاس ویسی ہی بت بن کر بیٹھ گئی۔ کلو ہانپتی ہوئی آئی۔ کتابیں تخت پر پھینکیں چاروں طرف دیکھا: بڑی اماں

اور پھپو تو نہیں ہیں ؟" ایک ہوشیار جاسوس کے انداز میں سرگوشی میں بولی۔ خالدہ
نے سر کے اشارے سے نفی میں جواب دیا۔ کلو آکر گیتا کے پاس کھڑی ہوگئی۔ "دیدی!"
گیتا نے سر اٹھا کر دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔
"دیدی کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو۔ کیا تم مجھ سے خفا ہو؟" کلو نے بھرّائی
ہوئی آواز میں کہا تو گیتا کے گلے میں ایک نمکین سا گولا آکر پھنس گیا۔ اس نے کلو کے
کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ "نہیں تو موتی بیگم ـــ تم سے کیوں خفا ہوتی۔"
موتی بیگم نے اتنی شہ پائی تو جھٹ اس کے زانو پہ چڑھ بیٹھی اور گلے میں باہیں
ڈال دیں اور کان سے منھ لگا کر بولی۔ "دیدی بڑے بھائی نے کہا ہے وہ تم
سے ملنا چاہیں ہیں۔"
گیتا کے بے رنگ چہرے پر ایک دم جیسے ڈوبتے سورج کی روشنی بکھر آئی اور
خالدہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔
"کہاں ہیں۔ بلاؤ نا۔" بے تابی سے گیتا نے کہا۔
کلو نے سر ہلا کر کہا۔ "یہاں وہ بھلا کہاں؟ دادا میاں نے منع کر دیا ہے نا
انھیں؟ بچارے انو بھیا کے ساتھ رہویں ہیں۔ ہیں نا آپا؟ دیدی دونوں بچارے
اتنی موٹی موٹی روٹیاں کھاویں ہیں۔ اور ذراسی کھاٹ پر سوویں ہیں۔ ہیں نا آپا؟"
کلو کا ہیاؤ اب کھل گیا تھا اور زبان تیزی سے چل رہی تھی۔
"تو دیدی سے ابھی کیا کہہ رہی تھی بی بی۔" خالدہ نے چاہا کہ بات پھر نئے
سے شروع ہو جائے۔
"کہاں بڑے بھائی نے کہا ہے انھیں دیدی سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔
کہا ہے کہ وہ آکر ان سے مل لیں۔"
"کہاں؟" خالدہ نے سہم کر پوچھا۔

(Mahja)

"یہ میں کیا جانوں؟ دیدی کیا اب بڑے بھائی کبھی یہاں نہ آویں گے۔"
دُکھی ہو کر کلّو نے پوچھا۔

اتنی دیر میں گیتا کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"موتی بیگم تم میرا ایک پرچہ ندیم صاحب کو لے جا کر دے دینا، مگر دیکھو کسی کو معلوم نہ ہو۔ اور چپکے سے ساجو کے پاس چلی جانا اور کہنا — نہیں۔ اسے بھی پرچہ ہی دیدینا — دوگی نا؟"

"ہاں — ضرور" مستعدی سے کلّو نے کہا۔

"اور کسی کو خبر تو نہیں ہوگی — نہیں تو پھر ....." گیتا نے سمجھانا چاہا مگر کلّو نے بات کاٹی۔

"میں جانوں ہوں دیدی۔ نہیں تو دادا میاں اور ٹھاکر تمھیں بھی ماریں گے گھر سے نکال دیں گے — بڑے بھائی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے دیدی۔ یہ سب دھنوان — سرمایہ دار — سب۔ بڑے ظالم ہوں ہیں دیدی۔ بڑے کٹھور — بوزا — سب کو ماریں ہیں — سب کا حق چھینیں ہیں — دیدی حق کیا ہوہے؟ بوزا کسے کہیں ہیں؟ سرمایہ دار کون ہے دیدی ٹھاکر نا؟" ایک ہی سانس میں کلّو نے یہ سب کہہ ڈالا اور اس ذرا سی بچی کے منھ سے یہ باتیں سن کر اور پھر اس بھولے پن سے ان کا مطلب پوچھنے پر بے اختیار گیتا اور خالدہ کو ہنسی آگئی۔ اور اس بے ساختہ ہنسی نے پتھر کی مورتیوں میں جان ڈالدی۔ گیتا کھڑی ہوگئی اس کے چہرے پر عزم اور آواز میں خود اعتمادی تھی۔

"کلّن — سورج ڈوبنے کے بعد — میں تم سے ملنے ادھر آؤں گی — تم مجھ سے ملنے۔ اُدھر آنا — ہم دونوں گھر سے باہر گلی میں مسجد کے پچھواڑے ندیم اور ساجو کا انتظار کریں گے — مگر — بڑی اماں یا سکینہ پھوپی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہو۔

کلو کو ساتھ لے لینا ۔۔۔"

"اچھا دیدی" خالدہ بس اتنا ہی کہہ پائی ۔ وہ ندیم کو دیکھ سکے گی ، اس
خیال ہی سے دل میں مسرت کی لہریں اُٹھنے لگی تھیں ۔ مگر ساتھ ہی اس خوف سے
کانپ بھی رہی تھی کہ کسی کو پتہ چل گیا تو ؟

اور کلو اپنی اتنی اہم ذمہ داری کے احساس سے اپنی ہی نظروں میں بہت
بڑی اور اہم ہستی بن چکی تھی ۔

نکلتے جاڑے کا زمانہ ، چار گھڑی دن ہی سے شام ہونے لگتی اور سورج ڈوبتے
ہی اندھیرا چھا جاتا ۔ ابھی سات بھی نہ بجے تھے کہ رات کی سیاہ چادر نے کملا نگر کو
ڈھانپ لیا ۔ سردی کئی دن سے پھر چمک آئی تھی اور آج تو کہرا ایسا پڑ رہا تھا کہ
چند گز فاصلے کی چیز بھی دکھائی نہ دیتی تھی ۔

دالان کے دروازوں پر روئی کے پرانے پردے سردی کی شدت کا مقابلہ
کر رہے تھے ۔ اندر کے دالان میں ٹھاکر موہن سنگھ بے سدھ چارپائی پر پڑے
تھے اور ان کی پٹی کے پاس سرکیوں کے مونڈھے پر سندر سنگھ دونوں ہاتھوں سے
اپنا سر تھامے کسی سوچ میں کھوئے ہوئے بیٹھے تھے ۔ ان کی ماں جو کئی رات
کی جاگی تھیں برابر کھٹولے پر پڑی سو رہی تھیں ۔ دالان کے دوسرے سرے پر
سیتا دیوی بانوں کی چارپائی کے نیچے مٹی کے کونڈے میں اپلوں کی دبی آگ
رکھے رضائی میں دبکی دبکائی آہستہ آہستہ چھالیا کاٹ رہی تھیں ۔ تارا اور لتا
رسوئی میں تھیں ۔

گیتا دوسرے دالان سے باہر نکلی ۔ اپنی پرانی شال کو زور سے اپنے گرد
لپیٹا ، پردا اٹھا کر دالان میں جھانکا ، ایک قدم آگے بڑھایا مگر پھر پیچھے ہٹ گئی

اور رسوئی گھر کی طرف بڑھی۔ ذرا دیر وہاں کھڑی رہی کہ شاید دونوں بہنوں میں سے کوئی کچھ کہے، کچھ پوچھے لیکن لتا کا چمچہ زور زور سے کڑھائی میں چلتا رہا اور تارا سر جھکائے پوریاں بیلتی رہی۔ گیتا نے آخر خود ہی کہا۔

"تارا میں خالدہ کے ہاں جا رہی ہوں ــــ ماموں پوچھیں تو بتا دینا۔"

حالانکہ ماموں نے ان پانچ دنوں میں ایک بار بھی اسے نہ پوچھا تھا۔ نہ بات کی تھی۔ نہ اس کی طرف نظر اٹھائی تھی۔

کسی سے کوئی جواب نہ ملا اور گیتا آہستہ سے باہر نکل آئی۔ جیسے ہی اس نے دیوار کا تختہ ہٹایا تو کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اور گیتا نے محسوس کیا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی ہے۔ وہ کیوں کانپ رہی ہے؟ کیا خوف سے؟ مگر کس کا خوف؟ کیسا خوف؟ وہ کیا کسی سے ڈرتی ہے؟ پھر ــــ کیا وہ مسرت کے جوش میں کانپ رہی ہے؟ مگر ــــ مسرت؟ مسرت کس بات کی؟ کتے نے اسے پہچان کر بھونکنا بند اور دم ہلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے چمکار کر آگے بڑھی۔ نہیں برف میں جھلی یہ سرد ہوا اسے کپکپا رہی ہے۔ اس نے اور زور سے شال کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔

وہ آہستہ آہستہ مسجد کی پشت کی طرف بڑھی تو دو سائے سر اور منھ لپیٹے اس کی طرف لپکے۔ لمبا سایہ بیقراری سے بڑھا مگر دو قدم پر ٹھٹک کر رک گیا۔ دوسرا سایہ جھپٹ کر اس سے بغلگیر ہو گیا۔ ساجو کی دونوں باہیں گیتا کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ اور ندیم کھڑا بری بری نظروں سے ساجو کو گھور رہا تھا۔ وہ جوش جذبات میں کچھ بول نہ سکا۔ مگر ساجو نے تیزی سے باتیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن اندھیرے کے باوجود ندیم نے یہ دیکھ لیا کہ گیتا کی نظریں ساجو کی اور نہیں اس کے چہرے کی طرف ہیں۔

"ساجو بھابی آہستہ آہستہ" ندیم نے ٹوکا۔ اور تینوں کچھ اور اُدھر ہٹ آئے۔
اب وہ عین مسجد کی پشت پر تھے۔ یہ دو گز چوڑی گلی تھی۔ اور اسی میں صدیق حسن کے گھر کے چھوٹے کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ایک بند کئے، خالدہ کلو کا ہاتھ پکڑے کھڑی کانپ رہی تھی۔ ٹانگیں جیسے سُن ہوگئی تھیں عین وقت پر ہمت نے جواب دیدیا تھا اور وہ باہر نہیں آسکی تھی۔ ندیم مسجد کی دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا اور اندھیرے اور کہر کے باوجود خالدہ کو اس کا لانبا قد اور چمکدار آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔ اگرچہ ساجو اور گیتا کی جو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھیں پشت خالدہ کی طرف تھی۔ مگر تینوں کے تیز تیز چلتے سانسوں کی آواز خالدہ کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اپنے دل کی کھٹ کھٹ بھی۔
"آپا چلو نا باہر" کلو نے خالدہ کا ہاتھ کھینچا۔
"نا — نا — کلو — ہم یہیں سے باتیں سن لیں گے" خالدہ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ اور منھ پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کی تاکید کی۔
آدھ گھنٹے تک یہ تینوں باتیں کرتے رہے اور خالدہ چپ چاپ سُنتی رہی اس امید پر کہ کہیں شاید اس کا بھی کوئی ذکر آجائے۔ کوئی اُس کا نام بھی لے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ لوگ اس کے وجود کو بھول گئے ہیں۔
گیتا کی تجویز یہ تھی کہ حبیب میاں کو یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے بلایا جائے۔ مگر ندیم اس سے متفق نہیں ہوا بلکہ یہ کہتا رہا کہ وہ بہت مصروف آدمی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے جھگڑوں کو خود نبٹائیں۔ ہر معاملے میں انھیں گھسیٹنا ہماری نااہلی ثابت کرے گا۔
"مگر پھر — پھر ہوگا کیا؟" پریشان ہو کر گیتا نے پوچھا۔

"اگر ہم نے ظلم و ناانصافی کے سامنے سر نہ جھکایا تو فتح ہماری ہوگی۔"

"مگر آخر ——"

"یہاں اتنا موقع نہیں کہ ساری باتیں بتائی جاسکیں۔ تم کل صبح مدرسے آؤ تو پھر اس مسئلے پر ہم سب مل کر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ ڈرتی تو نہیں ہو؟" ندیم نے بے خیالی میں بجائے آپ کے تم کہہ کر گفتگو شروع کردی تھی۔ گیتا کو اس وقت اتنا ہوش کہاں تھا کہ اس کا خیال کرتی۔ مگر خالدہ اس پر چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

"نہیں ڈرتی تو نہیں ہوں" کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ گیتا نے کہا۔ "مگر سوچتی ہوں کہ ماموں نے روکا تو؟"

"اگر تم خود فیصلہ کرلو تو کون تمھیں روک سکتا ہے؟ وہ تم پر کیسے زبردستی کرسکتے ہیں بھلا؟ تم کوئی جاہل، دبو، قدامت پرست مخلوق تو ہو نہیں جسے وہ دبا اور کچل سکیں۔ تم چاہو تو ایک جھٹکے میں ان ساری زنجیروں کو توڑ سکتی ہو۔" ندیم پر وعظ و نصیحت کا موڈ طاری ہوچکا تھا۔

خالدہ کو اپنے دل میں سوئی کی باریک نوک ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ "یہ دبو گھسو، جاہل، قدامت پرست مخلوق" کون ہے؟ وہی تو نہیں؟۔

"میں —— تو —— ندیم صاحب —— میرا تو بڑا جی بیقرار ہے کہ یہاں سے نکل کر آپ لوگوں کے ساتھ آملوں اور کام کروں —— مگر —— مشکل یہ ہے...." مگر گیتا کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ساجو جوش میں آچکی تھی۔

"گیتا بی —— ٹھاکر نے ہمارا مدرسہ بند کردیا —— یہ تمھارا ایمان ہے، میرا ایمان ہے، گاؤں کی ہر عورت کا ایمان ہے —— وہ کون ہوتے تھے ہمارا سیوا اور پریم کا مندر ڈھانے والے؟ ہم —— ہم کیا ایسے گئے گزرے ہیں۔

اتنے کائر — کہ چپ چاپ یہ انیائے سہہ لیں؟ نہیں گیتا نہیں۔ ہمارا ودرسے پھر شروع ہونا چاہیئے — ہمیں ٹھاکر کو دکھا دینا ہے کہ ہم دبیں گے نہیں۔ ہم آزاد بھارت کی عورتیں ہیں — غلام نہیں — باندیاں نہیں —"

یہ ساجو بول رہی ہے؟ وہی ساجو جو چند مہینے پہلے خالدہ کے ہاں بیگار کیا کرتی تھی! وہ ساجو جو بڑی اماں اور سکینہ پھوپی کی دس بری بھلی باتیں سہہ جاتی تھی! دو چار اُلٹے سُلٹے لفظوں سے زیادہ پڑھ نہ پائی تھی؟ یہ وہی ساجو ہے کیا؟ یہ گاؤں کی اُجڈ، گنوار، جاہل، دبو گھسو، قدامت پرست، مجبور مخلوق اور اس میں یہ جان، یہ اُمنگ! یہ جرأت کہاں سے آئی؟ خالدہ حیرت کا مجسمہ بنی سوچ رہی تھی۔ خود گیتا کو بھی ساجو کے اس نئے روپ نے مسحور سا کر لیا تھا۔ ساجو جسے خود اس نے بنایا ہے اتنی نڈر اور باہمت اور وہ خود؟

"ساجو دیدی — کل دوپہر میں تمہارے گھر آؤں گی — ضرور۔ آؤں گی"

اور اس کے اس ایک جملے نے ندیم کو بتا دیا کہ اب گیتا نے وہ سب زنجیریں توڑ ڈالنے کا عزم کر لیا تھا جنھوں نے انجانے میں اسے جکڑ لیا تھا۔

"اچھا ندیم بھیا اب چلو۔ کہیں ٹھاکر کو پتہ چل گیا تو گیتا بی کے لئے مشکل ہو جائے گی" ساجو نے چلنے کی جلدی کی۔ خود اسے بھی تو ڈر لگ رہا تھا کہ ندیم کے ساتھ زیادہ رات گئے تک باہر رہنا کہیں شبراتی کو بُرا نہ لگے۔ وہ دس سالہ شادی شدہ عورت، مرد کی فطرت کو خوب سمجھتی تھی اگرچہ ندیم اور گیتا کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا۔

"اُنھ — اب میں کسی سے نہیں ڈرتی، ساجو دیدی —" غرور کے ساتھ سر اُٹھا کر گیتا نے کہا۔

"نہیں نہیں — ایسی نادانی کی بات نہ کرو۔ اس طرح وہ تمھیں بدنام کرسکیں ہیں۔" ساجو نے سمجھایا۔

"بدنام؟ مجھے؟ کس کی مجال ہے؟" جھلا کر گیتا نے کہا۔ ساجو نے جلدی سے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نادان بچی۔ آہستہ بول۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اب ہم چلیں۔" ندیم جانے کو مڑا اور پھر پلٹا۔ "ہاں۔ خالدہ کیسی ہے؟"

اور خالدہ کا یہ سن کر رواں رواں جوشِ مسرت سے کھڑا ہو گیا۔

"خالدہ بچاری پر ان باتوں کا بڑا اثر ہے۔ خاص کر آپ کے گھر سے چلے جانے کو اس نے بہت محسوس کیا ہے۔ مگر وہ غریب تو زبان بھی نہیں ہلا سکتی۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ اس کے سینے میں ایک بہادر دل ہے۔ مگر اس ماحول نے اس کی ساری خصوصیات کو کچل کر رکھ دیا ہے۔"

خالدہ کو ان جملوں میں اپنی تعریف نہیں ذلت نظر آئی۔ یہ اس کی خوبیوں کا اعتراف نہیں۔ اس کی محرومیوں اور بدنصیبیوں کا اعلان ہے۔ اور بے بس غصہ پانی بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑا۔

گیتا اتنی خودسر! ایسی دیدہ دلیر!! یہ تو گمر میں کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ شریف گھر کی کنواری لڑکی یوں بے کہے سنے دن دہاڑے، منھ کھولے گھر سے نکل جائے؟ گاؤں کی تاریخ میں انوکھا واقعہ تھا۔ گیتا کا یہ قدم صدیوں کی روایات کو ٹھوکر مار کر پرکھوں کا اپمان تھا۔ ٹھاکر سندر سنگھ، ابن میاں اور دوسرے "شرفا" کا تو غصے سے جو بھی حال نہ ہوتا کم تھا۔ خود گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی ناراض تھے۔ بھلا ایسا بھی کبھی ہوا تھا کہ ٹھکرانیاں یوں منھ کھلے گلیوں میں اکیلی نکلیں؟

سچ مچ آج کل کے چھوکرے چھوکریوں کے دماغ پھر گئے ہیں۔ ان لوگوں کو ٹھاکر سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

گیتا کے لئے اپنے ہاں سے ساجو کے گھر تک کا سفر ـــ اچھا خاصا مرحلہ ہو گیا۔ راستے میں ہر کوئی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور پھر یوں گھبرا کر، اور متنفر ہو کر منھ پھیر کر بڑبڑاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا جیسے گیتا ایک ایسی مجرم ہے، جس کے سائے سے بھی بھاگنا چاہیے۔

ابھی دھوپ کوٹھے کے منڈیر سے نیچے نہیں اتری تھی اور ساجو گھر کے کاموں سے فارغ نہ ہونے پائی تھی کہ گیتا اس کے ہاں پہنچ گئی۔ شبراتی آج کھیت پر نہیں گیا تھا اور گھر میں بیٹھا بان بٹ رہا تھا کہ سامنے گیتا کو کھڑا دیکھ کر بوکھلا اُٹھا۔

"ائے ائے ـــ دیدی ـــ تم؟ تم یہاں کہاں؟ اے ساجو ـ اری ساجو۔ دیکھ تو کون آیا ہے ـــ" اور یہ کہہ کر وہ خود کوٹھری میں گھس گیا۔ کئی بار گیتا سے مل چکنے کے باوجود وہ اس سے شرماتا تھا۔

گیتا سر پکڑ کر اسی کھاٹ پر دھم سے بیٹھ گئی جس سے شبراتی اُٹھ کر گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے پہاڑ کی کوئی اونچی چوٹی سر کر کے آئی ہو۔ حلق میں کانٹے، ہونٹوں پر پپڑیاں اور چہرہ بے رنگ۔ روایات کی زنجیروں کو توڑنا اور رواج کی گھاٹیوں کو طے کرنا اتنا سہل نہ نکلا جیسا وہ سمجھ رہی تھی۔

لیکن یہ وقتی کیفیت تھی ـ ساجو نے اسے سپھا چھ پلائی۔ اپنے پلنگ پر لٹا دیا اور گھنٹہ بھر تک اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اپنے چھوٹے بچے کو اس کی گود میں دے دیا اور کچھ دیر میں گیتا بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔

دوپہر کو ساجو کی کوٹھری میں تحریک کے سب "لیڈر" جمع ہو گئے ـــ ندیم،

انویم، بھولا، ناتھولال، شبراتی، ساجو، گیتا اور ماں موتی بیگم جو صبح سے گیتا کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور مدھو جو یہ سن کر کہ دیدی ساجو کے گھر آئی ہیں بغیر دادا سے پوچھے سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آئی تھی، سبھی شبراتی کے صحن میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ بہت سی باتیں بتائی اور سمجھائی گئیں اور اب یہ مسئلہ چھڑا ہوا تھا کہ عورتوں کا مرکز کہاں کھلے اور کب؟ ساجو کا مطالبہ تھا کہ اور سب تو ہوتا رہے گا مگر اس کا "مدرسہ" فوراً شروع ہونا چاہیئے۔ ندیم کا کہنا تھا کہ اس وقت دوسرے بہت سے اہم کام درپیش ہیں اس لئے مدرسے کا مسئلہ فی الحال ملتوی کر دیا جائے۔ جب اور سب مسئلے حل ہو جائیں گے تو پھر مدرسہ بھی شروع ہو جائے گا۔ اس کی آخر ایسی جلدی کیا ہے؟ پہلے یہ سامراجی قلعہ فتح ہو جائے جسے قدامت پرستی کی گہری خندق نے ناقابلِ عبور بنا رکھا ہے۔ انویم اور گیتا کے سوا اور دوسرے لوگ اس کی لمبی تقریر کا بس اتنا ہی مطلب سمجھ پائے کہ پہلے ہماری مانگیں منظور ہو جائیں تب مدرسہ کھلے گا۔ لیکن ساجو اور دوسری عورتیں مصر تھیں کہ نہیں مدرسہ ابھی کھلے اور مرد ندیم کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ گیتا گومگو کے عالم میں تھی۔ بات ساجو بھی ٹھیک کہتی ہے اور ندیم کا کہنا بھی کچھ غلط نہیں۔ دو چار دن کی دیر سویر سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اتنے عرصے سے انویم خاموش سب کی باتیں اور ندیم کی تقریریں سن رہا تھا۔ اب پہلی بار اس نے زبان کھولی۔ "ساجو بھابی ٹھیک کہتی ہیں۔ اور سب کام بھی ہوتے رہیں گے مگر ان کا سنٹر فوراً دوبارہ کھلنا چاہیئے۔ یہ کام تو بنیاد ہے ہمارے سارے منصوبے کی۔ عورتوں میں علم کی روشنی پہنچانا۔ ارے یہ تو ہمارا سب سے بڑا آدرش ہے۔ اس کے بغیر تو ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

وہ اس تھوڑی سی مدت میں کملا نگر کی عورتوں نے اس ودیا مندر سے

جتنا کچھ سیکھا اور علم کی روشنی سے جس طرح اپنے دل اور دماغوں کو روشن کیا وہ ہمارے لئے خود ایک شمع ہدایت ہے۔ ان میں سیکھنے کی لگن، جاننے کا شوق، اپنے کو پہچاننے کا جذبہ جو ابھرا ہے وہ ایک چمتکار سے کم نہیں۔ اسی دیپک کی جوت میں تو انھوں نے اپنا راستہ ڈھونڈا ہے اور آج ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے آندولن میں ساتھ دے رہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا مطالبہ فوراً مان لیں اندر" انوپم حسبِ عادت ہندی، اردو اور فارسی کے لفظوں کو گڈمڈ کر کے اپنے خیالات کو ظاہر کر رہا تھا۔

" انوپم تم بھول رہے ہو کہ دوسرے کام زیادہ اہم ہیں اور ان میں بھی ہیں قدم قدم پر عورتوں کی مدد کی ضرورت پڑے گی" ندیم نے تلخ لہجے میں کہا۔

" ندیم بھائی کیا وہی غلطی آپ بھی نہیں کر رہے جو دوسرے کرتے ہیں؟ ہمارے بزرگ، جن سے ہمارا اختلاف ہے، وہ بھی تو یہی کہتے ہیں۔ ہم زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں کہ گاؤں والوں کا نفع نقصان کس بات میں ہے۔ اس بہانے ہی تو وہ حقوق مارتے اور مطالبات ٹھکراتے ہیں کہ ابھی اور کام کرنے ہیں۔"

" یہ تم بک کیا رہے ہو؟ ہمارا تو آدرش ہی یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر ہر عورت کو سچی اور پوری آزادی حاصل ہو۔ ان میں علم پھیلے، عمل کا موقع ملے اور اس مقدس کام کو ہم نے اپنی محبوب بستی کملا نگر سے شروع کیا ہے۔" ندیم کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔

" تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے عورتوں کا مرکز فوراً کھلنے پر؟" گیتا نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

" مجھے؟ میں؟ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے — مگر خود آپ کے لئے مشکل ہو گی —" ندیم ہکلانے لگا۔

"نہیں — میں بالکل تیار ہوں۔ آپ آج ہی سے کام شروع کر سکتے ہیں۔" گیتا نے جواب دیا اور ندیم کو دھچکا سا لگا کہ گیتا اس کے بجائے انوپم کی ہم رائے ہے۔

"مگر آخر مرکز کھلے گا کہاں؟ نہ ٹھاکر کے ہاں کھل سکتا ہے نہ ابن میاں کے ہاں۔" ندیم نے ہارے ہوئے جواری کی طرح جھلا کر کہا۔

"تو کیا ضرور ہے کہ بڑے لوگوں کے گھروں ہی میں مدرسہ لگے۔" ساجو نے تیزی سے جواب دیا۔ "چودھری نرائن سنگھ کے ہاں کھل سکے ہے۔ میرے گھر میں کھل سکے ہے۔ نہیں تو اپنے مدرسے میں کھول لو۔"

"ہاں بھابی یہ تو ٹھیک ہے۔" انوپم نے ساجو کی ہاں میں ہاں ملائی — "چودھری کے ہاں تو شاید مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ ابھی وہ رستے میں ملے تو لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے چپ چاپ چلے گئے، تمہارا گھر ذرا چھوٹا ہے گا شاید، مگر ہمارے مدرسے میں دوپہر کے بعد عورتوں کا مرکز کھل سکتا ہے۔ چار بجے تک وہ ختم ہو جائے گا تو پھر دوسرے کام ہو جایا کریں گے۔"

گیتا کے سامنے جو لاحل مسئلہ تھا وہ دم کی دم میں حل ہو گیا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ "بہت ٹھیک۔ بہت مناسب۔ بس ایک بجے سے چار بجے تک ہم وہاں کام کریں گے۔ پھر آپ کا مدرسہ خالی کر دیا کریں گے۔" اور مسرت کے جوش میں وہ یہ بھول گئی کہ وہ اپنے دوست ندیم کی مخالفت اور اپنے حریف انوپم کی حمایت کر رہی ہے۔

"جیسا آپ لوگ مناسب سمجھیں۔" ناگواری سے ندیم نے کہا۔ "مگر یہ سمجھ لیجئے کہ ٹھاکر سندر سنگھ اس بات کو یوں مشہور کریں گے کہ ہم نے ان کی بھانجی کو بہکا لیا ہے اور ——" اور یہ کہتے وقت شاید اسے یہ دھیان نہ رہا کہ ٹھاکر سندر سنگھ کی بھانجی

کو "بہکا سکھا" کر یہاں آنے اور تحریک میں حصہ لینے پر رات ہی اس نے آمادہ کیا کہ۔
لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گیتا کی آواز گونجی۔
"ٹھاکر سندر سنگھ کو، آپ کو ــــ اور سب کو یہ بات معلوم ہوجانی چاہیئے کہ
ان کی بھانجی، ان کی جائداد یا املاک نہیں۔ وہ خود جو چاہے کر سکتی ہے اور کرے گی۔
کس کی مجال ہے کہ اسے بہکا یا سکھا سکے؛ یا اسے کسی نیک کام سے روک سکے؟"
گیتا کی آواز گلی کے باہر تک سنائی دے رہی تھی اور اس کا تقدس سب سے نکلتا معلوم
ہو رہا تھا۔

گیتا کے قطعی فیصلے نے ندیم کو خاموش کر دیا۔ اب دیر کی ضرورت بھی کیا
تھی۔ اسی وقت جا کر مدرسے کی عمارت دیکھی گئی۔ کمرہ پسند کیا گیا اور طے پایا کہ کل
دوپہر سے کام شروع کر دیا جائے گا۔

"ساجو دیدی تم آج ہی ہر ہر گھر میں جا کر یہ سندیسہ دے دینا کہ ان کا مرکز
کل یہاں لگے گا۔ میں گھر سے سیدھی یہیں آؤں گی۔" گیتا نے ساجو سے کہا۔

اس مسئلے کے طے ہونے کے بعد پھر ندیم اور انویم اسے اپنی تحریک کے
بارے میں سمجھاتے رہے۔ انویم چاہتا تھا کہ وہ ٹھاکر سندر سنگھ کو اس بات پر
آمادہ کرے کہ گاؤں والوں سے صلح صفائی کر لیں اور ان کے مطالبے مان لیں۔
ورنہ جھگڑا بڑھے گا۔ ندیم اس کی مخالفت کر رہا تھا کہ گیتا کو بیچ میں ڈالنے کی
کیا ضرورت ہے؟ اگر ٹھاکر نہ سمجھے تو حالات خود انھیں سبق سکھا دیں گے۔ ان
دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ اور گیتا چپ چاپ سنتی اور سوچتی رہی کہ ان
بچاروں کو یہ کیا معلوم کہ ماموں اب اس کی بات سننا اور مشورہ کرنا تو دور
کی بات رہی اس سے بولتے تک نہیں۔ اس کی اُور دیکھتے تک نہیں۔

۱۶

صفیہ بیگم کے نام خالدہ کا خط پہنچا تو وہ اور حبیب میاں دونوں پریشان ہو گئے۔ وہ اچھی طرح گاؤں کی اس نئی تحریک کو سمجھا نہ سکی تھی۔ مگر جتنا کچھ لکھا تھا اس سے معاملہ کسی نہ کسی حد تک ان کی سمجھ میں آگیا۔ آخر میں خالدہ نے لکھا تھا:۔

"پچی جان ہمارے ہاں تو ہمیشہ ہی غریبوں پر، پرجا پر زیادتی ہوتی ہی ہے۔ ہمیشہ ہی انھیں برا بھلا کہا جاتا اور گالیاں دی جاتی ہیں۔ پھر اب کیا خاص بات ہوئی کہ ایک مزدور کو ٹھاکر نے گالی دے دی تو سارا گاؤں بپھر اٹھا؟ لوگ کہتے ہیں سارا قصور ندیم بھائی اور انوپم بھیّا کا ہے۔ مگر وہ تو اتنے ہمدرد، اتنے دوسروں کے کام آنے والے، دوسروں کا دکھ درد سمجھنے والے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ کیوں لوگوں کو بہکاتے؟ سنا ہے انوپم بھیا چاہتے ہیں کہ صلح صفائی ہو جائے مگر ندیم بھائی اس پر تیار نہیں۔ دادا میاں کہتے ہیں یہ سب باغی ہیں، خون خرابا کرنا چاہتے ہیں۔ جانے کیا ہوگا، پچی جان؟"

اس مسئلے کو حبیب میاں کے لئے سمجھنا دشوار نہ تھا۔ مگر گیتا کے لوگ کیوں خلاف ہو گئے؟ خالدہ نے لکھا تھا:۔

"گیتا دیدی بڑی مشکل میں ہیں۔ سب لوگ ان سے خفا ہیں۔ دادامیاں ان کو اتنا چاہتے تھے، مگر اب دیکھ کر منھ پھیر لیتے ہیں۔ ٹھاکر چاچا تو جان ہی دیتے تھے، مگر اب ان کی صورت سے بیزار ہیں۔

دونوں گھروں کی عورتیں طنز و طعن کرتی رہتی ہیں۔ ان کا قصور
بس اتنا ہی ہے کہ جب ان کا مدرسہ بند کر دیا گیا اور گاؤں کی
عورتوں کو ہمارے گھروں میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی، تو
انھوں نے لڑکوں کے مدرسے میں عورتوں کا مرکز کھول دیا۔
وہ اب کھلے منہ باہر جاتی اور کام کرتی ہیں۔ مگر کیا یہ اتنا بڑا
گناہ ہے کہ لوگ ان کو ایسی بری بری باتیں کہیں؟ ٹھاکر کہتے
ہیں کہ اس لڑکی نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ سب ان
سے اچھوتوں سے بھی بدتر سلوک کر رہے ہیں۔ خود میری دادی بھی
ان کے سائے سے بچا کرنے لگی ہیں۔ جیسے ان کا پرچھاواں کسی پر
پڑ جائے گا تو جانے کیا ہوگا؟ شاید ڈرتی ہوں کہ مجھ پر اثر نہ پڑ جائے۔
مگر پنجرے کا قیدی پنچھی کسی آزاد پرند کا کیا اثر قبول کر سکتا ہے؟
چچی جان — ایک بات اور یہاں بہت اڑ رہی ہے۔ کیسے آپ
کو لکھوں! یہاں بعض گاؤں والے اور ٹھاکر کے گھرانے والے گیتا
دیدی کو بدنام کر رہے ہیں۔ مگر وہ خود یہ کچھ نہیں جانتیں۔ اگر بچارے
کو پتہ چل جائے تو جانے کیا کر ڈالیں۔
میں سب سے چھپا کر یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں۔ چچا جان سے
کہیئے فوراً آکر کچھ کریں۔ یہاں کا حال اچھا نہیں — ہائے اللہ —
جانے کب کیا ہو جائے۔"

صفیہ بیگم سمجھ گئیں یہ لوگ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے ہیں۔ اور اب اسے
بدنام کر کے اس نئی تحریک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ گیتا کے کیریکٹر پر حملہ!
یہ خیال ہی ان کے لئے سخت تکلیف دہ تھا۔ ایسی پاکباز، باحیا لڑکی اس زمانے

میں ملنا دشوار ہے اور کملا نگر والے اسے بدنام کرتے ہیں؟ نہیں نہیں، وہ اسے ہرگز اس گندے ماحول میں نہ چھوڑیں گی۔

حبیب میاں ان سے زیادہ متفکر تھے۔ اس دن تو انھیں کئی کام تھے مگر اگلے دن وہ صبح ہی کملا نگر روانہ ہو گئے۔

سندر سنگھ معافی مانگنے اور مزدوری بڑھانے پر کیا راضی ہوتے انھوں نے ہر کسی سے ملنے تک سے انکار کر دیا۔ الونیم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ وہ ٹھنڈے دل سے ایک بار اس کی بات سُن تو لیں، مگر وہ تو آپے سے باہر تھے۔ انھوں نے ضلع کے حکام سے اپنے کو خطرے میں ظاہر کر کے پولیس کی مدد طلب کر لی تھی، اور دو دن سے کئی مسلح سپاہی ان کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ ساتھ ہی امین میاں اور چند اور بستی کے "معززین" کی طرف سے سرکار کو یہ عرضداشت گزاری گئی تھی کہ ان کی جان و مال خطرے میں ہے۔ سرکار ان کی حفاظت کا انتظام کرے۔ کملا نگر میں چند سرپھرے باغی نوجوان حکومت کے اور ان وفاداروں کے خلاف آگ بھڑکا رہے ہیں۔

جب یہ خبریں اِدھر اُدھر پہنچیں تو نوجوانوں کا خون غصے سے اُبلنے لگا الونیم کی ساری کوششیں بیکار ہو گئیں۔ عدم تشدد، امن پسندی کی پالیسی دھری رہ گئی۔ بھلا کہیں سیدھی انگلیوں بھی گھی نکلا ہے؟ اب زبردستی ہی انھیں سیدھا کرنا ہوگا، قبل اس کے کہ صورتِ حال اور بگڑ جائے۔

الونیم روکتا رہا، سمجھاتا رہا، مگر اس کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ نوجوانوں کا لیڈر اب ندیم تھا۔

حبیب میاں کی موٹر کملا نگر سے کچھ فاصلے پر تھی کہ شور و غل اور نعروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور قریب پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ کھیتوں کے اس پار ٹھاکر سندر سنگھ کی حویلی کے سامنے سینکڑوں آدمیوں کا مجمع اکٹھا ہے۔

وہ گھبرا کر موٹر سے اترے اور تیزی سے کھیتوں کی منڈیروں کو پھاندتے ہوئے ادھر روانہ ہوئے — جسم خاصا بھاری تھا، کئی سال سے توند بھی نکل آئی تھی، سانس پھول گیا مگر وہ ہانپتے کانپتے بھاگے چلے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے ڈرائیور۔ "میاں — میاں — ذرا سنیئے تو — ذرا ٹھیریئے تو" کہتا ہوا دوڑ رہا تھا۔

سب سے اگلی صف میں چند نوجوان کھڑے تھے اور باقی مجمع ان کے پیچھے تھا۔ جو آواز ان کے گلے سے نکلتی اس کی گونج دوسروں کے منھ سے سنائی دیتی تھی۔

"ہماری مانگیں پوری کرو"

"ٹھاکر سندر سنگھ باہر آؤ"

"بھولا ناتھ سے معافی مانگو"

"ہماری مزدوری بڑھاؤ — نہیں ہم تمھارے کھیتوں میں آگ لگا دیں گے"

"نہیں چلے گی. نہیں چلے گی — ٹھاکری اب نہیں چلے گی"

"ہماری مانگیں پوری نہ ہوئیں تو......"

حبیب میاں اب بالکل قریب پہنچ چکے تھے اور پہلی صف میں کھڑے ندیم، گیتا، شبراتی، ساجد اور رنا تھو لال انھیں صاف نظر آ رہے تھے اور چند گز جگہ چھوڑ کر بند حویلی کے کواڑوں کے سامنے چھ سپاہیوں کی ایک مسلح ٹولی قطار باندھے کھڑی تھی!

حبیب میاں کو اب خطرے کا پورا اندازہ ہوا۔ وہ مجمع ہٹا کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ اپنے گھر کے دروازے سے ابن میاں چیختے ہوئے باہر نکلے اور مغلظات بکنا شروع کر دیں! "آؤ..... آؤ..... میں دوں گا تمھیں..... تمھارے حق..... مجھ سے لو..... یہ ادھیکار۔ لو اپنی مانگیں....." اور ہر ٹکڑے کے ساتھ دو چار فحش گالیاں۔

"بڈھا پاگل ہو گیا ہے۔" مجمع سے کسی نے غصّے میں چلا کر کہا۔

"پہلے اسی کا دماغ درست کر دو۔" دوسری آواز آئی۔

کہیں سے اچھلتا ہوا ایک پتھر ابن میاں کی طرف آیا جو اُن کی ٹوپی کو چھوتا ہوا پیچھے کواڑ میں لگا۔ ابن میاں دہاڑتے ہوئے پیچھے ہٹے اور ڈیوڑھی میں گھس کر اندر سے کنڈی لگالی۔

مجمع نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "بھگوڑا — بزدل — کائر — گلیارا۔" اور کئی اور پتھر کواڑوں سے ٹکرائے۔

حبیب میاں اب تک سامنے پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ انھیں ایک کڑک دار آواز سنائی دی اور وہ ٹھٹک گئے۔

"بھائیو! آپ لوگ یہ کیا غضب کر رہے ہیں؟ ہمارا مقصد پتھر برسانا اور ہنگامہ کرنا نہیں ہے یہ نہ بھول جائیے۔ ہم صرف اپنے مطالبات پیش کرنے اور بات چیت کرنے آئے ہیں....." انور ابن میاں کی ڈیوڑھی کے سامنے کھڑا لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بھیا تم گالیاں کھاؤ — ہم اب نہ کھائیں گے اس بڈھے کی گالیاں۔"

"یہ لوگ یوں نہ مانیں گے۔"

"ہم دکھا دیں گے کہ کیا کر سکتے ہیں۔"

"ابن میاں باہر نکلو ___ معافی مانگو۔"

"کمینے بڈھے ہم تیری زبان کھینچ لیں گے۔"

جس ابن میاں سے کل تک ان کی روح فنا ہوتی تھی آج اس کی حیثیت ایک حقیر کیڑے سے زیادہ نہ تھی جسے وہ چٹکی سے مسل سکتے ہیں۔

عین اسی وقت سندر سنگھ کسی طرف سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے۔ آنکھیں لال، منھ سے کف جاری اور ہاتھ میں ایک زنگ خوردہ پرانی بندوق! ایک لمحے وہ مجمع کو گھورتے رہے۔ سب سے آگے گیتا اور ندیم کھڑے نظر آئے۔ ان کی عزت کو خاک میں ملانے والے! انھیں اس عذاب میں پھنسانے والے.... اور بندوق اوپر اٹھنے لگی.....

حبیب میاں دوڑتے ہوئے اگلی صف میں پہنچ گئے۔ بندوق چھتائی جا چکی تھی اور گیتا اس کی زد میں تھی۔ وہ جھپٹے کہ گیتا کو پیچھے کھینچ لیں ___ اور گولی ان کے بازو سے چھیلتی ہوئی نکل گئی......

اور سارا مجمع دم بخود رہ گیا۔ بغیر ایک آواز کسی کے منھ سے نکلے یہ خبر دم بھر میں سارے میں پھیل گئی کہ ٹھاکر سندر سنگھ نے حبیب میاں کے گولی مار دی۔

وہ کب آئے؟ کیسے آئے؟ کیسے انھیں یہاں کی خبریں ملیں؟ کس طرح سے وہ عین اس وقت گیتا کے سامنے پہنچ گئے جب اس کا سینہ گولی کی زد میں تھا؟ یہ سب کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ وہ ان کے آنے کو ایک معجزہ سمجھ رہے تھے جنھیں خدا نے عین وقت پر انھیں بچانے کے لئے بھیج دیا ہے اور جسے اس کافر نے زخمی کر دیا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ انھیں مار دیا۔ کوئی عجب نہ تھا کہ ٹھاکر سندر سنگھ کے دم بھر میں پرخچے اڑ جاتے۔ کتنے ہاتھ پتھر پھینکنے کے لئے

اُٹھ چکے تھے، کتنے قدم ادھر بڑھ رہے تھے۔ سب کے دلوں میں غم و غصے کا لاوا ابل رہا تھا۔ سپاہیوں نے بندوقیں سیدھی کرلیں۔ حبیب میاں جو جھٹکے سے گر گئے تھے بجلی کی سی تیزی سے کھڑے ہو گئے —— اور انوپم کی تیز آواز کی گونج دور دور سنائی دی۔

"ٹھیرو — بھائیو ٹھیرو —— حبیب میاں آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

سپاہی جھجکے۔ مجمع ٹھٹک گیا۔ انوپم کے کندھے کا سہارا لئے حبیب میاں سامنے کھڑے تھے، آنکھوں میں محبت کی چمک، ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ، چہرے پر معصومیت کا حُسن۔ وہی دلکش شخصیت جس سے کملا نگر والے خوب واقف تھے۔ وہ دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں بازو کو سہارا دئے ہوئے تھے۔ سفید کھدر کی آستین سرخ ہو چکی تھی۔

"بھائیو۔ میں آپ لوگوں سے ملنے آیا تھا۔ سُنا تھا آپ آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ سوچا چل کر پوچھوں تو کیا ہوا۔ مگر اتفاق سے یہ ذرا سی چوٹ آگئی۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ غصے میں نہ آیئے۔ میرا کہنا مان لیجئے اور اس وقت اپنے اپنے گھر لوٹ جایئے —— کل یا پرسوں، ذرا غصہ دھیما پڑ جانے کے بعد، ہم سب مل بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔"

کسی نے مجمع میں سے چیخ کر کہا۔ "بھیا ٹھاکر نے یہ تم پر گولی نہیں چلائی ہماری چھاتیوں کو چھیدا ہے۔ ہم اسے بتا دیں گے کہ ہم اپنے مالک کے لئے جان دے بھی سکیں ہیں اور لے بھی سکیں ہیں۔" یہ چودھری نرائن سنگھ کی غصے میں کپکپاتی آواز تھی اور سینکڑوں آوازیں ان کی تائید میں بلند ہوئیں۔

"نہیں نہیں —— آپ میرا بدلا لینے کی فکر نہ کیجئے بلکہ ——"

ان کا جملہ پورا ابھی نہ ہوا تھا کہ ندیم کی آواز بلند ہوئی۔ "حبیب میاں

کملانگر والے کائر نہیں۔ وہ ان بزدل ٹھاکروں سے نہیں ڈرتے۔ وہ آپ کا بدلہ
لے کر چھوڑیں گے۔"

حبیب میاں زور سے چلا پڑے۔ "ندیم — آپ میرا بدلہ لینے کی فکر نہ
کیجئے۔ اس کے لئے میں خود کافی ہوں —"

"آپ پر حملہ کملانگر والوں کا ایمان ہے — ان پر ظلم ہے — وہ — آپ"
ندیم کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی حبیب میاں اس زور سے گرجے کہ لوگ
چونک پڑے۔

"ندیم — میں حکم دیتا ہوں کہ تم اس وقت واپس چلے جاؤ اور ان سیدھے
سادے لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ میں کملانگر والوں کو تم سے
زیادہ جانتا ہوں۔ وہ میری التجا کبھی نہ ٹھکرائیں گے — وہ ضرور میری بات
مان کر اپنے اپنے گھر واپس چلے جائیں گے...... تاکہ —" اب ان کا لہجہ
دھیما پڑ گیا تھا۔ انھوں نے مسکرا کر جملہ پورا کیا۔ "تاکہ سندر بھائی کچھ میری
مرہم پٹی کا انتظام کریں — اور بھوکا بھی بہت ہوں کچھ کھلائیں پلائیں۔"

اس تمام عرصے میں سندر سنگھ مفلوج سے کھڑے رہے۔ جیسے ہلنے جلنے
سننے، سمجھنے اور بولنے کی طاقتیں جواب دے گئی ہوں۔ اور مجمع حبیب میاں کے
اصرار کے باوجود اسی طرح کھڑا تھا۔ حبیب میاں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر
سندر سنگھ کا بازو پکڑ کر بولے۔ "سندر — معافی مانگو — اپنے بھائیوں سے!"
سندر سنگھ کو ہوش سا آگیا مگر ان کا سر اور جھک گیا۔

"معافی مانگو سندر ورنہ معاملہ میرے قابو سے باہر ہو جائے گا۔"
سندر سنگھ کی کانپتی آواز بلند ہوئی اور کتنی مختلف تھی یہ آواز ان کی
شیر کی سی دھاڑ سے۔

"میں — میں — تم لوگوں سے — شرمندہ ہوں۔"

"تم کائر — کمینے — غدار ہو — اب ڈر کر معافی مانگ رہے ہو۔" مجمع چیخا۔

حبیب میاں نے آہستہ سے سندر سنگھ سے کچھ کہا۔ سندر سنگھ کی آواز پھر بلند ہوئی۔

"میں ڈر کر معافی نہیں مانگ رہا — میں اپنے کیے پر پشیمان ہو کر آپ لوگوں سے معافی مانگ رہا ہوں — آپ سے نہیں بھولا ناتھ سے اور — اپنے بھائی حبیب میاں سے —"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں سندر بھائی۔" حبیب میاں نے ٹوکا۔

"ہماری مانگیں؟" کچھ لوگ چیخے۔

انویم اب اور ضبط نہ کر سکا۔ "آپ لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ حبیب میاں ہماری خاطر زخمی ہوئے اور اتنی دیر سے کھڑے آپ کو سمجھا رہے ہیں مگر کسی کو اس کی پرواہ نہیں کہ اتنی دیر میں کتنا خون ان کا ضائع ہو چکا ہے۔ آپ ان کی یہ ذرا سی بات نہیں مان سکتے کہ اس وقت چلے جائیں تاکہ ان کی مرہم پٹی کی جا سکے۔ رہیں آپ کی مانگیں۔"

اور حبیب میاں نے جلدی سے اس کا جملہ پورا کیا۔ "آپ کی مانگیں میری مانگیں ہیں۔ ان کو نہ مانا گیا تو آپ کے ساتھ اس آندولن میں میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔"

اور یہ کہتے کہتے ان کا سر چکرایا، لڑکھڑائے اور اگر انویم اور گیتا نے لپک کر سنبھال نہ لیا ہوتا تو وہ گر پڑتے۔ مجمع چھٹنے لگا۔ سپاہی چپ چاپ ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے تھے۔ حبیب میاں کو انویم اور گیتا سہارا دے کر اندر لے جا رہے تھے اور سندر سنگھ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ان کے پیچھے پیچھے

چلے جا رہے تھے۔
اور اب میدان میں صرف ندیم کھڑا بے بس غصے میں اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

۱۷

حبیب میاں کو کملا نگر میں آئے آٹھ نو دن ہو گئے تھے۔ زخم تو شکر ہے زیادہ گہرا نہ تھا۔ تیسرے دن ہی سے انگور بندھنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر بہت زیادہ خون نکلنے کی وجہ سے کمزوری بہت ہو گئی تھی۔ کئی دن تک تو وہ بے سُدھ پڑے رہے۔ یہ چوٹ ان کے بازو پر لگی تھی تو دوسروں کے سینوں پر۔ گاؤں والوں کا جوش اور غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور اس وقت اپنے مطالبوں سے زیادہ انھیں حبیب میاں کی جان کی پڑی تھی۔ جب ان کی طبیعت سنبھلی تو ان کو یہ امید بھی بندھی کہ حبیب میاں ان کی مانگیں منوا لیں گے اور اب کوئی جھگڑا فساد نہ ہوگا ادھر سندر سنگھ سخت پشیمان اور دن رات حبیب میاں کی خدمت میں مصروف تھے۔ ابن میاں کو بھی اس حادثے نے اس قدر صدمہ پہنچایا تھا کہ بُت بن کر رہ گئے تھے۔ دو دن تک تو وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے۔ صدیق حسن اگلے دن ہی پہنچ گئے تھے اور یہاں کے حالات سن اور دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

حبیب میاں کا پلنگ سندر سنگھ کی بیٹھک میں تھا۔ گیتا نے جو اُن کی پٹی تھامی تو اور سب کچھ بھول گئی۔ یہ چوٹ اس کے دل پر بڑی گہری لگی تھی۔ اس طرح تو کوئی اپنی بیٹی کے لئے بھی سینہ سپر نہیں کرتا۔ انو بھی زیادہ تر یہیں رہتا ندیم دن میں ایک بار آتا ضرور تھا مگر کچھ اکھڑا اکھڑا سا نظر آتا۔ باقی گاؤں کے

لوگوں کا تانتا دن بھر لگا رہتا تھا۔ جیسے ہی حبیب میاں کی طبیعت سنبھلی وہ الگ الگ بھی گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں سے ملے اور سب کو جمع کرکے بھی بات چیت کی۔ سندر سنگھ سے اب تک ان کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سندر سنگھ خود اس مسئلے کو چھیڑیں لیکن سندر سنگھ کا یہ حال تھا کہ جیسے کسی نے ان کا منھ سی دیا ہے۔ ایک کٹھ پتلی کی طرح بس حبیب میاں کی سیوا تو کرتے رہتے مگر منھ سے کچھ کہتے نہ تھے۔

ایک ہفتے بعد کا ذکر ہے، حبیب میاں تکیوں کے سہارے لیٹے تھے اور انوپم انھیں اخبار سنا رہا تھا۔ گیتا ان کی پائنتی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی کہ صدیق حسن داخل ہوئے اور مونڈھا گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ مگر بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ حبیب میاں نے پوچھا "کیوں صدیق کیا بات ہے؟"

"وہ — میں — ذرا کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔" رک رک کر انھوں نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں۔ کرو —"

"کچھ گاؤں کے معاملات کے بارے میں تنہائی میں ...."

"تو پھر تامل کیا ہے — ان لوگوں سے کیا پردہ —" اور حبیب میاں نے مسکرا کر گیتا اور انوپم کی طرف دیکھا۔ "یہ لوگ ٹھیرے گاؤں کے لیڈر — ان کی مرضی کے خلاف میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔" انوپم غور سے صدیق حسن کو دیکھ رہا تھا اور گیتا کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ آج کتنے دن بعد یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک آنے کی کوشش میں کامیاب ہوئی تھی۔

"حبیب"۔ صدیق حسن نے کہا "تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ سال بھر میں ہمارے کملانگر میں کتنی بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ لوگوں کو اپنے حقوق کا کتنا احساس اور

اپنی عزت کا بڑا پاس ہوگیا ہے۔ اور اب "

انوپم کو ان کے لہجے میں بجائے خلوص کے طنز کی جھلک نظر آئی۔

"تو کیا یہ باتیں قابلِ اعتراض ہیں؟" اس کا لہجہ بے ارادہ تیز ہوگیا تھا۔

"انوپم تم کچھ دیر خاموش رہو۔ پہلے صدیق کو بات پوری کر لینے دو" حبیب میاں نے ٹوکا۔

"بری اچھی میں نہیں جانتا۔ جو حقیقت ہے وہ بیان کر رہا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا حبیب کہ اگرچہ گاؤں والوں کا جھگڑا براہ راست مجھ سے نہیں ہے لیکن ان کے مطالبات ہم سب ہی سے ہیں جو اب تک پرانے طریقوں پر چل رہے ہیں اور جمہوری نقطہ نظر کو اپنا نہیں سکے ہیں"

"بے شک ــــ تم بالکل ٹھیک سمجھے"

"جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نہ ان کا مخالف ہوں نہ حریف۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اور وہ ایک دوسرے کے ساجھی ہیں۔ کام میں بھی اور پیداوار میں بھی۔ میں اس پر بھی تیار ہوں کہ بٹائی کے اصولوں پر کھیتی باڑی ہو اور اس پر بھی کہ جتنی مناسب سمجھو مزدوری بڑھا دو۔ میرے لئے دونوں چیزیں یکساں قابلِ قبول ہیں"

انوپم نے حیرت سے صدیق حسن کو دیکھا۔ وہ اتنی آسانی سے یہ باتیں مان جائیں گے اس کی اسے ذرا بھی امید نہ تھی۔ حبیب میاں خوش ہو کر اٹھ بیٹھے اور ہاتھ بڑھا کر صدیق حسن کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا "میرے عزیز دوست۔ میرے بھائی مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں جانتا تھا کہ صدیق حسن تنگ نظر ہے نہ تنگدل"

صدیق حسن نے جلدی سے سہارا دے کر انھیں لٹا دیا۔

"بیگار کا سسٹم تو ہمیشہ سے میرے لئے بہت تکلیف دہ رہا ہے۔ مگر گاؤں کے قاعدے قانون میں دخل دینا ذرا دشوار ہوتا ہے اور پھر اماں اور بڑے ابا کے

سامنے یوں بھی ان چیزوں کی مخالفت کرنا آسان نہ تھا۔ اور مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اس کے لئے گھر والوں سے ٹکر لیتا۔ مگر اب میں نے طے کر لیا کہ کبھی بھی، کسی سے بھی کوئی کام زبردستی یا بیگار میں نہ کرایا جائے گا۔ ان بزرگ حضرات کی بھی اب آنکھیں کھل گئی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنی ذرا سی بھی عزت باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اب اس پر اصرار نہ کریں گے۔"

گیتا کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چمک آئے۔

سندر سنگھ جانے کب سے دروازے میں کھڑے یہ سب سن رہے تھے۔ اب حبیب میاں کی نظر ان پر پڑی تو وہ مسکرا کر بولے۔ "آؤ آؤ ٹھاکر — تم بھی آؤ۔۔۔"

سندر سنگھ آہستہ سے آگے بڑھے اور حبیب میاں کی پٹی کے پاس لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں زمین پر تھیں۔

"کہو ٹھاکر؟ کیا ارادہ ہے؟ ٹھاکری کی لاج رہے گی یا انصاف اور سچائی کا بول بالا ہوگا؟" حبیب میاں نے ذرا شوخ انداز میں کہا۔

سندر سنگھ نے حبیب میاں کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں زور سے دبا لیا اور بھرّے گلے سے بولے۔ "بھیا۔ ٹھاکری کی لاج تو اسی وقت خاک میں مل گئی تھی جب اپنے لنگوٹیا یار، اپنے چہیتے بھائی کو اپنے ظلم و حماقت کا نشانہ بنایا تھا۔" اور سب نے دیکھا کہ ٹھاکر سندر سنگھ بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہے ہیں۔

ندیم اسی وقت بیٹھک میں داخل ہوا اور یہ منظر دیکھ کر اس کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہو گئیں۔ ہا یہ ٹھاکرانہ اور سرمایہ دارانہ چالیں۔ اس نے سوچا۔

حبیب میاں نے محبت سے سندر سنگھ کا کندھا تھپتھپایا۔ "میں جانتا ہوں بھائی کہ یہ آنسو پشیمانی کے آنسو ہیں۔ جن کا مول دنیا کی کوئی دولت

نہیں ہوسکتی۔ مرد کبھی دوسروں کی غلطی یا ظلم پر نہیں روتا۔ ہاں وہ روتا ہے صرف اپنی غلطی پر۔ تمہارے یہ مردانہ آنسو، تمہارے جھوٹے غرور اور غلط نظریوں کو دھو ڈالیں گے۔"

سندر سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پگڑی کے پلو سے آنسو پوچھنے لگے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ آخر حبیب میاں نے سکوت توڑا۔

"تو اب کہو کیا کہتے ہو؟"

"تم جو بھی کہو، وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔" انھوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"میں کچھ نہیں کہتا۔ تم سے گاؤں والوں کو شکایت ہے۔ تمھیں ان کو دور کرنا، ان کی مانگیں پوری کرنا ہیں۔" حبیب میاں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا کہ جو بھی تم کہو وہ میں مانوں گا۔ مجھے اپنے گناہ کا پرائشچت کرنا ہے۔"

"بے شک ـــ مگر اس گناہ کا جو تم نے بھولا کے ساتھ کیا ہے۔ سا جو کا دل دکھا کر کیا ہے ـــ ان دوسرے گاؤں والوں کا کیا ہے جو ہمیشہ سے تمہاری خدمت کرتے آئے ہیں ـــ ان بے قصور نوجوانوں پر الزام رکھ کر کیا ہے جو اپنا عیش آرام چھوڑ کر تمھیں کچھ سکھانے، کچھ بتانے آئے تھے۔ جن کو اپنی سیوا اور خلوص کے بدلے میں بدگمانی ملی، الزام دئے گئے، برا بھلا کہا گیا۔ ہر طرح مطعون کیا گیا.....؟" حبیب میاں کا لہجہ بہت سخت ہو گیا تھا

ان کو وہ بیہودہ افواہیں یاد آ گئیں جو گیتا کے بارے میں پھیلائی گئی تھیں۔

بھاکر سندر سنگھ کی نظریں پہلے گیتا کے چہرے پر رکیں پھر انو پم اور ندیم کی طرف اٹھیں اور بھویں تن گئیں، آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ مگر وہ طبیعت بہت

کوشش کر کے لہجے کو دھیما بنا کر بولے۔

"حبیب بھائی — میں نے عرض کیا نا کہ آپ حکم دیجیے، میں تعمیل کروں گا۔ میں صرف آپ کا قصوروار ہوں اور اس کی ہر وہ سزا جو آپ مجھے دیں گے، خواہ اس میں میری کتنی ہی ذلت ہو — میں برداشت کروں گا۔"

"آپ سزا بھگتنا چاہتے ہیں یا انصاف اور سچائی کا پالن کرنا؟"

"حبیب بھائی انصاف اور سچائی کا نام نہ لو تو بہتر ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا اب نام ہی نام دنیا میں رہ گیا ہے۔" سندر سنگھ کا لہجہ جو ابتدا میں ہلکا تھا تیز ہوتا گیا۔ "ہمارا سب کچھ چھین کر ہماری پرجا کو دے دیا جائے۔ اور ہم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق بنے رہیں یہ انصاف ہے؟ کل تک جو ہمارے غلام تھے آج ہمارے آقا بن گئے، ہمارے سر چڑھ کر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ یہ انصاف ہے؟ ہم ان کی گالیاں کھائیں، اپنا سب کچھ انھیں دے دیں؟ یہ حق کا پالن کرنا ہے؟ خود ہمارے بچے ہم سے بغاوت کریں ہمارے دشمنوں سے مل جائیں، ہمارے خلاف سازشیں کریں۔ ہماری پرکھوں کی عزت خاک میں ملا دی جائے۔ یہ حق و صداقت کی حمایت کرنا ہے؟ حق پرستی ہے؟ اگر ہے — تو میں ایسے انصاف کا پرستار نہیں۔ اس سچائی کا پالن کرنے سے مجھے معذور سمجھا جائے — ہاں تمھاری خاطر — میں ہر بات ماننے اور جو تم کہو گے وہ کرنے کو تیار ہوں —" سندر سنگھ کے لہجے میں کچلے ہوئے غرور اور ہارے ہوئے سپاہی کا سا بے بس غصہ جھنکار رہا تھا۔

ندیم کے ہونٹوں کی طنزیہ مسکراہٹ اب پورے چہرے پر پھیل چکی تھی اور انوپم کی آنکھوں میں جو امید کی چمک آئی تھی وہ ماند پڑ چکی تھی۔ گیتا کے چہرے پر حیرانی تھی — صرف حیرانی!

چند منٹ مکمل سکوت رہا۔

"سندر سنگھ" آخر بڑی دیر کے بعد حبیب میاں نے زبان کھولی۔ ان کے لہجے میں دکھ تھا۔" آپ ابھی تک اپنے کو نئے زمانے، نئے حالات کے مطابق بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ شاید حالات کو سمجھنا اور زمانے کے رُخ کو پہچاننا بھی نہیں چاہتے۔ اس طرح آپ کیا سمجھوتہ کریں گے اور کیا حالات کو سنبھال سکیں گے۔ آج آپ میری خاطر جو باتیں مان لیں گے، کل اس سے پھر بھی سکتے ہیں۔"

سندر سنگھ کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا "حبیب یہ نہ بھولو کہ میں ٹھاکر ہوں۔ راجپوت کو اپنی آن جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے — وہ اپنی بات سے کبھی نہیں پھرتا —"

حبیب میاں کو ان کے غصے پر رحم آگیا۔ ہائے افسوس یہ قابلِ قدر جذبے کتنے غلط طریقے سے برتے جاتے ہیں۔ انھوں نے آہستگی سے کہا۔" ٹھیک ہے جانتا ہوں تم راجپوت ہو اور اپنی آن کے لئے سب کچھ کر سکتے ہو اور اپنی بات کا پالن ضرور کرو گے، مگر اس قسم کے قصّے تو آئے دن پیش آئیں گے۔ انھیں کیسے سلجھاؤ گے۔ جب تک تم دل سے اپنے کو آزاد ہندوستان کا آزاد باشندہ نہ سمجھو گے۔ جب تک سچے سوشلسٹک سماج کو نہ اپناؤ گے، تم ہندوستان کے سچے سپوت نہیں بن سکتے۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ میں تم سے صرف یہ کہنے آیا تھا کہ تم گاؤں والوں سے بات چیت کر لو اور ان کے جو بھی مطالبے تم چاہو منظور کر لو۔ تمھاری خاطر میں ہر بات مان لوں گا — بس مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے۔" انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اگر وہاں ندیم، گیتا اور انوپم نہ ہوتے تو شاید ان کے

لہجے میں اتنی تلخی نہ ہوتی۔

"ابھی ــ تمہیں زمانے سے کچھ اور سبق سیکھنا باقی ہے" ہونٹوں ہونٹوں میں حبیب میاں نے یہ جملہ ادا کیا اور پھر ندیم سے مخاطب ہوئے۔ "ندیم میاں کل آپ اپنے لیڈروں کو لے کر آجائیے گا...."

"مگر ــ ٹھاکر صاحب ــ تو اب بھی اسی طرح اکڑ...."

"میں آپ سے جو کہہ رہا ہوں وہ کیجیے" سختی سے حبیب میاں نے اس کی بات کاٹی۔ "اور اگر آپ یہ خدمت انجام نہ دے سکیں تو انوکم آپ مہربانی کر کے گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کو میرے پاس لے آئیے گا۔ اگر گاؤں والوں کو مجھ پر بھروسہ ہے تو وہ مجھے پنچ بنائیں گے ــــ نہیں تو ندیم ہیں ہی ــــ"

گیتا کو حبیب میاں کا یہ طنزیہ انداز اچھا نہیں لگا۔ بجائے ندیم کے ساتھ میاں زیادتی کر رہے ہیں۔

"ٹھاکر ــ تم سے ہم سے پھر کبھی باتیں ہوں گی" حبیب میاں نے سندر سنگھ سے کہا اور پھر ندیم کا کھسیانا چہرہ دیکھ کر انھیں اپنی سختی کا احساس ہوا۔ "ارے ہاں ندیم یہ تو میں تمھیں بتانا بھول ہی گیا کہ صدیق بھائی نے تم لوگوں کی سب مانگیں منظور کر لی ہیں"

"واقعی ؟" حیرت سے ندیم کے منھ سے نکلا۔ "واہ چچا جان۔ آپ نے میرا سر اونچا کر دیا" اور وہ بے اختیار ان کے گلے سے لپٹ گیا۔

"بیٹا یہ سب تم لوگوں ہی کی صحبت کا فیض ہے"

"نہیں چچا جان یہ آپ کی نظر کی وسعت اور سمجھداری کی دلیل ہے کہ آپ نے زمانے کے تقاضوں کو پہچانا۔"

"ندیم بیٹا۔ تم بڑے ابا کی باتوں کا خیال نہ کرو۔ وہ بھی رنجیدہ ہیں،
اب گھر چلو۔ اماں اور سکینہ دونوں تمہارے لئے بیقرار ہیں۔ خالدہ اور کلثوم بھی
بہت یاد کرتی ہیں۔"

ندیم نے سر جھکا لیا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اب اس گھر میں قدم نہ رکھے گا
مگر صدیق حسن کی فیاضی اور پھر اس معذرت نے اسے مجبور کر دیا کہ ان کی
بات مان لے۔

گیتا کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ کاش سندر ماموں بھی اس سے اسی
طرح شفقت اور محبت کی باتیں کرتے۔ مگر نہیں۔ وہ تو بدقسمت ہے۔ ہر عزیز کی
محبت سے محروم۔ آج ایک ہفتے سے وہ یہاں بیٹھک میں حبیب میاں کی تیمارداری
میں مصروف ہے۔ لیکن اتنے دن میں نہ کسی گھر والے نے اس سے بات کی نہ
کھانے کو پوچھا۔ دو راتیں تو اس نے یونہی پٹی سے لگ بیٹھے گزار دیں۔ تیسرے
دن سے رات کو خالدہ اسے اپنے ہاں لے جا کر سلانے لگی۔ وہی اسے آ کر
زبردستی کچھ کھلا پلا بھی دیتی تھی۔ اس نے کنکھیوں سے سندر سنگھ کی طرف دیکھا
شاید اب ان کا دل پسیجا ہو۔ مگر ان کا چہرہ پتھر کے کسی ایسے دیوتا سے مشابہ
تھا جو ہر جذبے سے عاری ہو۔ یہ آنکھوں میں اتنے آنسو کم بخت کہاں سے
آجاتے ہیں۔ اس نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور آنکھوں کا ر کا بند ھ ٹوٹ
گیا۔ ندیم۔ انوپم۔ صدیق حسن اور حبیب میاں خاموشی سے اس کی طرف
دیکھتے رہے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ کچھ کہے یا سمجھائے، مگر سندر سنگھ
اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ نہ ہلے۔ نہ بولے۔

یہ اس آندولن کا اثر تھا یا حبیب میاں کا خیال اور مروت؛ چھپے ہوئے

اس خوف کی وجہ تھی کہ رہی سہی طاقت بھی کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے؟ یا سب کے ملے جلے اثرات تھے۔ بہر حال ہوا یہ کہ اس وقت کملانگر کے معاملات خاطر خواہ سلجھ گئے اور اس صلح کا سہرا حبیب میاں کے سر بندھا۔ ٹھاکر سندر سنگھ نے حبیب میاں کی خاطر کچھ لوگوں سے معافی بھی مانگی اور مزدوروں کی اُجرت بھی بڑھا دی۔ بیگار کے الزام کو تو انھوں نے قبول ہی نہیں کیا۔ حبیب میاں نے لوگوں سے کہا۔ آئندہ جب بھی وہ کسی کے ہاں کام کرنے جائیں، عورت ہو یا مرد، پہلے سے مزدوری طے کر کے جائیں۔ لیکن دل میں یہ سمجھتے تھے کہ جب بھوک اور غربت ستاتی ہے تو انسان ایک روٹی کے ٹکڑے پر بھی گھنٹوں محنت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب سندر سنگھ اور صدیق حسن نے ہتھیار ڈال دئے تو پھر گاؤں کے دوسرے چھوٹے موٹے زمینداروں کو بھی مطالبات ماننے ہی پڑے اور کملانگر والوں نے اپنی فتح کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔

حبیب میاں کا غسلِ صحت دسویں دن ہوا اور اگلے دن گاؤں کی پنچایت میں جشنِ مسرت منایا گیا۔ خوب ناچ گانے ہوئے۔ نقلیں کی گئیں۔ لطیفے اور چٹکلے سبھی پروگرام میں شامل تھے۔ اس کو دیکھ کر انوپم اور گیتا کو اندازہ ہوا کہ آمد کیا ہوتی ہے اور آورد کیا ہوتا ہے؟ خود اپنی امنگ سے کام کرنے میں اور دوسروں کے بتائے ہوئے کام میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اُن جلسوں میں نظم تھا، ترتیب تھی، تنوع تھا۔ مگر وہ جان نہ تھی، وہ ہم آہنگی نہ تھی، وہ جوش، وہ بے ساختگی نہ تھی جو اس وقت نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے اگرچہ سب کچھ گاؤں والوں ہی سے کرایا تھا مگر اس کے کرتا دھرتا یہ لوگ خود تھے۔ لوگوں نے اسے کیا ضرور مگر پوری طرح نہ اپنا سکے۔ انوپم تو اس وقت ان لوگوں کے

ساتھ گانے اور ناچ میں شریک ہو گیا۔ ایسا جھوم جھوم کر گایا اور مٹک مٹک کر ناچا کہ حبیب میاں ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے۔ گیتا خاموش بیٹھی نظروں نظروں میں ندیم کو ڈھونڈ رہی تھی جو اسے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ کل واپس جمشید پور جا رہی تھی اور ندیم سے نہ مل سکنے کا اسے بڑا قلق تھا۔ بعد میں ساجو نے اسے بتایا کہ وہ کسی کام سے باہر چلا گیا ہے۔

حبیب میاں نے گیتا سے کہا تو یہ تھا کہ صفیہ نے کچھ عرصے کے لئے اسے بلایا ہے مگر وہ سمجھ گئی کہ اب وہ اسے یہاں رکھنا نہیں چاہتے۔ سندر سنگھ کا رویہ، گھر والوں کا برتاؤ، گاؤں والوں کی باتیں۔ اب وہ خود بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اسے سخت رنج تھا کہ جن لوگوں کے لئے اس نے اتنا کچھ کیا انھوں نے اس کی قدر نہ کی۔ قدر کیا کرتے اسی کے ساتھ اتنی بدسلوکی کی۔ بدگمانی کی۔ نوعمری کا جوش اور نوجوانی کی خود پسندی، اسے اپنی خدمات اور دوسروں کی ناانصافیاں دونوں ہی بہت بڑھا چڑھا کر دکھا رہی تھیں۔

ندیم کی مقبولیت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اب لوگ پھر انویم بھیا کی مالا جپنے لگے تھے۔ حبیب میاں نے اندازہ لگایا کہ انویم اور ندیم میں خاصی چشمک پیدا ہو چکی ہے اور اب ان کا ساتھ رہنا مناسب نہیں۔ وہ ندیم سے مل کر گفتگو کرنا چاہتے تھے مگر وہ ان سے بے ملے چلے خدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔

گیتا اور ندیم کو جن لوگوں نے بدنام کرنے کی کوشش کی ان کی انھوں نے اچھی طرح خبر لی۔ پہلے تو سندر سنگھ سے تنہائی میں اس مسئلے پر انھوں نے بہت سختی سے بات کی۔ گاؤں کے جو لوگ ان افواہوں کو پھیلانے

میں پیش پیش تھے، ان میں کئی نوجوان تھے، ساجو کی ساس تھی، چودھری نرائن سنگھ کی ماں تھی اور بھولا کا بڑا بھائی تھا اور کئی اور آدمی حبیب میاں نے ان لوگوں کو بہت لعنت ملامت کی اور کہا کہ آپ لوگ اس قابل نہیں کہ کوئی شریف لڑکی آپ لوگوں کی خدمت کرنے کا خیال بھی کرے" تم لوگ احسان فراموش ہو، ناشکرے ہو، بدنصیب ہو۔ وہ یہاں رہتی تو کھلا نگر کے دن پھر جاتے ـــ مگر تم بدنصیبوں کی قسمت میں یہ نہ تھا۔ میں اب ایک دن اُسے یہاں نہیں چھوڑوں گا"ـــ وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ چودھری نرائن سنگھ نے آہستہ سے کہا۔ "بھیا ہم کیا جان سکیں تھے۔ لوگوں میں جب بات کا چرچا تھا ہم سمجھے ٹھیک ہوگی۔ پر اب ایسا نہ ہوگا۔ گیتا ہماری اپنی بیٹی کی طرح ہے بھیا ـــ اب چھوڑ جاؤ ـــ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

حبیب میاں کا غصہ اور بڑھا۔ "نہیں تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ شریف لڑکیاں تمھارے ہاں رہ کر کام کریں۔"

ان کو اس قدر غصے میں دیکھ کر سب دبک گئے۔ لیکن حبیب میاں یہ بھول گئے کہ گاؤں سے بھی زیادہ یہ بیماری شہر کی "ترقی یافتہ" "روشن خیال" "آزاد" اور "تعلیم یافتہ" سماج میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں تو اور بھی زیادہ شریف عورتوں اور لڑکیوں کو بدنام کرنے کا "مقدس فرض" انجام دیا جاتا ہے۔ ان کے لئے اطمینان سے سیوا کا کام کرنا ہر جگہ اسی طرح دشوار ہے۔

۱۸

صفیہ بیگم دیکھ رہی تھیں کہ گیتا بے حد اداس اور پریشان رہتی ہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ اسے عزیزوں کی بدسلوکی اور دوسرے لوگوں کی بدگمانی کا صدمہ قدرتی بات ہے۔ لیکن دنیا سے یہ بیزاری کیوں؟ روز بروز مرجھاتی کیوں جارہی ہے؟ لاکھ چاہا کہ وہ کسی کام میں لگ کر جی بہلائے مگر اس کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔ مرکز کے کام میں لگایا مگر دو چار دن بعد ہی اس نے چھوڑ دیا۔ "بس آیا۔ بھر پایا سوشل سروس کر کے۔ اب کوئی سماجی کام نہیں کروں گی۔" کہا ایم اے کی تیاری شروع کر دے۔ اس پر بھی راضی نہیں ہوئی۔ بس رٹ یہ تھی کہ کہیں نوکری دلوا دیجیے۔ لیکن نوکری ملنا کیا آسان ہے؟ نہ کوئی ٹریننگ، نہ ٹائپ، نہ شارٹ ہینڈ جانتی تھی۔ پھر آخر کام ملے تو کیا؟ بی اے پاس کو بہت کوشش کی جائے تو شاید ستر اسی کی کلرکی مل جائے۔ مگر کلرکی اسے پسند نہ تھی۔

"تو آخر پھر تم کرو گی کیا؟" ایک دن جھنجلا کر حبیب میاں نے کہا۔ "سماجی خدمت سے بیزار، ایم اے کا شوق نہیں؟ کلرکی تمھاری شان کے قابل نہیں، ٹریننگ کسی قسم کی لینا نہیں چاہتی ہو --- تو پھر چاہتی کیا ہو؟"

گیتا کا گلا رندھ گیا۔ جواب نہ دے سکی۔ حبیب میاں پریشان ہو کر صفیہ بیگم کو دیکھنے لگے۔ انھوں نے کوئی ایسی بات تو کی نہیں جس پر گیتا یوں رونے لگے۔ انھیں ایسے لوگ سخت ناپسند تھے جن کے آنسو پلکوں پر دھرے رہیں۔

لیکن گیتا نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑتی تھی۔ جانے اسے کیا ہوتا جارہا ہے؟ اس واقعہ کے بعد سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی تنک مزاج اور زود رنج ہوگئی ہے۔ یعنی یہ حال کہ "میاں" تک کی بات کا برا ماننے لگی، جو اس کے بزرگ، سرپرست، محسن سبھی کچھ ہیں۔ اب کیا وہ بدنصیب انھیں بھی ناراض کردے گی؟ اگر دماغ اور مزاج کا یہی عالم رہا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ نہ کچھ کرنا، نہ دھرنا۔ ہر بات سے انکار، ہر تجویز رد، ہر کوشش بیکار۔ کیا وہ عمر بھر دوسروں پر بار بنی پڑی رہے گی؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی نا کہ کملا نگر میں اس کے کام کی قدر نہ ہوئی؟ یا ماموں وغیرہ نے بدسلوکی کی۔ تو؟ عزیزوں سے نیک سلوک کی امید ہی کب تھی؟ رہے کملا نگر والے تو انھوں نے کیا بدسلوکی کی؟ کون سماجی کارکن ہے جس پر تنقید یا بدگمانی نہیں کی جاتی۔ کیا حبیب میاں اور صفیہ بیگم کو کم لوگوں کی باتیں سننا اور سہارنا پڑتی ہیں! پھر؟ پھر اس میں کیا لال لگے تھے کہ لوگ اسے کچھ نہ کہتے؟

گیتا کے والد کی عادت تھی کہ جب وہ کسی مسئلے پر زیادہ الجھتے تو اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ یوں تو وہ شاعر تھے۔ بڑے اچھے غزل گو۔ اپنے جذبات و احساسات کو زیادہ تر شعر ہی میں ڈھالتے تھے۔ مگر جب ان کا ذہن زیادہ الجھ جاتا تو خیالات کو صاف کرنے کے لئے نثر کا سہارا لیتے تھے۔ خود گیتا کو بچپن میں "بابا" کی طرح شعر کہنے کا شوق تھا اور وہ جب اپنے ٹوٹے پھوٹے شعر سناتی تو بابا اپنی ننھی شاگرد کو چھاتی سے لگا کر اس کا منھ چوم لیتے اور بڑے فخر سے اپنے دوستوں سے کہتے "میری لڑکی، میری جانشین بنے گی۔" لیکن چند سال بعد انھوں نے گیتا کو

شعر کہنے پر اُبھارنا بند کر دیا بلکہ اس سے کہتے "یہ بیکار لوگوں کا مشغلہ ہے تمھیں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیئے۔ پھر بعد میں اگر شوق باقی رہے تو دیکھا جائے گا۔" انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گیتا میں شعر گوئی کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو قدرت کی ودیعت ہوتی ہے اور جس سے شاعر اور متشاعر کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اب وہ اس کو لٹریچر پڑھاتے اچھے شعر و ادب کو سمجھنے کا ذوق پیدا کرتے۔ لکھنے کی مشق کیلئے وہ اس سے روزنامچہ لکھوایا کرتے تھے۔ اگرچہ بعد میں اس کی یہ عادت چھوٹ گئی تھی مگر اب بھی کبھی کبھی یہ شوق تازہ ہو جاتا تھا۔ شروع میں کملا نگر میں کئی مہینے تک ڈائری لکھتی رہی تھی مگر پھر کام کی زیادتی میں چھوٹ گئی۔ یہاں واپس آنے کے بعد اس نے کئی بار کوشش کی مگر دماغ کا یہ عالم تھا کہ کچھ کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔

آج اس نے سونے سے پہلے ڈائری اٹھائی ــــ لکھنے کی کوشش کی ــــ نہ لکھا گیا ــــ ڈائری کے پچھلے اوراق اُلٹنے پلٹنے لگی۔

کملا نگر میں گزاری گھڑیاں آنکھوں میں پھر رہی تھیں۔ وہ مرکز کی رونق، وہ ہماہمی، وہ گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں سے دوستی۔ ان کے اپنے اکھڑ انداز میں خلوص و اپنایت کا وہ رنگ ــــ وہ خالہ کی محبت اور خدمت، تارا اور لتا کے ساتھ مل کر وہ خوش گپیاں، وہ ساجو کی بے پناہ محبت، گہری دوستی، وہ اس کی دلکش شخصیت اور اس کی اور شبراتی کی زندگی کی دلچسپ جھلکیاں ــــ ندیم اور اقیم کا آنا اور زندگی کی ایک نئی لہر اندر اور باہر دوڑ جانا۔ وہ ان سب کا مل کر کملا نگر کو آئیڈیل بستی بنانے کے خواب! اور اس خواب کی وہ

تعبیر — کتنی بھیانک، کتنی دل شکن — کتنی خلافِ اُمید!!

اس نے قلم اُٹھایا اور ڈائری کے سادے ورق بھرنے لگی۔

۱۸ مارچ ۱۹۵۰ء

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

آہ کملا — کملا نگر! کتنا تجھے بھلانا چاہتی ہوں مگر نہیں بھول پاتی۔ کیوں اس بے وفا بستی کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے — کیوں اس کی رونق اور چہل پہل نہیں بھولتی۔

گزاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

خوشی کی گھڑیاں؟ اُنھ! ان تلخ دنوں کو میں خوشی کی گھڑیاں سمجھی ہوں! کون سی مسرت حاصل تھی وہاں؟ سندر ماموں اور ان کا خاندان؟ جاہل، قدامت پرست، تنگ دل اور خود پرست لوگ! مگر ہائے ماموں کا وہ پیار، جیسے پھر سے بابا کو پا لیا ہو — ان کی سیوا میں کتنا آنند آتا تھا — ان سے باتیں کر کے دل میں کیسی شانتی اور اپنایت کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ مگر! مگر کیا صلہ ملا اس سیوا اور پریم کا — بدگمانی، بے رحمی، نفرت اور دل آزاری ہی نا؟

پھر کیا ابن میاں اور ان کا گھرانہ یاد آتا ہے؟ پہلے پہل ایسا لگا جیسے بڑے میاں مجھ پر فدا ہی تو ہو گئے ہیں۔ سکینہ بیگم اور بڑی اماں کتنی محبت، کتنا خیال کرتی تھیں شروع میں! مگر آہ — دنیا ظاہر اور باطن میں کتنی مختلف ہوتی ہے۔ آنکھیں پھیریں تو ایسی جیسے کبھی ان تلوں

تیل ہی نہ تھا۔

اور پھر گاؤں والے؟ جن کی خدمت میں اتنے دن اپنی جان کھپائی، اپنوں سے مخالفت مول لی، ہر بات میں ان کا ساتھ دیا۔ سوا بدگمانی اور بدگوئی کے کیا بدلہ دیا انھوں نے! وہ ان کے چبھتے ہوئے جملے، شکی نگاہیں، وہ عورتوں کا منھ جوڑ جوڑ کر، آنکھیں مٹکا مٹکا کر، اس کی طرف اشارہ کر کر کے باتیں بنانا — آہ — یہ خود غرض اور احسان فراموش دُنیا!

مگر — سب لوگ تو ایسے نہیں تھے۔ مجھے یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اسی کملا نگر میں ایسے لوگ بھی تھے جو میرے پسینے پر خون بہانے پر تیار ہو جاتے۔ جگنا اور جمنا، مدھو اور نصیبن، ناتھو لال اور بھولا۔ وہ بھی تو اسی کملا نگر کے باسی ہیں — کتنی عزت، کتنا آدر، کتنا پریم کرتے تھے یہ سب مجھ سے۔ اور پھر میری پیاری ساجو اور اس کا بھولا پتی — ہائے ان جیسے پرخلوص دوست اب کہاں پاؤں گی؟ ان کی سی شرافت، ان کا سا خلوص اور محبت کہاں نصیب ہو گی۔ ان معصوم دلوں میں کتنی انسان دوستی، کتنی ہمدردی، کتنی سیوا کی لگن، علم کی پیاس، کچھ کرنے اور کچھ بننے کی لگن تھی۔ زندگی کی کٹھنائیوں کو ہنس کھیل کر جھیل جانے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں مسرت ڈھونڈنے کا گر کوئی ان دونوں سے سیکھے۔ آہ گیتا! گیتا!! اگر تو نے ان سے کچھ نہ سیکھا تو تجھ سے زیادہ ناکارہ کون ہو گا؟ سچ مچ تیرا سال برباد گیا۔ تو انھیں کیا سکھائے گی، اگر خود ان کی زندگی کو شمعِ راہ بنا سکے تو تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔

اس نے قلم دانتوں میں دبا لیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں کو ساڑھی کے پلو

سے پونچھا، کچھ دیر بلب کے گرد پھرتے پروانوں کو دیکھتی رہی — پھر سر جھکا، قلم حرکت میں آیا۔

"اور میری خالدہ — پیاری خالدہ — ہائے کتنا چاہتی تھی وہ مجھے! کیسے بھولوں وہ اس کی سوجی آنکھیں، کانپتے لب اور گھٹی ہوئی ہچکیاں۔ اور موتی بیگم، ننھی سی جو رو۔ اس کی معصوم محبت سے کتنی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ کیسی پچھاڑیں کھا رہی تھی جب میں آنے لگی۔ اور صدیق چاچا — جن کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی — اور پھر گاؤں بھر میں اس سرے سے اس سرے تک کتنی میری شاگردیں اور ان کی مائیں منھ پر پلو رکھ کر رو رہی تھیں — ہائے گیتا! تو ان کو احسان ناشناس اور بے محبت کہتی ہے؟

نہیں نہیں۔ یہ سال میرا برباد نہیں ہوا۔ میں نے اس میں کچھ کام کیا ہے، کچھ سیوا کی ہے، کچھ تجربہ حاصل کیا ہے؟ دنیا کے گرم و سرد کو سمجھا ہے، قدیم اور جدید کی کش مکش کو دیکھا ہے، مرتے ہوئے زمیندارانہ خیالات اور ابھرتے ہوئے ہندوستانی جمہوریہ کی جو جھلک وہاں دیکھی کیا ممکن تھا کہ شہر میں رہ کر دیکھ سکتی؟

"پھر کیا میں نے وہاں رہ کر — یہ سب دیکھا اور جھیل کر یہ بھی نہیں سیکھا کہ زندگی کامیابی اور ناکامی، تلخی اور شیرینی، دونوں کا مجموعہ ہے۔ جہاں سیوا اور پریم کے معجزے بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کم سمجھی اور نافہمی کی بدولت وہ خاک میں بھی مل سکتے ہیں۔ کارزارِ حیات میں ان دونوں کا چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔ اور ان سب کو سمجھنا، سلجھانا، انسان کا کام ہے۔"

اس نے قلم پھر رکھ دیا۔ بہت سے پروانوں کی لاشیں بجلی کے تیز

بلب کے آس پاس بکھری ہوئی تھیں اور بہت سے پروانے اب بھی اس کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ کیا ہے یہ محبت؟ کیوں پروانہ روشنی پر نثار ہوتا اور خوشی سے اپنی جان نچھاور کر دیتا ہے؟ گیتا اپنی ڈائری کو بھول کر کچھ دیر تک اس مسئلے پر سوچتی رہی — اور اسے یاد بھی نہ تھا کہ کب سوچتے سوچتے اس نے لکھنا شروع کر دیا۔

"مگر کملا نگر کی بھٹس زندگی میں بہار آئی ندیم کے دم سے۔ یہ دونوں دوست کیا آئے جیسے زندگی نکھر آئی۔ جیسے ساری بستی میں جان پڑ گئی۔ کتنے سادہ مزاج، کتنے پرخلوص کتنے ان تھک کام کرنے والے ساتھی تھے یہ دونوں۔ دل میں قوم کا سچا درد، اس کی بھلائی کی لگن، اس کی سیوا کا کتنا گہرا جذبہ ہے — انوپم — مانا کہ ذرا خود رائے اور خود پرست ہے، مگر کتنا سچا اور کھرا ہے —

اور ندیم! ان کی تو مثال ذرا مشکل سے ملے گی۔ ان کا سا جوش، ان کی سی بے لوث دوستی، ان کا سا حسنِ بیان، ان کی سی کشش کہاں ہوتی ہے کسی میں!

مانا کہ میاں ان سے خوش نہیں لیکن اس کی وجہ ان کا کوئی نقص نہیں، میاں کی غلط فہمی ہے۔ وہ کسی کا سایہ بن کر نہیں رہ سکتے۔ ان کی ایک شخصیت ہے، رائے ہے، اپنا سوچا سمجھا طرزِ عمل ہے — جس دن حبیب میاں ان کو پرکھ لیں گے وہ بھی ان کو ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

گیتا کی آنکھوں میں کچھ اور زیادہ چمک اور چہرے پہ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"ندیم تمہاری دوستی کی یاد تو میری سب سے بڑی دولت اور مسرت ہے۔

تم نے میری ہمت بندھائی، مجھے حوصلہ دیا، بے دھڑک کام کرنے اور نڈر ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ جھوٹی افواہوں اور بدگمانیوں کو ٹھکرانے اور پروا نہ کرنے کا گر سکھایا۔

تم نے کہا انسان کا کردار بلند اور بے داغ ہے تو دیر سویر لوگ اس کے کیرکٹر کا لوہا مان جاتے ہیں۔ مگر آہ — ندیم — تم سے الگ ہو کر — مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اب وہ حوصلہ، وہ لگن، وہ ذوق و شوق، وہ اُمنگ کیا ہوئی؟"

گیتا کی آنکھوں سے برکھا کی چند بوندیں کاغذ پر ٹپک پڑیں اور وہ چونک گئی! بڑی دیر تک کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی کے باہر جھلملاتے تاروں اور ڈوبتے ہلال کو دیکھتی رہی۔ کہیں دُور بارہ کا گھنٹہ زور زور سے بج رہا تھا۔ گیتا نے نیند اور غم کے بوجھ سے جھکی پلکیں اوپر اٹھائیں اور پھر قلم تھاما۔

"لوگوں کو میری اور ندیم کی دوستی آخر کیوں اتنی بُری لگی؟ میں انوپم سے، شبراتی سے، اور دس اور لوگوں سے بھی تو ملتی تھی؟ اس پر کسی کو اعتراض نہ تھا۔ ٹھاکر سندر سنگھ کا تو خیر ذکر ہی بیکار ہے۔ ان کی ٹھاکری ہماری وجہ سے خطرے میں تھی اس لئے انھیں تو دغا اور جھوٹ کا سہارا لے کر کیچڑ اچھالنی ہی تھی — مگر دوسروں نے ان کی بات کیوں سُنی؟ کیوں بدگمانی کی؟

آہ کتنی تنگ نظر اور بدگمان ہے یہ دنیا — یہاں زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا —

مگر ندیم! ندیم — تمہاری خاطر جی چاہتا ہے کہ زندہ رہا جائے۔ مگر؟

مجھے کیوں رہ رہ کر ندیم کا خیال آتا ہے؟ ہر بات پر وہی کیوں یاد آتے ہیں؟

یہ دوستی ہے یا کیا ہے؟ ہم مذاقی اور ہم خیالی ہے؟ یا — یا — ؟ یا محبت؟

پریم؟

نہیں نہیں — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ کیسے ہوگا؟ نہیں — نہیں — یہ غلط ہے —

ناممکن —

ایسا خیال مجھے کیوں آیا ....."

قلم گیتا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا — بھرے پیمانے چھلک پڑے اور اس کے چھینٹوں نے "پریم" اور "محبت" کو پھیلے دھبوں میں بدل دیا۔

۱۹

صفیہ بیگم کی لڑکی تو جب لکھنؤ میں پڑھتی تھی۔ ماں اسے بہت چاہتی تھیں اور اپنے سے اتنی دور بھیجنے پر تیار نہ تھیں مگر بیٹی کی ضد اور میاں کے اصرار پر مجبور ہو گئی تھیں۔ اس سال وہ تھرڈ ایر میں تھی کہ معلوم ہوا اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ بے قرار ہو کر ماں لکھنؤ پہنچیں اور بیٹی لاکھ روئی پیٹی، ساتھ آنے سے انکار کیا کہ میرا سال برباد ہو جائے گا، مگر وہ نہ مانیں اور ساتھ لے کر ہی واپس آئیں۔ سکندر پور میں اس کے معائنے وغیرہ ہوئے ماں کو شبہ تھا کہ خدانخواستہ ٹی بی نہ ہو مگر محض کمزوری نکلی۔ سال گزشتہ جو

ٹائی فائڈ ہوا تھا اس کے اثرات باقی تھے اور جسم میں خون کم بن رہا تھا۔ اچھی غذا، تازہ ہوا اور آرام کا مشورہ دیا گیا۔ ہار کر نرجس کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور اب وہ سارے دن پلنگ پر پڑی تازہ ترین ناول پڑھتی یا گپ لڑایا کرتی تھی۔

گیتا کملا نگر سے واپس آئی تو نرجس یہاں موجود تھی۔ دونوں ایک ہی کمرے میں رہنے لگیں۔ پہلے دونوں میں کوئی خاص دوستی نہ تھی۔ نرجس گیتا سے عمر میں بھی چھوٹی تھی اور تعلیم میں بھی جونیر تھی۔ ذہنی عمر تو اور بھی کم تھی۔ وہ اکثر بچوں کی سی باتیں کرتی اور گیتا اس سے کم سن لڑکیوں ہی کا سا سلوک کیا کرتی تھی۔ مگر اس بار دونوں میں جلد ہی دوستی ہو گئی۔ دو سال گھر سے باہر رہ کر نرجس میں کسی حد تک پختگی اور کچھ سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ طبیعتاً نرجس باتونی، کھلنڈری اور جذباتی لڑکی تھی۔ نازک مزاج ہونے کے باوجود دوسروں سے محبت اور خلوص سے پیش آتی۔ جتنی جلدی روٹھتی اتنی ہی جلدی من بھی جاتی تھی۔ غرض اس مہینے بھر کے ساتھ نے دونوں میں بہت بے تکلفی اور محبت پیدا کر دی تھی۔ نرجس ہر بات گیتا سے کہتی اور چاہتی گیتا بھی اسی طرح اس سے اپنے دل کے "راز" بیان کرے۔ لیکن نرجس کے پاس کوئی راز تھا ہی نہیں اور گیتا اپنے دل کے راز خود اپنے کو بھی ابھی تک نہ بتا پائی تھی۔

نرجس کی صحت کی طرف سے اب صفیہ بیگم مطمئن تھیں۔ اس کی رنگت گلاب کے تازہ پھول کی طرح شگفتہ ہو گئی تھی۔ لیکن گیتا روز بروز گیندے کا پھول بنتی جا رہی تھی اور صفیہ کو نرجس سے زیادہ اس کی فکر لگی ہوئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا روگ ہے جو اندر ہی اندر اسے

کملا رہی ہے۔ یہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ گیتا کچھ چھپا رہی ہے مگر کیا؟ اسے کسی سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے یہ اندازہ انھوں نے لگا لیا تھا۔ مگر کس سے؟ کون ہے وہ آخر؟ کملا نگر میں تین ہی نوجوان تھے جن سے وہ متاثر ہو سکتی تھی۔ سکندر، انوپم اور ندیم۔ ان میں سے آخر اسے کس سے لگاؤ ہو گیا ہے؟ اور بار بار اُن کے دل میں یہ شبہ سر اُٹھاتا کہ وہ ندیم ہے۔

"مگر — مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان دونوں کے درمیان مذہب کی آہنی دیوار حائل ہے۔ مانا کہ ندیم مذہبی نہیں۔ مگر گیتا تو ہے۔ ممکن ہے کہ محبت کی خاطر وہ مذہب کے بندھن توڑنے پر تیار ہو۔ لیکن سماج؟ وہ اسے اس کی اجازت کیسے دے گا۔ پھر۔ مجھ پر کس قدر الزام آئے گا۔ اس کے خاندان والے ہی نہیں، ساری برادری ہندو مسلمان کا سوال کھڑا کر کے میری دشمن بن جائے گی۔ ممکن ہے کوئی جھگڑا کھڑا کر دیا جائے۔ سب کہیں گے ہندو لڑکی کو گھر میں رکھ کر بہکا لیا۔

اور پھر یہی کیا۔ گیتا کے رستے میں تو اور بھی بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ اس کے ماں باپ کی کی ہوئی منگنی میں کیسے توڑ دوں؟ ماں باپ نے سوچا تھا بچی ان کے بعد بے سہارا نہ رہے۔ اچھا گھرانہ، پڑھا لکھا خوبصورت لڑکا دیکھ کر بے چارے لڑکی کو پابند کر گئے تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی دنیا اس سے منھ پھیر لے گی۔ کتنا انھوں نے گیتا کی ساس کو سمجھایا مگر وہ تو ایسی بے رخی سے ملیں جیسے کبھی ان تلوں تیل ہی نہ تھا۔ اور پھر کچھ دن بعد ہی بغیر کہے سُنے خدا جانے سکندر پور سے کہاں چلے گئے۔ کچھ اتا پتہ بھی تو نہیں چھوڑا۔

• سمجھ میں نہیں آتا کہ اب لڑکی کا کیا ہوگا؟ ادھر میں لٹکا رکھا ہے

نہ نسبت چھڑاتے ہیں نہ بیاہ کی تحریک کرتے ہیں۔ اگر کہیں گیتا نے ندیم سے بیاہ کر لیا تو؟ اوہ —— پھر تو جانے وہ لوگ کیا ہنگامہ کھڑا کریں۔ کیسے یہ گتھی سلجھے گی؟ گیتا منھ سے کچھ پھوٹتی بھی تو نہیں۔ ممکن ہے یہ سب میرا وہم ہی ہو —— بچاری لڑکی۔ کیا کروں؟ کیسے اسے بے سہارا چھوڑ دوں۔ اس نالائق لڑکے کا پتہ چلے تو اسے ہی خط لکھ کر پوچھوں کہ کیا ارادہ ہے۔۔۔۔"

صفیہ بیگم کو جس بات کی فکر لگ جاتی بس اس کے پیچھے پڑ جایا کرتی تھیں۔ آج کل گیتا نے ان کی راتوں کی نیند اچاٹ کر رکھی تھی۔ اب وہ اس کھوج میں لگ گئیں کہ کسی طرح گیتا کے منگیتر کا پتہ چلا کر اسے خط لکھیں۔

سابو کا خط کبھی کبھی گیتا کے پاس آ جایا کرتا تھا۔ آج جو خط آیا اس میں لکھا ہوا تھا۔ "گیتا بی۔ ندیم بھیا بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ سُنا ہے کسی بات پر صدیق میاں سے ان بن ہو گئی۔ تمھارے جانے کے بعد سب ہی بد دل ہو گئے ہیں۔ انوپم بھیا اور ندیم میں بھی نہیں بنتی۔ مرکز کا کام بالکل ٹھپ ہو گیا ہے۔ بھلا میں کیا خاک پڑھا سکوں ہوں؟ مدرسہ بھی اللہ جانے چلے گا یا نہیں۔ ایک لونڈا سا ماسٹر آیا ہے۔ بھلا کیا خاک پڑھاوے گا۔ ہاں انوپم بھیا ابھی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔۔۔۔"

گیتا نے خط پڑھا تو سوچ میں کھو گئی۔ ندیم کیوں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟ کچھ بھی تو سمجھ میں نہ آیا اور فکر اور بڑھ گئی۔

اس خط کے چھ ستھے دن ندیم سکندر پور پہنچ گیا۔ دو دن تک گیتا سے اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بار بار جی چاہتا کہ جہاں ندیم میاں اور آپا

سے بات کر رہا ہے، وہاں جا کر بیٹھے، مگر عین وقت پر ہمت جواب دے جاتی۔ کئی بار دروازے تک جا جا کر لوٹ آئی۔ نرجس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ندیم نے کسی وظیفے کی درخواست دی ہے اس کے لئے کوشش کرنے آیا ہے۔

دو رات سے وہ سو نہ سکی تھی۔ ساری رات اُدھیڑ بُن میں گزر جاتی۔ نرجس کی آنکھ کھلتی تو وہ اسے یا بیٹھے دیکھتی یا کروٹیں بدلتے۔ "گیتا آخر کیا مصیبت ہے۔ سوتی کیوں نہیں ہو؟" وہ معصومیت سے پوچھتی اور چند منٹ میں پھر غافل ہو جاتی اور گیتا پھر اپنی الجھنوں میں کھو جاتی۔

تیسرے دن شام کو صفیہ بیگم نے بلایا کہ چائے ان کے کمرے میں لگی ہے وہیں آکر پیو۔

گیتا وہاں پہنچی تو سامنے ہی تخت پر ندیم بیٹھا نظر آیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ جھجکی مگر پھر آگے بڑھ آئی۔

"آؤ گیتا۔ کب سے ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے ٹھنڈی پالا ہو گئی۔ نرجس اور چائے دم کرا لو۔" صفیہ بیگم نے اسے دیکھ کر کہا۔ اور گیت کانپتے دل مگر مضبوط قدموں سے آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ندیم جو اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا پھر بیٹھ گیا۔

"کیسا مزاج ہے؟ بڑی دبلی ہو رہی ہیں آپ۔" ندیم نے آہستہ سے پوچھا اور گیتا نے محسوس کیا کہ اس سادہ سے جملے کے پیچھے جوش اور اشتیاق کی کپکپاہٹ موجود ہے۔

نرجس تازہ چائے دم کر کے لائی اور سب کو بنا کر دی۔ خاموشی سے سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ آخر نرجس نے بات شروع کی۔

"ندیم صاحب آپ تو ابھی کملا نگر ہی میں ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں نے وہاں سے استعفےٰ دیدیا ہے۔"

"کیوں؟" صفیہ بیگم نے غور سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"میں — مجھے — دراصل میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ ایک وظیفے کے لئے کوشش کرنے آیا ہوں۔ حبیب میاں چاہیں تو مل سکتا ہے۔"

صفیہ بیگم خفیف سا مسکرائیں۔ پیالی کشتی میں رکھی اور پلنگ پر سے اپنی شال اٹھاتی ہوئی بولیں۔ "اچھا بھئی تم لوگ چائے پیو۔ مجھے ذرا ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ گھنٹہ بھر میں آجاؤں گی۔"

ان کے جانے کے بعد چند منٹ پھر مکمل خاموشی رہی۔

"کہو گیتا۔ آج کل کیا شغل ہے۔" ندیم نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" کھوئے ہوئے انداز میں گیتا نے جواب دیا۔

"ایم اے میں داخلہ لیں گی اگلے سیشن میں؟"

"غالباً نہیں۔"

"پھر؟"

"چاہتی ہوں کوئی کام مل جائے۔ مگر ملتا نہیں۔"

"کملا نگر میں سب تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔"

"آہ! وہاں سب کیسے ہیں؟ ساجو دیدی کا کیا حال ہے؟ شرابی بھیا، صدیق چاچا۔ سب کا حال سنائیے۔" پہلی بار گیتا کے لہجے میں کچھ جان پیدا ہوئی۔

"سب اچھے ہیں اور تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔"

"اور میری خالدہ؟ اور موتی بیگم؟ اچھی تو ہیں؟ مجھے خط کیوں

نہیں بھٹکتیں!"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ موتی بیگم تو اب جا کر تمھیں ذرا بھولی ہے ورنہ ہر وقت گیتا دیدی کی تسبیح پڑھتی رہتی تھی۔ تمھارے آنے کے بعد کئی دن تک تو اسے تیز بخار چڑھا رہا اور غفلت میں بھی تمھارا ہی نام اس کی زبان پر تھا۔"

گیتا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اور خالدہ بھی تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔ اتنی اداس رہنے لگی ہے تمھارے آنے کے بعد سے — مگر۔ تم۔ کتنی بے مروت ہو۔ سب کو چھوڑ کر چلی آئیں۔"

گیتا کچھ جواب نہ دے سکی۔ نرجس کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ چپکے سے باہر چلی گئی تھی۔

"ٹھاکر کے ہاں سب کیسے ہیں؟" گیتا کتنا چاہتی تھی کہ ان سخت دل رشتے داروں کو بھلا دے مگر اب تک کامیاب نہ ہوئی تھی۔

"اچھے ہیں سب۔ مجھ سے تو بات کرتے نہیں۔ انویم سے پھر تعلقات ہو گئے ہیں۔ سنا ہے وہ حضرت ان کی لڑکیوں کی شادی کرانے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔" طنزیہ لہجے میں ندیم نے کہا۔

"سچ مچ تارا اور رکتا کی شادی ہو رہی ہے؟" اشتیاق سے گیتا نے کہا۔

"ہاں سنا تو ہے۔"

"اور انویم کیسے ہیں۔ ساجو دیدی سنا ہے کہ مرکز چلا رہی ہیں۔"

"ہاں انویم نے انھیں عورتوں کے مرکز کا انچارج بنوا دیا ہے اور خود اسی سوشل سروس کے ڈھونگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر در اصل

کسی کام میں بھی جان نہیں رہی " گیتا کو ندیم کا یہ اندازِ گفتگو کچھ اچھا نہیں لگا۔

اور اب دونوں نے محسوس کیا کہ کمرے میں وہ تنہا ہیں تو پھر خاموشی چھا گئی۔ گیتا نے بچی کھچی چائے کو ایک پیالی سے دوسری پیالی میں ڈالنے کا ضروری اور دلچسپ کام بڑے انہماک سے شروع کر دیا۔

"گیتا ... ؟"

"ہوں ۔"

"تم مجھ سے بغیر ملے کیوں چلی آئیں ۔" شکایت بھرے لہجے میں ندیم نے کہا۔

"آپ خود ہی کہیں غائب ہو گئے تھے ۔" گیتا نے صفائی دی۔

"تم نے مجھے بتایا کب تھا کہ تم واپس سکندر پور جا رہی ہو ۔"

"میرا ارادہ تھا ہی نہیں۔ میاں نے کہا تو آنا پڑا ۔"

"تم معلوم ہوتا ہے لوگوں کی باتوں سے گھبرا کر چلی آئیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی کم ہمت ہو کہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی۔ تمھیں وہیں رہنا اور مخالفوں اور مخالفتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ تم اگر زندگی بھر دوسروں کی رائے پر چلتی رہیں تو تمھاری پرسنلٹی دب کر رہ جائے گی۔ تمھاری اپنی رائے — اپنا ارادہ ... ۔"

ندیم کی واعظانہ رگ پھڑک اٹھتی تھی۔ گیتا کو اس کی یہ باتیں ناگوار گزریں۔

"ندیم صاحب میں اس دھوکے میں نہیں کہ مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عقلمند نہیں ہے۔ میں نو عمر ہوں، ناتجربہ کار ہوں۔ میاں اور آپا

میرے بزرگ ہیں اور میرا بھلا بُرا مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"یہ سب قدامت پرستی کی باتیں ہیں۔ تم جیسی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی میں خود اعتمادی، خود مختاری ہونی چاہیئے۔ تم نے غلطی کی۔ تمھیں کملا نگر میں رہنا چاہیئے تھا اور۔۔۔۔"

بات کاٹ کر گیتا نے کہا۔ "چلیئے خیر میں تو قدامت پرست اور کمزور و کم ہمت ہوں، مگر آپ جیسا مردِ میدان کیوں بھاگ آیا؟" گیتا کی اس چوٹ پر ندیم گھبرا سا گیا۔ پھر بولا۔

"سچ سچ بتاؤں؟"

"ہاں ہاں بتائیے۔"

"تمھارے آنے کے بعد میرا دل وہاں نہیں لگا۔ ساری بستی اداس، ویران، بے رنگ اور بے کیف نظر آتی تھی۔ بقولِ شاعر یہ حال تھا جیسے کہ ؎

ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

گیتا کا چہرہ پہلے گلابی اور پھر زرد ہوگیا۔ جواب دینے کے لئے مُنھ کھولا ۔۔۔ پھر بند کرلیا۔

"وظیفے کا تو بہانا بنایا ہے دراصل تمھارے آنے کے بعد وہاں رہنے کو دل ہی نہ چاہا۔" ندیم کی نظروں میں اور لہجے میں اشتیاق، جوش اور بیقراری چھپی ہوئی تھی۔ اور دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو اِن نظروں کو نہ پہچان سکے۔ اس زبان کو نہ سمجھ سکے۔ مگر گیتا سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے موضوع بدلا۔ "سُنا ہے صدیق چچا سے آپ کی ان بن ہوگئی۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"ماجو نے لکھا تھا۔ مگر چاچا تو آپ کو بہت چاہتے تھے۔ آپ ان سے بھی لڑ پڑے؟"

"ہاں اپنی غرض کو سبھی چاہنے لگتے ہیں۔ مگر ان کی اور ان کی ماں بہن کی محبت میرے لئے مصیبت بن گئی"

"محبت کبھی مصیبت نہیں بن سکتی" بے ارادہ گیتا نے کہا۔

"کیا دل سے کہہ رہی ہو؟ واقعی تمہارا یہی خیال ہے؟" ندیم نے جوش مسرت کے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"میرا کیا ساری دُنیا کا یہی خیال ہے — ہاں تو بات کیا ہوئی؟"

"وہی جو ہر ہندوستانی گھر میں ہوتا ہے۔ کوئی کنوارا مرد نظر آیا اور سب کی رال ٹپکی۔ میں ان لوگوں کی خصوصیت سے پہلے ہی کھٹک گیا تھا اندیشہ صحیح نکلا۔ صدیق چچا نے ابا کو لکھا اور انھوں نے مجھے اور پھر صدیق صاحب نے خود بھی مجھ سے کہا —"

"مگر کیا؟" گیتا سمجھ گئی تھی مگر ندیم کے منھ سے پوری بات معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"یہ کہ میں خالدہ سے شادی کرلوں"

"تو پھر —؟"

"ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا"

"کیوں انکار کر دیا؟" حیرت سے گیتا نے پوچھا۔ "خالدہ تو بڑی پیاری لڑکی ہے۔ صورت میں سیرت میں۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص جس سے خالدہ بیاہی جائے" خلوص سے گیتا نے یہ بات کہی۔

" بے شک ہوگا۔ مگر افسوس کہ وہ میں نہیں۔ میرے خوابوں کی ملکہ خالدہ نہیں کوئی اور ہے۔" ندیم کی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی ہوگئی۔
" آپ کے انکار سے چاچا کو بہت صدمہ ہوا ہوگا۔" جلدی سے گیتا نے بات پلٹی۔
" رنج ؟ وہ تو سخت ناراض ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ میں نے ان کی بڑی انسلٹ کی۔ یعنی وہ خود اپنی لڑکی پیش کریں اور اسے ٹھکرا دیا جائے۔ اس سے بڑا داغ ان کے لئے اور کیا ہوتا۔" کچھ مذاق اڑانے کے انداز میں ندیم نے کہا۔
" میری سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ نے انکار کیوں کیا ؟"
" تمھاری سمجھ خاصی موٹی ہے۔"
" کیا خالدہ ؟ میرا مطلب ہے خالدہ کو — یعنی خالدہ کو بھی آپ کے انکار کا صدمہ ہے ؟"
" معلوم نہیں۔ البتہ کلو کہہ رہی تھی کہ آپا آج کل دن رات رویا کرتی ہیں۔"
" ہائے میری خالدہ۔ آپ کتنے کٹھور ہیں ندیم صاحب۔ کم سے کم آپ کو خالدہ کے جذبات کا خیال کرنا چاہیئے تھا۔"
" خوب ! اس کے جذبات کا خیال کرتا اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی تمنا کو خاک میں ملا دیتا ؟ خالدہ بچاری پرانے زمانے کی دبّو گھنّو جذباتی لڑکی ہے۔ نہ اس نے دنیا دیکھی نہ کسی سے ملی جلی۔ جو پہلا مرد اس کی زندگی میں آیا بے سوچے سمجھے اس سے محبت کرنے لگی۔ یوں کہوں کہ پسند کرنے لگی جسے اس بے وقوف نے محبت سمجھ لیا۔ چند دن

میں بھول جائے گی اور کسی دوسرے سے خصوصیت پیدا ہو جائے گی۔"
ندیم نے ہنس کر کہا۔

"آپ کو اس طرح ایک شریف معصوم لڑکی کا مذاق اُڑانے کا کوئی حق نہیں۔ میں پوری طرح اس کے خیالات سے واقف نہیں، مگر اس کے مزاج اور طبیعت کو خوب سمجھتی ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ اسے آپ سے گہری، سچی اور امٹ محبت ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں ہے جو محبوب کے لئے چپ چاپ جان دے سکتی ہیں۔ جو زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہیں۔ پہلی اور آخری ....."

"مگر محترمہ ___ میں ان لڑکوں میں سے نہیں ہوں جو وقتی دلچسپی یا کشش سے متاثر ہو کر اپنی پوری زندگی داؤں پہ لگا دیتے ہیں۔" ناگواری سے ندیم نے کہا۔

گیتا خاموش ہو گئی۔

"گیتا ___ شادی کے معاملے میں میرے خیالات دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں۔ نہ میں خاندانی بندشوں کا قائل ہوں نہ مذہبی قیود کا۔ میری نظر میں رسمی شادی اس سچی محبت کی تکمیل ہے جو دو دلوں کے میل سے پہلی نظر میں پیدا ہو جاتی ہے۔ شادی دو ہم آہنگ روحوں کا سنگم ہے۔ شادی دو ایسے انسانوں کا معاہدہ ہے جو قدم سے قدم ملا کر زندگی کی کٹھن سے کٹھن راہ کو پار کر سکیں، سخت سے سخت منزل کو آسان بنا سکیں۔ میرے نزدیک شادی بنیاد ہے گہری، سچی، پائیدار دوستی کی ___ وہ دوستی جس میں ہم مذاقی ہو، ہم خیالی ہو، ہم آہنگی ہو، بھروسہ ہو، اعتماد ہو۔ شادی نہ میرے لئے محض جسمانی تسکین کا ذریعہ ہے نہ سماجی بندھن

بلکہ ــــ میں تو ــــ میرا تو ــــ"

گیتا کی آنکھیں نیم وا تھیں، دراز پلکوں پر چند موتی کانپ رہے تھے، ہاتھوں سے کرسی کے ہتھے کو زور سے پکڑ رکھا تھا۔ ندیم کا ایک ایک لفظ اسے اپنے دل سے نکلتا اور دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

ایک لمحہ ــــ ایک پل ــــ یا ایک سال گزر گیا۔ آگے کیا ہوتا؟ کون جانے۔ ندیم کھڑا ہو گیا تھا۔ گیتا کی اور ایک قدم بڑھا چکا تھا کہ اچانک چق اٹھا کر ترجبن اندر داخل ہوئی، ایک لمحے کو جھجکی اور پھر تیز لہجے میں بولی۔

"اوہ ــــ گیتا تم یہاں اندھیرے میں بیٹھی ہو اور میں سارے گھر میں ڈھونڈ آئی۔ چلو میاں بلا رہے ہیں"

اور دونوں ایک دم آسمان سے زمین پر آ رہے۔

۳۰

صفیہ بیگم نے کسی نہ کسی طرح گیتا کے منگیتر کا پتہ معلوم کر کے اسے خط لکھا اور جواب کی منتظر تھیں کہ ندیم آ دھمکا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ ندیم گیتا کی وجہ سے آیا ہے اور اب وہ واقعی پریشان تھیں۔ گیتا ان کی بچپن کی سہیلی، ساتھ کی کھیلی کی اکلوتی بچی تھی جسے ماں باپ دونوں بے سہارا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے: چچاؤں نے زیور، مکان اور تھوڑا بہت جو روپیہ تھا وہ ہضم کر لیا تھا اور ہونے والی سسرال نے رکھائی سے منہ موڑ لیا تھا۔ ایک ٹوٹے مارے ماموں

کہیں سے ملے تھے تو انھوں نے یہ سلوک کیا؟ اب سوا ان کے گیتا کا ہے
ہی کون؟ انھیں وہ دن اب تک یاد تھا جب گیتا ایک دن چچا کی سختیوں
سے عاجز آکر اسکول سے سیدھی ان کے گھر چلی آئی تھی اور ان کی گود میں
گر کر اس بیقراری سے روئی تھی کہ صفیہ بیگم کی خود ہچکیاں بندھ گئی
تھیں۔ سولہ سترہ برس کی اس یتیم و بسیر لڑکی پر دس بارہ آدمیوں کی ایسی
یورش تھی کہ اس کا دل و دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ کہاں وہ دن کہ ماں
جان دیتی، باپ پروانہ وار فدا رہتے یا اب یہ حال کہ در و دیوار دشمن
نظر آتے۔ صفیہ اور حبیب میاں سے وہ بچپن سے مانوس تھی اور انھیں
نرجس کے ساتھ "آپا" اور "میاں" ہی کہتی تھی۔ ساری دنیا میں وہی
ایک اسے اپنے نظر آئے اور جب اس کے حواس ٹھیک ہوئے تو سارا
حال ان کو بتایا۔ صفیہ نے اسے واپس اس کے خاندان میں بھیجنے سے انکار
کر دیا۔ ایک دو بار چچا اور پھوپی نے لے جانے کی کوشش کی مگر گیتا نے
جانے اور حبیب میاں اور صفیہ نے بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ سب کچھ
ان کے قبضے میں آچکا تھا۔ اب گیتا رہے گی تو خرچ ہی تو ہوگا، یہ سوچ کر
وہ چپ ہو رہے۔ مگر جب صفیہ نے ان سے گیتا کے زیور، بنک کے روپے
اور گھر کا مطالبہ کیا تو وہ لوگ بگڑ کھڑے ہوئے۔ "تھا ہی کیا؟" اور پھر
"ہندو لڑکی کا جائداد پر حق ہی کیا ہے؟" "زیور سب بک گیا گیتا کو پڑھانے
میں" "ایسے ہی بیکار کے بہانے بنائے گئے۔ صفیہ کرتیں تو کیا؟ حبیب میاں
سے کہا تو انھوں نے سمجھایا، بھڑوں کے چھتے کو نہ چھیڑو تو بہتر ہے۔ ہمیں
خدا دے گا تو تم اسے نرجس سے زیادہ دیدینا۔ خود گیتا نے کہا "آپا چھوڑیئے
ان سب چیزوں کو۔ میں اس نرک سے چھوٹ کر آپ کے پاس آگئی۔ مجھے

اب کچھ نہیں چاہیئے۔" چچاؤں نے حبیب میاں جیسے بارسوخ آدمی سے جھگڑا مول لینا تو مناسب نہ سمجھا، مگر ان کو، صفیہ کو اور گیتا کو بدنام کرنے کا فرض برابر ادا کرتے رہے تاکہ قصبے کے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکائیں۔ لیکن حبیب میاں کی خدمات اور صفیہ کے اخلاق اور شرافت کی ساری بستی گرویدہ تھی۔ بہت کم لوگوں نے ان کی باتوں پر دھیان دیا۔ خود کرشن دریا ماتھر کی سکندرپور میں بڑی عزت تھی۔ وہ اچھے شاعر ہی نہیں بہت اچھے انسان بھی تھے اور لوگ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مگر مرنے کے بعد کون کس کو یاد رکھتا ہے؟ پھر پرائے پھٹے میں کیوں خواہ مخواہ پاؤں ڈالا جائے، چنانچہ کسی نے گیتا کے حق میں آواز نہ اٹھائی۔

البتہ گیتا کی ہونے والی سسرال کو یہ بہانہ اچھا ہاتھ آیا۔ جب انھوں نے اپنے لڑکے سے گیتا کی نسبت کی تھی تو وہ ایک مشہور اور خاصی اچھی حیثیت والے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور انھیں اطمینان تھا کہ ان کا جو کچھ ہے وہ سب ہمارے گھر ہی میں آئے گا۔ ان کا لڑکا بھی اس وقت صرف ایف اے میں پڑھ رہا تھا۔ لیکن زمانے نے پلٹا کھایا۔ گیتا اناتھ، بے سہارا، مفلس رہ گئی اور ان کا لڑکا اب ولایت تعلیم کے لئے گیا ہوا تھا۔ جس کے لئے کسی بھی وزیر، امیر بلکہ گورنر تک کی بیٹی ملنا مشکل نہ تھا۔ اب گیتا جیسی لڑکی سے اس کی قسمت کیوں پھوڑی جائے؟ لیکن کہیں یہ سب باتیں زبان سے کہی جا سکتی ہیں؟ چنانچہ انھوں نے گیتا کو بدنام کرنے کا فرض اپنے ذمے لے لیا۔ کیسی بے باک، بے شرم، دیدہ دلیر لڑکی ہے؟ اپنا گھر، اپنا کنبہ، برادری، یہاں تک کہ اپنے ہم مذہبوں کو چھوڑ چھاڑ غیروں کے گھر رہتی ہے!! بھلا ایسی لڑکی سے کون اپنے بیٹے

کی قسمت پھوڑے گا؟ صفیہ بیگم کے کانوں میں جب ان باتوں کی بھنک پہنچی تو وہ موقع دیکھ کر خود گیتا کی ہونے والی ساس کے پاس پہنچیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ کی پڑھی اور بچپن کی سہیلی تھی۔ انھوں نے بظاہر خوب صفیہ بیگم کی خاطر داری کی۔ بڑی تعریف کی مگر گیتا کے بیاہ کے سوال کو — اڑا گئیں۔ جب صفیہ نے بار بار پوچھا کہ تمھارا لڑکا کب واپس آ رہا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ اس کے آتے ہی گیتا کا لگن ہو جائے تو انھوں نے خوب چبا چبا کر باتیں کیں۔ "اے ہے بہن میں خود بہت چنتا میں ہوں۔ ماتا پتا کی لگائی سگائی آجکل کے لڑکے لڑکیاں کہاں پسند کرتی ہیں۔ مجھے تو بڑی الجھن ہے کہ للو جانے آکر یہاں بیاہ کرے گا بھی یا نہیں۔ اس کے تو روز ایک نہ ایک بڑے سے بڑے گھرانے سے پیام آ رہے ہیں — مگر بوا ہم تو اپنے لڑکے کی خوشی میں خوش ہیں — اور پھر مجھے تو اپنی زبان کا پاس ہے — اسے نہ ہو تو اور بات ہے۔"

صفیہ کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے صرف اتنا کہا۔ "ہاں بہن زبان ہی تو سب کچھ ہے۔ چاہے دنیا کے سامنے ذلیل اور ایشور کے سامنے پاپی بنوا دے، چاہے سرخرو کر دے۔ اگر لوگ روپے پیسے کے لالچ میں آکر اپنی زبان سے پھر جایا کریں تو یہ دنیا کاہے کو رہنے کے قابل رہے گی۔"

انھوں نے ان کے لڑکے کا پتہ بہت پوچھا مگر اس کی ماں ٹال گئیں۔ اس کے بعد اکثر ان کے کانوں میں یہ باتیں پڑتی رہتیں کہ گیتا کی سسرال والے انھیں اور گیتا کو بدنام کرتے ہیں۔ اپنی تو انھیں پروا نہ تھی مگر اس معصوم لڑکی کی فکر ضرور تھی جس کا اب دنیا میں ان کے سوا اور کوئی نہ رہا تھا۔ مگر مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے کہتے کی زبان کیسے پکڑی جا سکتی ہے۔

مگر انھوں نے اس کی بہت کوشش کی کہ گیتا کے کانوں تک یہ باتیں نہ پہنچیں۔

کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ گیتا کے ہونے والے سسر کا تبادلہ کہیں اور کا ہو گیا اور وہ لوگ بغیر کہے سنے چلے گئے۔ صفیہ اگر کبھی اپنی پریشانی کا اظہار حبیب میاں سے کرتیں تو وہ الجھ کے کہتے۔ "تمھیں کاہے کی فکر ہے ان لوگوں کی لاکھ دفعہ غرض پڑے گی تو ہاتھ پاؤں جوڑ کر گیتا کو بیاہ لے جائیں گے۔ نہیں تو کیا ہماری گیتا بیٹی کے لئے بر کی کمی ہے؟" مگر صفیہ تو جانتی تھیں کہ منگنی ٹوٹنے کے بعد لڑکی کا بیاہ ہونا کتنا کٹھن ہو جاتا ہے اور پھر جب لڑکی غریب بھی ہو! آج کل کے زر پرستوں کی نظر میں سب سے بڑی خوبی دولت اور اقتدار ہے یہ وہ خوب دیکھ چکی ہیں۔

گیتا کو کسی بات کی تفصیل معلوم نہ تھی۔ بس اتنا یاد تھا کہ سات آٹھ برس پہلے بابا اور ماں نے خوب جھلملاتے کپڑے پہنائے تھے، گھر میں بہت سے مہمان آئے تھے اور مٹھائی بٹی تھی۔ بابا کے مرنے کے بعد اس کی ہونے والی ساس ماں کے پاس آکر بہت رویا اور ہمدردی کیا کرتی تھیں اور گیتا کے دل میں ان کے لئے بڑی محبت سی پیدا ہو گئی تھی مگر ماں کے مرنے کے بعد اس نے صرف ایک بار انھیں دیکھا تھا اور ان کے بیٹے کا تو صرف نام ہی سنا تھا۔ منگنی ہے یا ٹوٹ گئی؟ اس کا منگیتر کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہ وہ نہ جانتی تھی اور نہ اسے کچھ زیادہ جاننے کا شوق تھا۔ جس شخص کو کبھی دیکھا ہی نہیں اس سے گیتا کو نہ کوئی دلچسپی تھی نہ انس۔ اس پر اتنی مصیبتیں پڑیں، ایسی تباہی آئی اور اس شخص نے دو حرف ہمدردی کے نہ لکھے۔ ایسے آدمی سے زندگی بھر کی رفاقت

اور دوستی کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ وہ تو بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتی تھی کہ وہ لوگ اس کی منگنی توڑ دیں۔ وہ آزاد ہو جائے اور مزے سے جتنا چاہے پڑھے، نوکری کرے، ولایت جائے۔ شادی کی خواہش ابھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

لیکن صفیہ کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ وہ گیتا کو ایک امانت سمجھتی تھیں جس کو حفاظت سے اس کے شوہر کو پہنچانا ان کا فرض ہے۔ جب سندر سنگھ کے پاس گیتا چلی گئی تو اگرچہ صفیہ پر اس کی جدائی بہت شاق تھی، مگر دل کو بڑا اطمینان تھا جیسے بھاری بوجھ سینے پر سے سرک گیا ہو۔ مگر جب وہ کملا نگر سے واپس آئی تو ایک بدلی ہوئی ہستی کے روپ میں۔ اور اس تبدیلی کی وجہ بھی زیادہ دن تک ان سے چھپی نہ رہ سکی۔ مگر اس کا انجام؟ مسلمان لڑکا اور ہندو لڑکی!! مگر اب تو ایسی شادیاں ہوتی ہیں۔ قانون نے اجازت دیدی ہے کہ ہر مذہب، ذات اور خیال کے لوگوں کی آپس میں شادی ہو سکتی ہے۔ مگر — مگر — صرف قانون سے کیا ہوتا ہے۔ سماج تو نہیں مانتا... اور پھر — گیتا کی پوزیشن تو اور بھی نازک ہے، وہ ایک مسلمان کے گھر میں رہتی ہے۔ حبیب میاں کے لوگ دشمن ہو جائیں گے خود صفیہ بیگم کو بدنام کریں گے۔ گیتا پر کیچڑ اچھالیں گے۔ کہیں کوئی جھگڑا نہ کھڑا کر دیں؟ کوئی نیا فتنہ! الکشن قریب ہے اور اس موقع کو بہانا بنا کر فساد کرا دینا کیا مشکل ہے؟ یوں بھی گیتا تو امانت ہے۔ امانت میں خیانت کیسے کی جا سکتی ہے؟ مگر — گیتا کوئی گڑیا نہیں۔ کوئی روپیہ یا سونا نہیں — بے جان بے حس چیز جس کو حفاظت سے رکھا جائے اور جس کی ہو اسے سونپ دیا جائے۔ وہ پڑھی لکھی، بالغ اور سمجھدار

لڑکی ہے۔ اس کو حق ہے کہ اپنے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کرے۔ میں اسے کیسے روک سکتی ہوں؟ مگر ماں باپ کی رائے کا تو احترام اس پر فرض ہے۔ بے شک۔ مگر وہ لالچی خود غرض لوگ تو خود ہی منھ چھپا گئے۔ جانے خود وہ کیسا ہے؟ خط کا جواب دے گا بھی یا نہیں؟ جانے کیا لکھے کیا نہ لکھے۔۔۔ اور بیاہ ہو بھی گیا تو اللہ جانے گیتا اس کے ساتھ خوش رہ بھی سکے گی کہ نہیں؟

اس قسم کے بہت سے خیالات آج کل صفیہ بیگم کی راتوں کی نیند اڑائے ہوئے تھے۔ اور آج کی رات تو انھیں پوری ہی جاگتے گزر گئی تھی۔ مگر صبح کو ڈاک آئی تو اس میں گیتا کے منگیتر کا خط تھا۔ صفیہ بیگم اسے پڑھ کر سوچ میں پڑ گئیں۔

دو دن سے ندیم گیتا سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلے اور گیتا ٹال رہی تھی۔ آخر ندیم نے صفیہ بیگم، نرجس اور گیتا تینوں کو فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ اگرچہ دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپا بھی چلنے پر تیار نہ ہو جائیں۔ صفیہ نے بہت تامل کے ساتھ نرجس اور گیتا کو جانے کی اجازت دیدی، مگر تین سے چھ تک کے شو میں۔ خود اپنے سر کے درد کا عذر کر دیا۔

یہ انگریزی فلم "دی رومن ہولی ڈے" بہت دلچسپ اور بے حد رومانی تھا۔ نرجس پورے وقت محو رہی مگر گیتا کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ پچھلے ہفتہ بھر سے وہ بہت سنجیدگی سے اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہی تھی کہ کیا وہ واقعی ندیم سے محبت

کرنے لگی ہے۔ وہ ندیم کو پسند کرتی ہے، اس کی دلچسپ صحبت، دل پسند گفتگو اور پرکشش شخصیت سے وہ متاثر ہے۔ ہاں اسے ندیم سے محبت بھی ہے۔ مگر کیا یہ محبت اتنی گہری ہے کہ وہ سارے سماجی اور مذہبی بندھنوں کو توڑ کر اسے جیون ساتھی بنائے؟ کیا خود ندیم کو بھی اس سے ایسا ہی اتھاہ پریم ہے یا محض ہم خیالی نے دوستی اور انس پیدا کر دیا ہے؟

نرجس اور ندیم نے کئی بار ٹوکا اور بات کرنے کی کوشش کی، مگر انھوں نے دیکھا کہ گیتا کی توجہ نہ ان کی طرف ہے نہ فلم کی۔ نرجس نے جھنجلا کر کہا۔ "تم ہو کہاں گیتا؟" تو گیتا نے مسکرا کر بات ٹال دی۔ ندیم نرجس کی وجہ سے الجھ رہا تھا۔ نرجس انٹرول میں چائے پینے باہر گئی تو ندیم کو بات کرنے کا ذرا سا موقع ملا۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کسی طرح اس کا موقع دو کہ تنہائی میں تم سے بات کر سکوں اور کوئی دشمن دن، تمھارے ساتھ نہ لگی ہو۔"

گیتا گھبرا گئی۔ آخر کیا باتیں کرنی ہیں؟ "مشکل ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں۔ کل شام ہم دونوں ٹہلنے باہر چلیں گے۔ تم کیا کوئی ننھی بچی ہو کہ تنہا نہیں جا سکتیں۔"

"سوچوں گی۔" گیتا نے گھبرائے لہجے میں کہا۔ ندیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ندیم کے ہاتھ میں رہا اور پھر گھبرا کر جلدی سے گیتا نے کھینچ لیا۔ سامنے سے نرجس آ رہی تھی۔ مگر اس کے جسم کا سارا خون جیسے چہرے پر آ کر جمع ہو گیا تھا اور رگوں میں گرم گرم لاوا گردش کر رہا تھا۔ نرجس سے اس نے کہا۔ "بھئی۔ تم ادھر میری کرسی پر آ جاؤ۔ یہاں ان سردار جی کی پگڑی مجھے کچھ دیکھنے نہیں دیتی۔" اور نرجس

فلم میں اتنی محو تھی کہ یہ بھی نہ کہا کہ وہ اس سے انگل بھر ہی تو لمبی ہے۔ اور سردار جی کی پگڑی کم سے کم آدھے فٹ بلند۔ وہ گیتا کی کرسی پر آ گئی اور گردن دوسری طرف ٹیڑھی کر کے دیکھنے لگی۔ ندیم نے منہ منہ میں کہا "کل شام۔"

رات بھر گیتا بے چین رہی۔ پریشان خواب اسے چونکاتے رہے، اور کہیں صبح ہوتے وہ میٹھی گہری نیند سو سکی۔

وہ روز بہت سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ مگر آج جب کسی نے پکارا۔ "گیتا تم اب تک نہیں اٹھیں؟ لو یہ چائے پی لو۔ میں بھی یہیں پیتی ہوں۔" تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ صفیہ بیگم دو پیالیاں ہاتھ میں لئے کھڑی تھیں اور کھڑکی سے آتی سورج کی کرنیں ان کے دلکش چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ گیتا کی نظریں جھک گئیں۔ پہلے وہ روز صبح آپا کو "بیڈ ٹی" پلایا کرتی تھی اور اب دھیان ہی نہیں رہتا کسی بات کا۔ اس شرمندگی میں وہ ان کا شکریہ تک ادا نہ کر سکی۔ چپ چاپ چائے پینے لگی۔

صفیہ بیگم نے ایک نظر نرجس کے پلنگ پر ڈالی۔ وہ بے خبر جوانی کی نیند میں مدہوش، پڑی سو رہی تھی۔ "گیتا مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" انھوں نے گیتا کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی؟ مجھ سے!" گیتا نے گھبرا کر کہا۔ وہ الجھ رہی تھی کہ آج کل ہر کسی کو مجھ سے "ضروری باتیں" کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ وہ مجسم سوال بن کر صفیہ بیگم کو دیکھنے لگی۔

"دیکھو میں تمھاری ماں کی جگہ ہوں بٹیا۔ تم اور نرجس میرے لئے ایک سی ہو۔ جب ضرورت پڑے گی تو نرجس سے بھی میں خود ہی بات کروں گی۔ تم

بُرا نہ ماننا کہ آپا اتنی بڑھی ہو کر مجھ سے سہیلیوں کی طرح باتیں کرتی ہیں۔"

"آپا میری تو ماں، بہن، سہیلی، مشیر سبھی کچھ آپ ہی ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے گیتا کا گلا رُندھ گیا۔ صفیہ نے اپنا بایاں بازو اس کے گرد حمائل کر کے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"وعدہ کرو کہ بلا کسی جھجک یا تکلف کے صاف صاف بات کرو گی۔"

"میں تو آپا ہمیشہ ہی آپ سے صاف بات کرتی ہوں۔" مگر گیتا کا دل زور زور سے دھڑک کر اسے آگاہ کر رہا تھا کہ آج نہ کر سکو گی۔

"کل تمہارے منگیتر کا خط آیا ہے۔" صفیہ بیگم سوچ رہی تھیں کہ بات کہاں سے شروع کریں۔

"میرے منگیتر کا خط؟" حیرت سے گیتا کے منہ سے نکلا۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ اس جملے پر اسے شرمانا چاہیئے۔

"تمھیں وہ یاد تو ہے نا؟"

"نہیں تو آپا۔"

"کیا تم نے اسے کبھی دیکھا تھا؟"

"شاید دیکھا ہو گا۔ مگر اتنے برسوں پہلے کی بات ہے کہ میرے دل پر اس یاد کا کوئی نقش باقی نہیں۔"

"گیتا ـــ تمھیں شاید معلوم ہو گا کہ تین سال پہلے میں ایک بار مالتی کے پاس گئی تھی۔ تمھاری شادی کے سلسلے میں تو اس نے ....."

گیتا نے بات کاٹی۔ "میری شادی کے سلسلے میں آپ ان کے پاس گئی تھیں؟" آج وہ سب حالات معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں ـــ مگر اس نے مجھے ٹال دیا ـــ لڑکا اس وقت ولایت تھا

اس لئے وہ — کہہ بھی کیا سکتی تھی ؟"

انھوں نے بات بنانا چاہی ۔ مگر اب گیتا آسانی سے دھوکا نہ کھا سکتی تھی ۔
"نہیں آپا، آپ چھپا رہی ہیں ۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ انھوں نے مجھے غریب، یتیم اور دوسروں کی دست نگر سمجھ کر ٹھکرا دیا —" تلخی سے گیتا نے کہا ۔

"نہیں یہ بات نہیں بی بی ۔ اور پھر اس زمانے میں ماں باپ کی بات کہاں چلتی ہے ۔ اصل چیز تو خود لڑکا اور لڑکی کی مرضی ہے ۔"

"لڑکی کا نام کیوں لیتی ہیں آپا — وہ تو اب بھی گائے ہے ۔ جس کے ہاتھ جی چاہے اس کا سودا کیا جا سکتا ہے ۔ اس کی رائے اس کی پسند اس کی خوشی سے کسے مطلب ہے ؟ ماں باپ جب چاہیں، جس سے چاہیں منگنی بیاہ کر دیں ۔ سسرال والے جب چاہیں ٹھکرا دیں، لڑکا جب چاہے اس بندھن کو توڑ ڈالے — لڑکی کی بھی بھلا کوئی حیثیت، کوئی پوزیشن، کوئی عزت ہوتی ہے — وہ تو پتھر ہے نہ اس کے احساسات ہیں نہ جذبات، نہ دل نہ دماغ —" گیتا کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا جا رہا تھا ۔ صفیہ بیگم اس کے اس انداز سے گھبرا گئیں ۔ وہ تو آئی تھیں اسے سمجھانے اور وہ الٹی ان ہی سے جرح کرنے لگی ۔ وہ چند لمحے کسی سوچ میں کھوئی رہیں ۔

"یہ تم سچ کہتی ہو گیتا ۔ اب تک ہمارے دیس میں یہی ریت چلی آ رہی تھی ۔ مگر اب شکر ہے یہ چیزیں ختم ہوتی جا رہی ہیں — ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمھارے منگیتر کا خط آیا ہے — وہ ولایت سے واپس آ گیا اور بمبئی میں نوکر بھی ہو گیا ہے — ماشاء اللہ آٹھ سو تنخواہ پا رہا ہے اور .....؟"

"اور اس آٹھ سو کی دھونس دے کر وہ لونڈی خریدنا چاہتا ہے ؟"
صفیہ کو حیرت تھی گیتا کی زبان میں یہ کاٹ یہ طنز کہاں سے پیدا ہو گیا ۔

"نہیں — لونڈی نہیں شریک حیات چاہتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے اصرار پر بھی اپنے کو دولت و ثروت کے بدلے فروخت کرنے پر تیار نہیں۔ ہاں آزاد خیال، تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔ اپنی ہونے والی بیوی سے ملنا اور تبادلہ خیالات کرنا ضروری سمجھتا ہے۔"

"اور پسند یا ناپسند کرنے کا حق تو ظاہر ہے صرف اسی کو ہوگا۔ جی چاہے قبول کرے جی چاہے ٹھکرا دے! لڑکی کو بھی اس کا ادھیکار ہے یہ بات وہ ولایت پلٹ، آزاد خیال مرد بھلا کیوں مانتا ہوگا؟" گیتا کے لہجے میں پچھلے ہوئے غرور اور مجروح خودداری کی جھنجھ پنہاں تھی۔

"یہ سب میں نہیں جانتی۔ اس نے جو لکھا ہے وہ میں نے تمھیں بتا دیا۔ میرے خیال میں اس کا یہ مطالبہ کہ جیون بھر کا ساتھی چننے سے پہلے ایک دوسرے سے ملنا ضروری ہے، کوئی غلط بات نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر گیتا میرے معیار پر پوری اُتری تو میں سارے خاندان کی مخالفت کے باوجود اسے اپناؤں گا۔" صفیہ کے لہجے میں بھی تیزی پیدا ہونے لگی تھی۔

"اور اگر پوری نہ اُتری تو ٹھکرا دوں گا۔ اس سے یہ بھی تو پوچھیے کہ اگر وہ گیتا کے معیار پر پورا نہ اُترا تو؟"

"تو گیتا کو پورا حق ہے کہ وہ انکار کر دے۔" صفیہ نے مشتعل گیتا کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے ماتھے کے بل اور آنکھوں کی سرخی جوں کی توں تھی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں بیٹی کہ تیرے پندار کو ان لوگوں کے طرزِ عمل سے ٹھیس لگی ہے۔ ہر خوددار لڑکی کو لگتی۔ مگر یہ تو سوچو کہ اس میں لڑکے کا تو کوئی قصور نہیں۔ وہ تو مجھے بڑا معقول لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اگر تم سے

ملنا چاہتا ہے تو یہ کوئی ناواجب بات تو نہیں ۔ تم خود بھی تو یہ پسند نہیں کروگی کہ بے دیکھے بھالے، بے جانے بوجھے کسی کو جیون ساتھی بنالو۔"

"میری پسند یا ناپسند کی دنیا میں کسے پرواہ ہے؟"

"گیتا تمھیں یہ کیا ہوتا جارہا ہے؟ اتنی تشکی، اتنی تنک مزاج، اتنی بدگمان تم پہلے تو نہ تھیں؟ اور تو اور اب اپنی آپا کی محبت پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں تمھیں رواج کی بھینٹ چڑھادوں گی؟ نہیں میری بچی — مجھے تو تیری خوشی سب سے زیادہ پیاری ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ تو جلد بازی یا انتقام کے جوش میں کوئی غلط فیصلہ نہ کر ڈالے۔ یہ نسبت تیرے بابا اور ماں کی نے بڑے چاؤ سے کی تھی۔ اتنے برسوں سے وہ قائم بھی ہے۔ اس کا توڑنا اتنا آسان نہیں جتنا تو سمجھتی ہے۔ اگر ملنے کے بعد، لڑکے کو ناپسند کر کے انکار کر دیا تو بات دوسری ہوگی۔" صفیہ محبت کے جوش میں گیتا کو ہمیشہ "تو" سے مخاطب کیا کرتی تھیں۔

"پھر ذرا یہ بھی تو سوچ کہ اس معاملے میں میری پوزیشن کتنی نازک ہے۔ میں انکار کر دوں تو کیا کیا جھگڑے بکھیڑے اٹھ کھڑے ہوں گے . . ."

انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

گیتا سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ واقعی یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اس کی وجہ سے بچاری آپا اور میاں کے لئے کیا کیا الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے صفیہ نے کہا۔ "ایک بات پوچھوں گیتا — سچ بتاؤ گی؟"

"جی — ہاں — کیوں — نہیں —" گیتا کی زبان لڑکھڑائی۔

"کیا تم ندیم سے؟ کیا ندیم تم سے؟ میرا مطلب ہے کیا ندیم نے

تمھیں شادی کا پیام دیا ہے؟" وہ جو کہنا چاہتی تھیں وہ نہ کہہ سکیں۔ آج کل کی کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیا اب بھی ان میں موجود تھی۔

"جی ۔۔ ی ۔۔ ی ۔۔ نہیں تو ۔" گیتا نے شکر کیا کہ سوال کی ایسی صورت بن گئی کہ وہ نفی میں جواب دے سکی۔

"مگر شاید عنقریب وہ تم سے درخواست کرے گا ۔ کیوں؟" انھوں نے گہری نظر سے گیتا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر گیتا نے کچھ جواب نہ دیا ۔ خالی پیالی میں چمچہ ہلاتی رہی۔

"سچ بتاؤ ۔ کیا ندیم تم سے محبت کرتا ہے؟" اب ان کو براہ راست سوال کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

"میں کیا جانوں؟" گیتا کا سر کچھ اور جھک گیا۔

"اپنے دل کا حال تو جانتی ہو یا نہیں؟ کیا تمھیں اس سے محبت ہو گئی ہے؟"

گیتا کا منھ لال ہو گیا۔ اس نے تیوری چڑھا کر آنکھیں ملانا چاہیں مگر وہ اور جھک گئیں۔ جواب دینا چاہا مگر زبان نے جواب دے دیا۔

"محبت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے بی بی ۔۔ خاص کر اس عمر میں جو تمھاری ہے ۔۔ مگر شاید تم مجھے یہ منصب نہیں دیتیں کہ میں اس معاملے میں دخل دوں؟" گیتا کی خاموشی سے عاجز آ کر صفیہ نے کہا۔

"نہیں نہیں آپا ۔۔ آپ کے سوا اور کس کو یہ منصب مل سکتا ہے؟" گھبرا کر گیتا نے کہا۔

"تم نوجوان لڑکیاں شاید یہ سوچتی ہو کہ جو خود عشق و محبت کے جال میں نہیں پھنسی وہ کیا جانے محبت کیا بلا ہے ۔ کیوں ہے نا یہ بات؟" اور

گیتا حیران رہ گئی۔ کیسے وہ دل کا حال پڑھ لیتی ہیں۔

"ہاں تم لوگ ایسا سوچو تو حیرت کی بات نہیں۔ اس لئے کہ نہ ہمارے ادب اور شاعری میں اس اتھاہ پریم کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے، جو بیوی اپنے محبوب شوہر سے کرتی ہے اور نہ نوجوان ...."

"نہیں آپا نہیں — ہندی شاعری تو ساری اس سے بھری پڑی ہے۔ ہندی شاعری میں تو عورت کا محبوب اس کا پتی ہی ہوتا ہے اور وہ اسے مخاطب کر کے جو پریم رس میں ڈوبی کویتا لاپتی ہے اس کا جواب کسی زبان کی شاعری میں بھی نہیں۔" گیتا خوش ہوئی کہ موضوع بدل گیا۔

"ہاں پرانی ہندی شاعری میں یہ خصوصیت تھی مگر اب اس کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ اور ہمارے نوجوان تو سرے سے اس کو محبت مانتے ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں دو آدمی کیا، جانور بھی برسوں ساتھ رہیں تو ان میں اُنس ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کی محبت ایسا ہی اُنس ہے یا عادت۔ ورنہ کہیں عشق و پریم شادی کے بعد ہو سکتا ہے بھلا! کیوں ٹھیک کہتی ہوں نا؟" صفیہ بیگم کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"جی — کہہ نہیں سکتی ...." گیتا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ خیال تو اس کا بھی یہی تھا نا۔

"تم نوجوانوں کا اس میں قصور بھی کیا ہے؟ قصے کہانیوں میں، ناولوں میں، غزلوں اور گیتوں میں ہر جگہ یہی پڑھتے اور سنتے ہیں کہ عشق وہ ہے جس میں آنکھیں چار ہوتے ہی محبت کا تیر دو دلوں کے پار ہو جاتا ہے — اور محبت بڑھتی اور پروان چڑھتی ہے بندشوں میں، رکاوٹوں میں۔ جب جان پر کھیل کر، بدنامی اٹھا کر، بغاوت کر کے محبوب

کا قرب حاصل کیا جائے۔ جہاں ممنوع شئے کو اپنانے کی سعی ہو۔ جہاں ہجر کی راتیں ہوں، فراق کی گھڑیاں ہوں — وصال کی تمنائیں ہوں ..... ہے نا یہی بات ؟"

"مگر آپا یہ ایک حقیقت ہے، اس سے آپ کیسے انکار کر سکتی ہیں ؟" گیتا کہاں تک چپ رہتی۔

"ہاں اب آئی سچی بات زبان پہ — یہ حقیقت تو تم لوگ پہچان لیتے ہوں مگر یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ گہری محبت میاں بیوی میں بھی ہو سکتی ہے اور۔"

"محبت تو ہو سکتی ہے آپا مگر....."

"مگر" مسکرا کر صفیہ نے اس کی بات کاٹ کر جملہ پورا کیا۔ "مگر عشق نہیں ہو سکتا ؟ کیوں ؟"

"ہاں آپا — میرا تو یہی خیال ہے" جھجکتے ہوئے گیتا نے کہہ ہی ڈالا۔

"عشق نہیں ہو سکتا !" استہزا کے انداز میں صفیہ بیگم نے جملہ دہرایا — "عشق کے اصلی معنوں پر کبھی غور بھی کیا ہے ؟ تم لوگ وصال و فراق کا فلسفہ جانتے بھی ہو ؟ تم لوگ۔ اس محبت کو کیا سمجھ گے جو کسی کو اپنا بنا کر، اس میں اپنے کو کھو دینے کے بعد جنم لیتی ہے۔ جو قربانیوں، سیوا اور کٹھنائیوں میں پروان چڑھتی اور جلا پاتی ہے۔ جو ایک دوسرے کیلئے دکھ سہہ کر نکھرتی ہے۔ یہ عشق زندہ کا مردے کے ساتھ جل مرنے کا آرٹ ہے۔ یہ محبت مردہ محبوب کے فراق میں شمع کی طرح گھل گھل کر جان دینے کا فن ہے۔ یہ پریم کی وہ آگ ہے جو اندر ہی اندر جلا کر دل کو کندن کی طرح تپاتا اور محبوب کے لئے فنا ہو جانے کی لذت سے آشنا کرتا ہے — یہ ستی ہونے کا وہ فن ہے جس میں محبوب کیلئے مرنا اور جینا دونوں ہی زندگی کی سب سے

بڑی مسرتیں بخشتا ہے ۔۔۔۔"

"مگر آپا یہ سب بھی تو کہانیاں ہیں۔ ایسی محبت میاں بیوی میں ہوتی کہاں ہے؟" گیتا نے اعتراض کیا۔

"ہوتی ہے میری بچی ہوتی ہے۔ مگر اس کو سمجھنا ہر کسی کا کام نہیں۔ اس لئے کہ اس محبت کو اپنا رکھ رکھاؤ، اپنا وقار، اپنی عزت زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر عشق کا اعلان نہیں کرتی۔ وہ ہجر و فراق کے نالوں سے آسمان کو سر پر اٹھا کر اپنے کو ارزاں نہیں کرتی۔ ہاں صرف اہل دل اس عشق کی گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں۔ مانتی ہوں کہ ایسی محبت بہت کم ہوتی ہے مگر جن کو یہ انمول گوہر مراد مل جاتا ہے ان کی محبت اتنی اتھاہ، بے پایاں، بیکراں ہوتی ہے جس کو ناپنے کا کوئی آلہ آج تک ایجاد نہیں ہوا ۔۔"

گیتا پر کچھ ایسی محویت طاری تھی جیسے کوئی الہامی کلام سن رہی ہو ۔۔ صفیہ بیگم کے چہرے پر اسے جذب واثر، کیف و سرور کا وہ عالم نظر آرہا تھا جو اس سے پہلے کبھی اس نے نہ دیکھا تھا۔ چہرہ کسی اندرونی روشنی سے دمک اٹھا تھا اور ان کی سیاہ آنکھیں دو گہری جھیلیں تھیں جن میں عشق کا اتھاہ جذبہ لہریں مارتا محسوس ہو رہا تھا۔ ذرا دیر کے لئے گیتا سب کچھ بھول کر ان آنکھوں کے سحر میں کھو گئی۔

اور پھر جیسے دونوں کو ہوش آگیا۔ صفیہ کچھ جھینپ سی گئیں جیسے کسی نے دل کی چوری پکڑ لی ہو۔

"اے توبہ۔ کتنی باتونی ہوتی جا رہی ہوں میں۔ کہاں کی بات کہاں لے آئی۔" صفیہ بیگم بولیں۔

"کتنی پیاری باتیں کرتی ہیں آپ آپا۔" بس گیتا اتنا ہی کہہ پائی۔

کہنا تو بہت چاہتی تھی مگر بعض وقت جذبات کا اظہار کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"ہاں تو — وہ میں — کیا کہہ رہی تھی — تو یہ — یہ کہ ہم بعض وقت دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہ کہہ نہیں سکتے کہ یہ محبت ہے یا محض کشش۔ پریم ہے یا جنسی کشش؟ عشق ہے یا کوئی وقتی جذبہ؟ اسی لیے اس معاملے میں بہت سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیئے۔ اگر محبت، پریم یا عشق، جو چاہے کہہ لو — ہمیں کسی ایسی ذات سے ہو جس کو بس دور سے دیکھتے اور اس کی پرستش کرتے رہیں تو خیر پھر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مگر افسوس کہ یہ بے غرض، بے لاگ محبت انسانوں، کم سے کم نوجوانوں میں نہیں ہوتی — ہو نہیں سکتی۔ اگر صرف ایسا ہو تو وقت خود ہی بتا دیتا ہے کہ یہ جذبہ کتنا پائدار کتنا گہرا تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ محبت کی اگلی منزل دو دلوں ہی کا نہیں دو زندگیوں کا سمبندھ ہے۔ اب اگر مذہب، قانون اور سماجی بندھنوں کے اندر یہ ملاپ ہوتا ہے تو دنیا زیادہ معترض نہیں ہوتی۔ تھوڑی بہت تو ضرور ہوتی ہے۔ دراصل لوگوں کو دو آدمیوں کا ایک دوسرے کو چاہنا اچھا نہیں لگتا۔ جھگڑا زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

صفیہ بیگم کچھ سوچنے لگیں۔

گیتا حیران تھی کہ آپا کی نظر بھی کہاں کہاں پہنچی ہے۔

"لیکن اگر یہ ملاپ سماجی، قانونی اور اخلاقی بندھنوں کو توڑ کر کیا جائے تو پھر دوسرے ہی نہیں اکثر اوقات آدمی خود بھی غیر مطمئن رہتا ہے۔ اس کو سکون نہیں ملتا۔ ضمیر میں ایک خلش رہتی ہے — ان کا ذکر نہیں کر رہی جن کے ضمیر مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔" صفیہ نے گیتا کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نظر آئے۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ نوجوانوں کو یہ پرکھنا چاہیئے کہ ان کی محبت سچی اور گہری محبت ہے یا وقتی لگاؤ۔ تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ اس لئے کہ اکثر ہم وقتی جذبے کو عشق سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اور اس ہستی میں جس سے ہمیں لگاؤ ہے بہت سی فرضی صفات پیدا کر لیتے ہیں اور اس کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر ڈالتے ہیں۔ اگر قسمت سیدھی ہے اور وہ ہمارا شریکِ حیات بن گیا تو اسے معراجِ محبت سمجھ لیتے ہیں۔ یہی ہے نا عاشق و معشوق کی تمناؤں کی معراج؟" صفیہ کو بار بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ بولتی چلی جا رہی ہیں، اور گیتا اس میں کوئی حصہ نہیں لے رہی۔ مگر گیتا ہوں ہاں سے آگے نہ بڑھی۔

"پھر کیا بات ہے کہ اکثر عشق و محبت کی یہ شادیاں ناکام ثابت ہوتی ہیں، کبھی اس پر غور کیا تم نے؟"

"ہاں ہوتی تو ہیں —— مگر کیوں؟" گیتا کو اب اس گفتگو میں ذرا دلچسپی پیدا ہوئی۔

"میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ محب اور محبوب عارضی کشش کو عشق سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس اندھا دھند جوش میں بہت سی خوبیاں ایک دوسرے میں فرض کر لیتے ہیں —— مگر جب —— جب —— جبلی جذبہ —— کو تسکین ہو جاتی ہے اور ایک کو دوسرے کا اصلی روپ نظر آنے لگتا تو خوبیاں پس پشت پڑ جاتی ہیں اور کمزوریوں پر دھیان زیادہ جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے نے مجھے دھوکا دیا۔ بیوی کا مثالی محبوب غائب ہو جاتا ہے اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والا، سخت گیر، سخت مزاج، خود غرض مرد باقی رہ جاتا ہے۔ شوہر محسوس کرتا ہے کہ حسین و دلربا مجسمہ ہوا میں تحلیل ہو گئی اور ایک

ضدی، خود پسند عورت باقی رہ گئی ہے جو نازبرداری اور چونچلوں کی خواہشمند ہے ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ایسے ہوتے بھی ہیں مگر ایک دوسرے کو کچھ ایسی ہی صورتوں میں نظر آنے لگتے ہیں ۔"

" آیا کیا محبت کی ہر شادی ایسی ہی مایوس کن ہوتی ہے ۔" پریشانی کے انداز میں گیتا نے پوچھا ۔

" نہیں ۔ سچی محبت کبھی انسان کو مایوس نہیں کرتی ۔ یہ بھی ہوتا ہے جہاں لگاؤ اور کشش کو محبت سمجھ لیا جاتا ہے ۔ پھر اس میں بھی کبھی کبھی آہستہ آہستہ پائیدار محبت پروان چڑھنے لگتی ہے ۔ لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا ۔"

" پھر آخر سچی محبت کی پرکھ کیا ہے ؟"

" بڑا ٹیڑھا سوال کر دیا تم نے گیتا ۔ بڑی مشکل ہے اس کی پرکھ ۔ مگر ناممکن نہیں ۔ اس کا کوئی بندھا ٹکا اصول تو ہے نہیں کہ سونے کی طرح کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا جائے ۔ یہ تو اپنے دل کو ٹٹول کر خود ہی آدمی اپنی محبت کو پرکھ سکتا ہے ۔ مگر اس کے لئے صبر کی ضرورت ہے ۔ نظر کی ضرورت ہے ۔ اگر محبوب کی خامیوں اور کمزوریوں کو جاننے کے بعد بھی، اس کی برائیوں کو سمجھنے پر بھی محبت باقی رہے اس کی محرومیوں کے باوجود اس سے پیار باقی رہے ، اگر زمان و مکان کی دوری بھی اس محبت کی شدت میں کمی نہ کر سکے .... تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ محبت سچی اور پائیدار ہے ۔ تب ہم اگر ایک دوسرے کو اپنائیں گے تو ہرگز اپنے فیصلے پر نہیں پچھتائیں گے ۔ ہمیں اس کے ساتھ کوئی دکھ دکھ نہ محسوس ہوگا ۔ اس کے لئے اپنا سب کچھ گنوا کر بھی ہم اپنے کو فائدے میں سمجھیں گے ۔ محبت کی سب سے بڑی پرکھ یہ ہے گیتا کہ انسان اس پر کبھی پچھتاتا نہیں ۔ کبھی اس کے ضمیر یا دل میں کھٹک نہیں ہوتی ۔ ساری دنیا کی مخالفت اور ملامت پر بھی وہ پشیمان

نہیں ہوتا۔ دکھ اور کٹھنائیاں اسے مغلوب نہیں کر پاتیں۔ اسے اپنے پر بھروسہ، محبوب سے پریم، زندگی سے پیار ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ یہ ملاپ صرف جسموں کا نہیں، صرف دلوں ہی کا نہیں دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے......

"اور اسی لئے میں کہتی ہوں کہ اس راہ میں قدم اُٹھانے سے پہلے اپنے دل کو خوب ٹٹول لو کہ آیا تمھاری محبت اس اونچے درجے کی ہے یا نہیں؟"

گیتا کے چہرے کا رنگ پل پل میں بدل رہا تھا۔ کبھی زرد پڑ جاتی کبھی سفید، کبھی سرخ ہو جاتی۔ نرجس جاگ پڑی تھی اور رضائی اوڑھے منھ کھولے حیرت سے اپنی ماں کی باتیں سُن رہی تھی "ہائے میرے اللہ، امی اتنی اچھی تقریر کر لیتی ہیں؟ مگر یہ بچاری گیتا کو کیوں آج وعظ پلایا جا رہا ہے؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

انا بُوا کئی منٹ سے دروازے پر کھڑی تھیں اور منھ میں دبے پان کو زور زور سے پوپلے مُنھ کے اندر چلا رہی تھیں۔ یہ پورب کی رہنے والی تھیں۔ صفیہ بیگم کو دودھ بھی پلایا تھا اور پالا پوسا بھی تھا اور اب ان کے بچوں کو پال رہی تھیں۔ ان پر جان دینے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں، اور اس سے بھی زیادہ ڈانٹ ڈپٹ پر آمادہ۔ گھر میں ان کی حیثیت کسی بزرگ خاندان سے کم نہ تھی۔ حبیب میاں تک کو وہ جب چاہتیں ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔

"بس بِٹیا تمری ان ہی باتن سے جی جلت ہے۔ نہ وقت دکھیں نہ موقع بکتی چلی جاتی ہیں۔ ہواں بھیا راہ تکت تکت حیران ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہوئے کر مٹی ہوئے گئی۔ اِن بٹیا کا پتہ ہی نہیں۔ ان کو گیتیں مارنے سے چھٹی ناہیں۔" انا بُوا ایک بار بولنا شروع کر دیں تو پھر ان کا چپ ہونا

خشک تھا۔ صفیہ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔

"اچھا بوا اچھا خفا نہ ہو، میں آ رہی ہوں — گیتا اب تم اور نرجس بھی جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ نہیں تو میاں خفا ہوں گے — اور انا بوا تو خیر زندہ ہی نہ چھوڑیں گی کسی کو؟"

"اللہ نہ کرے — ایسا نہ کہو بیٹا — ہم بھلا کا کہت — تمری باتیں ایسی ہوت ہیں کی کہ بس۔ جی جلت ہے —"

۲۱

صفیہ بیگم کی باتوں نے گیتا کو اور الجھن میں ڈال دیا۔ "آج تک تو محبت ناپنے کا آلہ ایجاد ہوا نہیں۔ بھلا کیسے کوئی یہ پہچان سکتا ہے کہ اسے محبت ہے یا لگاؤ؟ محض جنسی کشش ہے یا سچا پریم۔ یوں اگر سوچ سمجھ اور پرکھ پرکھ کر محبت کی جانے لگی تو محبت اور سودے بازی میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ یہ ہزاروں شاعر اور افسانہ نگار، ہر ملک اور ہر زبان کے کیا خواہ مخواہ کی باتیں کرتے ہیں؟ لیلےٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سب فرضی کہانیاں تو نہیں ہیں۔ محبت میں انسان کیا نہیں کرتا — اور کیا نہیں کر سکتا؟"

مگر پھر خود اس کے دل ہی نے تاویل کرنی شروع کر دی۔ "مگر آپا بھی تو یہی کہتی تھیں۔ ہاں ان کا یہ خیال ہے کہ نوجوانی کے جوش میں محبت کا پہچاننا دشوار ہے۔ بات تو ٹھیک ہی ہے — مگر — تو آخر میں کیا کروں۔ ندیم کا کیا ذکر — ابھی تو خود اپنے دل کو پوری طرح پہچان نہ سکی — پھر

دوسرے کو کیا پرکھوں گی؟"
مسئلے نے اور بھی زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔
حبیب میاں کے مشورے سے گیتا نے مزید تعلیم کے لئے وظیفے کی درخواست دے رکھی تھی، اور ندیم بھی اس کوشش میں تھا کہ اسے یورپ جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لئے کہیں سے کوئی اسکالرشپ مل جائے۔ آج جب گیتا حبیب میاں کا خط لے کر محکمۂ تعلیم کے ایک افسر سے ملنے کیلئے جانے لگی تو دروازے پر ہی اسے ندیم مل گیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"
"چلیے" گیتا نے آہستہ سے کہا۔ ندیم کو بھی اسی دفتر میں کام تھا۔ واپسی پر ندیم نے تانگہ بجائے گھر کے پارک کی طرف مڑوالیا۔
دوپہر کا وقت تھا۔ دن میں اب خاصی گرمی ہونے لگی تھی۔ سیر کا وقت نہ تھا اور پارک میں صرف اکا دکا کوئی آدمی نظر آرہا تھا۔ پہلے تو گیتا نے چاہا کہ ندیم کو منع کرے مگر پھر سوچا کہ اچھا ہے ایک بار دونوں میں کھل کر بات ہو جائے۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک لکڑی کی بنچ پڑی تھی۔ دونوں جا کر اس پر بیٹھ گئے۔
گیتا کی نگاہیں نیلے آکاش میں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں اور ندیم گیتا کے کتابی چہرے کے اتار چڑھاؤ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کبھی نظریں بھٹک کر اس کے متناسب جسم کے پیچ و خم میں الجھ جاتیں اور کبھی اس کے پتلے لمبے آرٹسٹک ہاتھوں اور مخروطی انگلیوں پر جم جاتیں۔ گیتا کی صندلی گردن کا خم اور تیز چلتے سانس کا اتار چڑھاؤ خود اس کے دل کی دھڑکن کو اور تیز کر رہا تھا۔ اور گیتا بے دیکھے بھی اس کی نظروں کی گرمی محسوس کر رہی تھی۔

کئی منٹ یونہی گزر گئے۔

"تم جانتی تو ہو گیتا کہ مجھے تم سے کیا کہنا ہے۔" کچھ جھنجلا کر ندیم نے بات شروع کی۔ "پھر یہ بے نیازی کب تک؟" اسے اپنے بارے میں اتنا حسنِ ظن اور گیتا کی محبت کا اتنا یقین تھا کہ جیسے سارے معاملات پہلے ہی سے طے ہو چکے ہوں۔

"میں کیا جانوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" گیتا نے تجاہل کا سہارا لیا۔

ندیم کا سانس اور تیز چلنے لگا۔ "گیتا۔ کیا تم — تم یہ نہیں جانتیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟ نہیں جانتیں کہ سال بھر پہلے کملا نگر میں ایک ساحرہ کو شعر و موسیقی کی دیوی کے روپ میں دیکھ کر میرے دل پہ کیا گزری تھی؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ اس کے بغیر میں ایک جسدِ بے جان، ایک ہستی بے روح ہوں —" جذبات کی شدت میں اس کی آواز بھرا گئی۔

ایک لمحے کے لئے گیتا کی نظریں ندیم کی نظروں سے ٹکرائیں اور پھر فوراً ہی سامنے کے درخت کے سرسبز پتوں پر جم گئیں۔

"گیتا۔ گیتا بولو — کیا تم میری محبت کو قبول کرتی ہو؟ کیا تمھیں مجھ سے محبت ہے؟" وہ اب گیتا کے سامنے آ کھڑا ہوا اور امید ہی نہیں یقین کے ساتھ گیتا کو دیکھ رہا تھا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ گیتا کا جواب سوائے ہاں کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

"میں — مجھے — میرا — میرے دل ..... گیتا ہکلا کر بس اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ ندیم نے سہارا دیا۔ "ہاں ہاں تمھارے دل میں ....؟"

"میرے دل میں آپ کی جگہ ہے۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں — پسند کرتی ہوں اور شاید — شاید محبت

بھی ہو مگر ابھی تک میں نے ۔ میں نے ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن یہ آخری جملہ ندیم نے سُنا ہی نہیں ۔ بے اختیار ہو کر اس نے گیتا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ۔ گیتا کا مزاج دیکھتے ہوئے خود اسے بازوؤں میں لینے سے بمشکل اپنے کو روکا ۔

"آہ گیتا — میری گیتا — میری جان — میری روح — میں جانتا تھا ۔ پہلے سے جانتا تھا کہ تم یہی کہو گی — ہاں ہاں شاعر نے سچ کہا ہے ۔ ع

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

میں کتنا خوش نصیب ہوں — آج دنیا میں کون مجھ سے بڑھ کر خوش قسمت ہوگا — تم میری بنو گی — میری گیتا — اپنی گیتا —" وہ بے قابو ہوا جا رہا تھا ۔ گیتا نے زبردستی اپنا ہاتھ اس کی مضبوط گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا ۔" سنبھلئے ندیم صاحب — سنبھلئے — اتنا آپے سے باہر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کوئی وجہ نہیں ؟ جس کو دونوں جہان کی نعمتیں مل جائیں — جسے تم جیسی ہستی مل جائے وہ کیسے اپنے کو قابو میں رکھ سکتا ہے —" ندیم نے گیتا پر جھکتے ہوئے کہا ۔

"مگر آپ میری پوری بات تو سُنئے ۔" ذرا تیزی سے گیتا نے کہا اور جلدی سے دوسری طرف کھسک گئی ۔ "آپ تو وہ سننے سے پہلے ہی کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔" اور ندیم ایک دم آسمان سے زمین پر آ رہا ۔

"ندیم صاحب میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں — مجھے آپ سے اُنس بھی ہے ، لیکن یہ اُنس وہ ہے جسے شاعروں کی اصطلاح میں عشق اور سیدھی سادی زبان میں محبت کہا جاتا ہے یا نہیں

یہ میں ابھی تک سمجھ نہیں پائی ہوں۔"

"سمجھ جاؤ گی میری جان جلد سمجھ جاؤ گی۔ ابھی ناتجربہ کار ہونا۔" ندیم نے کچھ فلمی ہیروؤں کے انداز سے یہ جملہ کہا اور گیتا کی تیوری پر بل آتے دیکھ کر سہم گیا۔

"مگر ندیم ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ ابھی تو ہمیں خود اپنے دلوں کو ٹٹولنا ہے کہ آیا ہماری محبت پائدار اور گہری ہے یا وقتی لگاؤ ہے۔"

"مگر گیتا پیاری میں جانتا ہوں ——خوب جانتا ہوں کہ ہماری محبت سچی، گہری اور پائدار ہے۔ یہ لگاؤ نہیں پریم ہے، کشش نہیں ہے عشق ہے......"

"مگر مجھے ابھی اس کا یقین نہیں ندیم۔" حیص بیص کے لہجے میں گیتا نے کہا۔

"تمھیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟" شکایت بھرے لہجے میں ندیم نے پوچھا۔

"مجھے خود اپنے پر ابھی بھروسہ نہیں۔"

"تم شاید اس خیال سے گھبرا رہی ہوں ہم دونوں دو مختلف مذہبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر گیتا، محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پریم کا دھرم صرف ایک ہے۔ دو دلوں کا ملاپ۔"

ہاں مگر صرف دلوں کا ملاپ۔ اس ملاپ میں دھرم رکاوٹ نہیں ڈالتا —— مگر ——" گیتا جملہ پورا نہ کر سکی۔

"ہاں مگر دو پریمیوں کے جیون ساتھی بننے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ جانتا ہوں گیتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ محبت کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتی۔

نہیں مذہبی ہوں اور تم اتنی کٹر اور قدامت پرست ہو۔ اور اب تو قانون ہمارا ساتھ دیتا ہے۔۔ ہم بغیر کسی روک ٹوک کے سول میرج کر سکتے ہیں۔ ہم خود مختار ہیں، عاقل و بالغ ہیں۔ کسی کے پابند نہیں؛" جوش کے ساتھ ندیم نے کہا۔

گیتا نے بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کیا۔ "مگر میں خود مختار نہیں ہوں؛"

"کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا صفیہ بیگم یا تمہارے خاندان والے۔۔۔؟

"نہیں ندیم یہ بات نہیں۔۔۔ میں اصل میں بہت کم عمری میں کسی اور سے منسوب کر دی گئی تھی؛"

گیتا نے اتنے آہستہ سے یہ جملہ کہا کہ ندیم کو سننے کیلئے اور زیادہ اس کی طرف جھکنا پڑا۔ اور پھر اسے ایسا لگا جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ سگرٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

"یعنی۔۔ یعنی۔۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔ منگنی۔"

"اوہ شکر ہے خدا کا؛" بے اختیار ندیم کے منھ سے نکلا اور گیتا اس کش مکش کے عالم میں بھی یہ سوچ کر مسکرائے بنا نہ رہ سکی کہ ندیم اگرچہ نہ خدا کا قائل ہے اور نہ شکر ادا کرنے کا، پھر بھی اس کے دل کی آواز زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔

"اوہ۔۔ تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا؛" وہ پھر اطمینان سے گیتا کے برابر بیٹھ گیا۔ "یہ بچپن کی منگنی نہایت مہمل چیز ہوتی ہے۔ اسے بڑی آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔"

گیتا بیٹھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

"گیتا تمھیں جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ بس تمہارا کہنا کافی ہے،

منگنی خود ہی ختم ہو جائے گی۔ آہ اب میں سمجھا اسی لئے تم اپنی محبت کو چھپاتی تھیں۔ ہاں میں جانتا ہوں تم مجھے چاہتی ہو، مگر سماج سے خوفزدہ ہو۔ مگر یاد رکھو تم آزاد دیس کی آزاد اور خود مختار بہادر عورت ہو اور تمھیں اس کا ثبوت دینا پڑے گا . . . . "

ندیم عادت سے مجبور نہ چاہتے ہوئے بھی لکچر دینے لگتا تھا حالانکہ جانتا تھا کہ اس کی یہ بات گیتا کو بُری لگتی ہے۔

" ندیم آپ کچھ بھی نہ سمجھے۔ میں جیسی بھی ہوں مگر بزدل نہیں۔ نہ زبردستی کا یہ بندھن توڑنا میرے لئے ناممکن ہے ۔ مگر میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ مجھے ابھی خود اپنے پر وشواش نہیں ہے ۔۔ میں نہیں سمجھ پائی ہوں کہ مجھے آپ سے وہ اتھاہ، بے پایاں پریم ہے یا نہیں جس کی خاطر سب کچھ تج سکوں ۔۔ اور . . . . "

" مگر گیتا . . . . " ندیم نے کچھ کہنا چاہا مگر گیتا نے اسے ہاتھ سے روکتے ہوئے کہا۔ " اور اس سے بھی کم بھروسہ مجھے آپ پر ہے۔ اس لئے کہ آپ بے حد جذباتی اور ذرا جلد باز ہیں۔ جلدی ہی محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور اتنے ہی جلدی بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جب تک مجھے اس بات کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ ہم دونوں ایک امٹ پریم کے بندھن میں بندھ چکے ہیں ۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ "

" تو صاف صاف کہو نا کہ تمھیں مجھ سے محبت نہیں۔ " ندیم نے غم و غصے سے بل کھا کر کہا۔ کوئی لڑکی اس سے اس طرح کی باتیں کرے ؟ اس کے پندار کو اس سے سخت چوٹ لگی تھی۔

" میں تو صاف صاف ہی کہہ رہی ہوں۔ اور خود اپنی محبت کو پرکھنا

آپ کا کام ہے۔"

"میں خوب پرکھ چکا۔"

"نہیں پرکھا ـــ ویسے ہی کہہ رہے ہیں۔"

"خوب! تو اب تم مجھے جھوٹا بھی کہنے لگیں؟"

"واہ! میں نے کب جھوٹا کہا۔ آپ تو خواہ مخواہ بگڑ جاتے ہیں۔"

"نہیں نہیں گیتا ـــ بھلا تم سے خفا ہو سکتا ہوں؟" ندیم کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔ امید کی کرن جگمگا اُٹھی۔

"اچھا ایک بات سچ سچ بتائیے۔"

"ضرور۔"

"مگر بالکل ٹھیک بتانا ہو گا ـــ لاگ لپیٹ نہیں۔"

"بالکل ٹھیک بتاؤں گا۔ تمھاری قسم۔"

"پہلے بھی آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

"کسی سے محبت ہوئی ہے؟ نہیں نہیں۔ محبت تمھارے سوا کسی سے نہیں ہوئی۔ ہاں ذرا سا لگاؤ وقتی طور پر ہونا اور بات ہے۔" ندیم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"خوب سوچ کر جواب دیجئے۔ اس وقت آپ جسے وقتی لگاؤ کہہ رہے ہیں اس سمے کیا اسے محبت نہیں سمجھا تھا؟ دیکھئے آپ نے میری قسم کھا کر سچ بتانے کا وعدہ کیا ہے۔ کیا میں پہلی لڑکی ہوں جس کے لئے آپ کے دل میں اس قسم کا جذبہ ابھرا ہے یا....."

"ہاں گیتا۔ اتنی گہری، اتنی شدید محبت مجھے کبھی کسی اور سے نہیں ہوئی۔" اتنی پر زور دے کر ندیم نے کہا۔

"اور اس کو کیوں چھوڑ دیا جس سے بقول آپ کے وقتی اُنس ہوا تھا؟"
گیتا اب باقاعدہ جرح پر تل گئی تھی۔

"اُس کو؟ اُسے؟ میں — میں جب تعلیم ختم کر کے واپس آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس سے اتنی گہری محبت نہ تھی کہ اس سے شادی کروں۔ ایک وقتی کشش سمجھ لو۔ تھی بھی کمبخت بلا کی حسین اور جاذب۔ مگر بس اور کچھ صفات نہ تھیں۔ اور میں ایک بلند سیرت، بلند خیال، روشن دماغ، ذہین جیون ساتھی کا تصور اپنے ذہن میں رکھتا تھا — اور آج جس پر میرا دل و جان نچھاور ہے قدرت نے اُسے ان سب صفات سے نوازا ہے — اور ان صفات ہی نے مجھے دیوانہ بنایا ہے۔" آخر کار پھر ندیم نے اپنی کھوئی ہوئی روانیِ بیان پا لی۔

"تھوڑی دیر کو مان لیجئے کہ اگر یہ موجودہ جذبہ بھی آخر میں وقتی ثابت ہوا؟ یہ بھی کسی قسم کی — وہ — ایسے — کشش ہوئی تو پھر ندیم صاحب — آپ نے سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بہتر یہ ہے کہ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے آپ بھی اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"اوہ تم کتنی ناانصاف ہو گیتا۔ بھلا کون نوجوان مرد ہو گا جس سے کبھی نہ کبھی کوئی لغزش نہ ہوئی ہو۔ اور وہ تو تھی ہی کیرکٹرلس لڑکی۔ ہر کسی سے فلرٹ کرتی تھی۔ میں بھی اس کے جال میں پھنس گیا تھا اور یہ میرا کیرکٹر تھا کہ اس کے پھندے سے نکل آیا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اب عمر بھر کے لئے سچی محبت کرنے کے حق سے محروم ہو گیا ہوں۔" شکایت بھرے لہجے میں ندیم نے کہا۔

"میں کوئی الزام تو نہیں دے رہی ندیم صاحب۔ اچھا مانے لیتی ہوں

کہ آپ کی محبت گہری، سچی اور پائیدار ہے ۔۔۔ خدا کرے ہو بھی ۔۔۔ مگر جب تک مجھے خود اپنے پر پورا اعتماد نہ ہو ۔۔ میں کیسے آپ کی محبت کو قبول کر لوں"۔
ندیم کی کٹ حجتی گیتا کو ناگوار ضرور گزر رہی تھی مگر دل یقین دلا رہا تھا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ میں اسے چاہتی ہوں، ضرور چاہتی ہوں اور وہ مجھے سچے دل سے چاہتا ہے۔

"گیتا مجھے شبہ ہے کہ تم اپنے منگیتر کی طرف مائل ہو۔ کیا بہت خوبصورت ہے؟" ہائے مرد کی بدگمانی۔ سمجھتا ہے جیسے وہ خوبصورتی پر جان دیتا ہے اس طرح عورت بھی ظاہری صورت کو اتنی اہمیت دیتی ہے۔ وہ خود حسین نہیں یہ احساس ندیم کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ گیتا بے اختیار مسکرا پڑی جس سے اس کا سارا چہرہ دمک اٹھا۔ مگر ندیم کا جذبۂ رقابت اور بھڑک گیا۔ منگیتر کے نام ہی سے گیتا تو کھل اٹھی۔ ہاں وہ ضرور اسے چاہتی ہے۔

"کیا بہت حسین ہے؟" ندیم نے اسے دہرایا۔

"غالباً"۔

"غالباً کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے ان حضرت کو کبھی دیکھا ہی نہیں"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" تعجب سے ندیم نے پوچھا۔

"میں بارہ تیرہ برس کی تھی جب بابا اور ماں نے مجھے منسوب کر دیا تھا۔ پھر میں یتیم اور غریب ہو گئی اس کے ماں باپ رئیس گھرانے کی لڑکی چاہتے ہیں"۔

"اور وہ خود؟"

"یہ تو ایشور ہی جانے۔"

"تو کیا تم مجھ جیسے عاشقِ صادق پر ایک ایسے شخص کو ترجیح دو گی جس کو تم نے کبھی دیکھا تک نہیں، جو تمھیں نہ جانتا ہے نہ چاہتا ہے۔"

"ندیم میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ میں کیا چاہتی ہوں کیا نہیں؟ میں ایک دوراہے پر کھڑی ہوں — نہیں جانتی مجھے کدھر جانا چاہیئے؟" دکھ اور بے بسی سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں گیتا کے منھ سے یہ جملے نکلے۔

"مگر تمھیں فیصلہ تو کرنا ہی ہے۔"

"بے شک! اور وہ میں کر چکی ہوں۔"

"خدارا بتاؤ کیا فیصلہ کیا تم نے؟" ندیم بے تابی میں کھڑا ہو گیا۔

"مجھے غالباً وظیفہ مل جائے گا۔ اس سال میں بمبئی جا کر ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو جاؤں گی اور وہاں سوشل سائنس میں ایم اے کروں گی۔ آپ بھی ولایت جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ دو سال ہیں اپنے دلوں کو پہچاننے کے لئے کافی ہوں گے۔ ہم اپنی محبت کو انتظار کی اور دوری کی کسوٹی پر کس کر کھرا کھوٹا پرکھیں گے اور اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔" عزم کے ساتھ گیتا نے کہا اور جانے کیلئے کھڑی ہو گئی۔

"دو سال؟ اف دو سال کی یہ طویل مدّت کیسے کٹے گی۔ نہیں نہیں گیتا اس امید و بیم کے عالم میں نہ رکھو مجھے۔ تم فیصلہ کر لو، پھر میں دس سال بھی انتظار کر سکتا ہوں۔ ایک بار اور سوچو گیتا — سنو تو۔ چلیں کہاں؟" گیتا کے پیچھے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے ندیم نے کہا۔

"میں سوچ چکی۔ فیصلہ کر چکی — اب چلیئے۔ آپا کہتی ہوں گی کہاں

غائب ہو گئے!"

"گیتا یہ ہماری آخری بات چیت نہیں۔ دو چار دن اور سوچ لو۔ مگر ہمیں جدا ہونے سے پہلے پہلے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کرنا ہے ۔ گیتا ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا ۔ ہم ایک دوسرے کیلئے بنے ہیں ۔ ایک دوسرے کے ہیں اور رہیں گے۔"

"یہ تو ایشور ہی جانے۔" دھیرے سے گیتا نے کہا اور تانگے میں جا بیٹھی اس کے دل پر مہینوں سے جو بوجھ تھا وہ آج ہلکا ہو گیا تھا۔ اور ندیم بیزار و دل شکستہ بیٹھا سوچ رہا تھا۔ "کس قسم کی لڑکی ہے کیسے اس کو رام کیا جائے؟"

دوسرا حصّہ

۱

توبہ اس سال کیا بے وقت جاڑا پڑا تھا۔ نہ دسمبر نہ نومبر اور ابھی سے اتنی سردی! بے وقت کی بارش اور اولہ باری نے سردی اور زیادہ چمکا دی تھی۔ سویرے کا سمے تھا۔ گملا نگر کہرے کی دھندلی چادر اوڑھے ابھی تک محوِ خواب تھا۔ چند گز کے فاصلے سے بھی پیڑ پودے نظر نہ آتے تھے۔ آدمی تو آدمی جانور اور پرند بھی اپنے اپنے نشیمن میں سکڑے دبکے بیٹھے تھے۔ فضا میں اب تک کسی بھی پرند کی آواز نہ اُبھری تھی۔ صرف ایک مرغ کی بانگ بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

ساجو کی ساس دمہ کی پرانی مریض تھی اور اس سردی نے بچاری کے مرض کو اور بڑھا دیا تھا۔ تین چار بجے رات ہی سے اس پر کھانسی اور سانس کا حملہ ہو جاتا اور دن بھر کے تھکے ہارے شبراتی کی نیند حرام ہو جاتی۔

اس وقت بھی ماں کی مسلسل کھوں کھوں کی آواز سے شبراتی کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ساجو کو اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جو برابر کی چارپائی پر دو بچوں کو لئے سو رہی تھی۔ اس کے دبیز کا پرانا فرخ آبادی لحاف اس کے سڈول جسم پر لپٹا ہوا تھا۔ ایک بچہ کمر سے چپکا ہوا تھا دوسری بچی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی سی ناک سے سوں سوں کی آواز نکل رہی تھی۔

"ساجو — اے ساجو — اب اُٹھ بھی۔ ارے سن تو ذرا — ماں کو بہت کھانسی آرہی ہے۔"

پہلا سا شبراتی ہوتا تو اب تک ایک آدھ لات یا دو چار گالیاں دے کر اسے کب کا جگا چکا ہوتا۔ مگر اب غیر شعوری طور پہ وہ ساجو کا احترام کرنے لگا تھا جس کا اسے خود کوئی اندازہ نہ تھا۔ اب تو وہ اس سے تو تکار سے بھی بہت کم بات کرتا تھا۔

"اوں — اوں — ہوں —" ساجو نے کروٹ بدل لی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ بدلنے پر مجبور تھے۔

اب ساجو کا منہ شبراتی کی طرف تھا۔ جوانی کی نیند میں مدہوش اس کی غلافی ادھ کھلی آنکھوں کا کاجل گالوں تک پھیل آیا تھا، جامنی بھرے بھرے ہونٹ، ایک دوسرے سے ذرا سے جدا اور بھی رسیلے نظر آرہے تھے بالوں کی سیاہ لٹیں سانولے ماتھے پر بکھر گئی تھیں — یہ خوابیدہ حسن شبراتی کو اتنا اچھا لگا کہ سارا غصہ بھاگ گیا اور وہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کتنی پیاری ہے میری ساجو۔ بیچاری سارے دن کولھو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی ہے۔ گھر کا کام کاج الگ، بچوں کی دیکھ ریکھ الگ۔ اور ماں کی سیوا، میرا خیال، سب اسے اکیلے ہی تو کرنا پڑتے ہے اور پھر کھیت کیار کے کام میں بھی ہاتھ بٹا دے ہے۔ اور اب تو میری رانی ماسٹرنی بھی تو بن گئی ہے!" شبراتی کے ہونٹوں پہ جو مسکراہٹ آئی، اس میں فخر کا جذبہ، اور اپنایت کا رنگ اور پریم کا رس تھا۔ وہ ساجو پہ جھک گیا۔

"ہنھ ہٹو بھی پرے"۔ ساجو کی آنکھ کھل گئی اور ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے سانولے چہرے پر کھل اٹھی۔ اس کا ایک ہاتھ بے ارادے شبراتی کی گردن میں حمائل ہو گیا۔ دوسرا ہاتھ تو نازو کے نیچے دبا ہوا تھا نا۔ شبراتی صاحب کسی اور ہی دُنیا میں جا پہنچے۔ "میری ساجو — میری لاڈو۔"

ماں کی کھوں کھوں کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "ہنھ ہٹو بھی پرے، یہ کیا وقت ہے دلار کا —" اور ساجو نے اپنا منھ لحاف سے ڈھک لیا۔

"اوہو — بڑے نخرے ہو گئے ہیں اب تیرے۔" جھلا کر شبراتی نے کہا اور ساجو کا جواب ایک ہلکا سا خراٹا تھا۔

ماں کی کھانسی کی آواز پھر برابر کی کوٹھری میں گونجی اور شبراتی بڑبڑاتا ہوا چارپائی سے کھڑا ہو گیا۔ "یہ تو مہارانی اٹھتی ہی نہیں۔ میں جا کر خود ہی ماں کو دوا پلا دوں۔"

ماں رضائی اوڑھے اوندھی پڑی کھانس کھانس کر بے دم ہو چکی تھی۔

"ماں آج بڑی کھانسی آرہی ہے۔" سردی سے کانپتے ہوئے شبراتی نے ماں کے پاس جا کر کہا۔ روئی کی پرانی بنڈی پر اس سے بھی پرانا کمبل لپیٹ کر بھی سردی کم نہ ہو رہی تھی۔ "تمہاری دوا کہاں ہے ماں۔ لا میں پکا دوں؟" ماں جواب تو نہ دے سکی پر ہاتھ سے طاق کی طرف اشارہ کر دیا۔ شبراتی نے دوا کی پڑیا ایک پرانے بگونے میں ڈال کر گھڑیا سے تھوڑا پانی اس پر ڈالا اور کونے میں بنے چولھے میں اپلا سلگانے لگا، جس سے کوٹھری میں اور دھواں بھر گیا اور ماں کی کھانسی میں زیادتی ہو گئی۔

"تو کیوں اُٹھ کر آیا رے —" ماں نے کھانستے کھانستے بہ مشکل کہا "اس نواب جادی سے اتنا بھی نہ ہو ہے کہ ذرا سی دوا پکا دے میری۔"

مگر کھانسی کے نئے حملے کی وجہ سے "نواب جادی" کو اور گالیاں دینے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

ساجو کی نیند اب کھل گئی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے ایک بھرپور انگڑائی لی، بچوں کو اپنے سے الگ کیا اور ایک منٹ تک بڑے پیار سے ان کے معصوم چہروں کی اُور تکتی رہی۔ "کون کہے ہے مرے لال کالے کلوٹے ہیں۔ خاصے چاند سے ہیں میرے بچے۔" شبراتی کی چارپائی پر بڑا بیٹا جمراتی سو رہا تھا۔ وہ ماں سے زیادہ باپ کا لاڈلا تھا۔ مگر سوتے ہوئے وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ ساجو کی ممتا ابل پڑی جھک کر اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ کتنا لمبا ہوگیا ہے میرا لال — "آٹھ نو برس کا جمراتی بنڈی پہن اور صافہ لپیٹ کر کتنا شبراتی میں ملنے لگا تھا!

شبراتی نے کوٹھری کے دروازے پر کھڑے ہوکر ماں کو بیٹے کے دلار کرتے دیکھا تو ہنس پڑا۔ "اوہو یہ پوت کے دلار ہو رہے ہیں — اور ہمیں دھتکار دیا — کیوں جی؟" ساجو ہنس پڑی شبراتی سوں سوں کرتا، اس کی رضائی میں گھس گیا اور ساجو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم کرنے لگی۔ "ہائے کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں تمھارے ہاتھ" شبراتی کے چوڑے کھردرے سخت ہاتھ ساجو کی گدرائی مگر کھرکھری ہتھیلیوں کی گرفت میں تھے۔

"اس وقت تو منھ ڈھک لیا۔ جاؤ ہم نہیں بولتے" شبراتی نے روٹھنے کی ایکٹنگ کی۔

"ہٹو بھی — لو چھوڑو میرا ہاتھ — دن چڑھ آیا — مجھے کام کرنا ہے"

"ساجو رانی ذرا بات تو سنو۔" شبراتی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ طرارہ بھر کر دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں ساجو رانی

کہ آج ذرا سی چائے تو پلا دو۔"

"اچھا اچھا۔ ابھی لائی۔"

جاڑے میں صبح کو چائے پینے کی عادت گیتا ہی ڈال ہی گئی تھیں جب دیکھو چائے کا بنڈل تحفے میں لے آتی تھیں۔ ماں کی کوٹھری میں آگ جل ہی رہی تھی۔ گیتا نے پانی چڑھا دیا اور خود ماں کی کمر دبانے لگی۔

جا جا۔ خصم کے پاس۔ میرے پاس کیوں آئی۔ ساری رات مرتی رہی تو کسی نے نہ پوچھا۔ مر جاؤں تو اللہ کا سکر کرے گی کہ پاپ کٹا۔" کھانس کھانس کر، تھوک تھوک کر ساس نے دل کا غبار نکال ہی دیا۔

"ماں جی — سارے دن تو مرتی کھپتی رہوں۔ رات کو آنکھ ہی نہ کھلے تو کیا کروں۔ جب سے تم بیمار ہوئی سارا کام ہی مجھ پر پڑ گیا۔ سعیدن اتنی بڑی ہو گئی کچھ بھی تو نہ کرے ہے۔" ساجو نے صفائی پیش کی۔

"اری وہ تو ابھی بچی ہے۔ کھانے کھیلنے کے دن ہیں بیچاری کے۔"

"ماں جی — میں بیاہ کر جب آئی تھی تو اتنی ہی سی بچی تو تھی — میرے بھی تو کھانے کھیلنے کے دن تھے پر تم سارے دن ٹہل خدمت لو تھی — اب اپنی بیٹی کی بات ہے تو —"

پانی ابل کر گرنے لگا اور ساجو بات ادھوری چھوڑ کر ادھر لپکی۔ ساس حسبِ دستور بڑبڑاتی اور کھانستی رہی۔ ساجو نے ایک پیالہ چائے ماں کو دیا جس کو اس نے انکار کرنے اور برا بھلا کہنے کے باوجود ہاتھ میں لے لیا۔ "بڑے آئے صاحب میم — چائے پیویں گے۔" اور پھر خود بھی سڑکے بھر کر گرم گرم چائے حلق سے اتارنے لگی۔

"اری سعیدن اٹھ جا اب — بھاوج کا ذرا ہاتھ بٹا جا کے۔" ساجو

کے جانے کے بعد ماں نے بیٹی کو جگانا ہی مناسب سمجھا۔

شبراتی گرم گرم چائے پیتا جاتا اور کہتا جاتا۔" واہ واہ ـــ ساجو بیگم۔ واہ تمہارے کیا کہنے ہیں۔ جیو جیو ـــ کیا مزے کی چائے بنائی ہے۔"

"کیوں جی" ساجو نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔" تم ننھے کو پڑھنے کیوں نہ جانے دو ہو؟"

"ارے ابھی اتنا چھوٹا سا تو ہے بچارا ـــ پھر یہ ماسٹر اچھا نہیں۔ بچوں کو مارے ہے۔"

"جب سے ندیم بھیّا گئے اسکول چوپٹ ہو گیا۔ انوپم بھیّا تھے تو ذرا دیکھ بھال رکھیں تھے۔ اب کون پوچھنے والا ہے۔ جو چاہے کرے یہ نیا ماسٹر" دکھ بھرے لہجے میں ساجو نے کہا۔

"جانے یہ لوگ کیوں چلے گئے؟" شبراتی کو اپنے دونوں دوست بہت یاد آتے تھے۔

"گیتا بی کے جانے کے بعد من ہی نہ لگا ان کا۔"

"ساجو کیا سچ مچ ندیم بھیّا گیتا دیدی سے پریم کرنے لگے تھے؟" اس بھولے پن سے شبراتی نے پوچھا کہ ساجو ہنس پڑی۔

"اللہ جانے ـــ ہم نے تو کوئی ایسی ویسی بات دیکھی نہیں۔ پھر میری گیتا دیدی ستی ساوتری جیسی عورت ہے ـــ ہاں تمہارا یار ـــ ذرا بدنظر ضرور ہے۔"

"ہیں ہیں کیا بک رہی ہے۔ ندیم بھیّا بچارے اتنے اچھے خواہ مخواہ بھی۔"

"اچھا خفا نہ ہو ـــ میں تو یونہی ٹھٹول کر رہی تھی۔" ساجو نے بات ٹال دی۔

"لے میں تو کھیت پر چلا۔ کھانا جلدی سے لے کر آئیو۔"

"سعیدن کے ساتھ بھیج دوں گی ۔ مجھے آج کام ہے؟"

"کیا کام ہے؟"

"ذرا اخلن بی کو دیکھنے جاؤں گی ۔ وہ بیمار ہیں"

"صدیق میاں کی لونڈیا؟ کیا ہوا بچاری کو؟"

"جب سے ندیم بھیا گئے بچاری کو ایسا کوئی روگ لگا ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا"

"ندیم بھیا کے جانے سے روگ لگ گیا؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"اے تم تو نرے بدھو ہو" ساجو نے کھلکھلا کر کہا۔

"اور تو تو بڑی عالم بھاژل ہو گئی ہے نا" شبراتی نے برا مان کر تیز لہجے میں کہا۔

"عالم بھاژل کی بات نہیں ۔ بھولے مرد یہ باتیں کیا سمجھیں گے ۔" ساجو نے بات ٹال کر کہا اور باہر چلی گئی جہاں دیر سے بھینس ڈکرا رہی تھی۔

ساس کے بیمار پڑنے کے بعد ساجو کو پتہ چلا کہ ماں جی لاکھ برا بھلا کہے، گالی کوسنے دے مگر پھر بھی اس کا کتنا ہاتھ بٹاتی تھی بھینس باندھنا کھولنا، سانی پانی کرنا، گوبر پاتھنا، جھاڑو بہارو کرنا، سارے موٹے کام سورج نکلنے سے پہلے کر ڈالتی تھی ۔ اب ان سب کاموں کا بار بھی ساجو پر آپڑا تھا۔ سعیدن تو ایسے کاموں کو ہاتھ بھی نہ لگاتی اور برابر سے سوال جواب کرتی۔ "کیوں جی، ہم کیوں کریں۔ باندی ہیں کیا تمہاری؟" ساجو بھن بھنا کر سب کام کر ڈالتی ۔ "نہ کر نہ کر ۔ میں کیا تیری محتاج ہوں ۔ لا تیرا بھی سب کام کر ڈالوں ۔ جب سسرے کے ہاں جا کے جوتیاں کھائے گی تو پتہ چلے گا

نواب جادی کو ——" ساس بھی تو یہی گالی دے کر اس کا جی جلایا کرتی تھی۔ پھر دونوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔ ساس کی کھوں کھوں بڑھ جاتی اور ذرا دیر کو سب کام رک جاتے۔ مگر ذرا دیر بعد ساجو کو جیسے ہوش آ جاتا۔ سوچتی یہ کیا ہو جاتا ہے اُسے۔ لکھ پڑھ گئی پر گنوارپن نہ گیا۔ اس ٹانگ برابر چھوکری کے منہ ہی کیوں لگا جائے۔ پھر چار دن میں بیچاری اپنے گھر چلی جاوے گی۔ یہ گھر تو اس کا ہی ہے اس کا سارا کام کرنا اسی کا تو فرض ہے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ سعیدن بھی ذرا دیر رو دھو کر دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد ٹھیک ہو جاتی اور چولھے کا کام سنبھال لیتی۔ اسے یہ گوبر سانی کا گندا کام اصل میں بہت کھلتا تھا۔ وہ اپنے حسابوں "پڑھی لکھی" لڑکی تھی۔ اردو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھ لیتی تھی۔ اپنا نام لکھ سکتی تھی۔ بھلا کون "تعلیم یافتہ" لڑکی یہ گندا کام کرتی ہے۔ ساجو موقعہ پا کر سمجھاتی۔ "سسرال جاوے گی تو کیا ہوگا؟ تیرے سسرے کے ہاں تو بہت گائیں بھینسیں ہیں۔ پھر وہ لوگ ٹھیرے ٹھیٹھ گنوار۔ ابھی سے اپنے کو سنبھال لے بھینا نہیں تو میری طرح رو رو کر کٹے گی۔" اور سعیدن ابھی سے رونا شروع کر دیتی۔

آج بھی جنگ کے بعد جب مطلع صاف ہوا اور ساجو اُپلے پاتھ کر واپس آئی تو سعیدن بچوں کو کھانا کھلا کر، بھائی کے لئے روٹی پکا کر اب پالک کی بھاجی تیار کر رہی تھی۔ ساجو کا سارا غصہ رفوچکر ہو گیا۔ اصل میں آج میاں سے چہلیں کرنے میں دیر ہو گئی تھی کاموں کو اور اسی لئے وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔

"لے اب تو ہٹ جا۔ اب میں پکا لوں گی۔"

"نہیں بھاوج —— میں پکاؤں گی —— تم تو سبے کار خفا ہو جاتو ہو۔"

بھرائی آواز میں سعیدن نے اسے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اری واہ میں خفا ہوئی کہ تو بگڑ گئی۔ اچھا لا مجھے روٹی دے۔ بڑی بھوک لگی ہے۔"

سعیدن نے ٹام چینی کی پرانی رکابی میں مکی کی روٹی پر ذرا سا مکھن رکھ کر آگے بڑھایا۔

"بھاوج روٹی کھا کر بھیا کی روٹی بھی دے آؤ۔ بچارے بھوکے ہوں گے اب تک۔" پوٹلی باندھتے ہوئے سعیدن نے کہا۔

"میں آج نہ جاؤں گی۔ تو دے آئیو۔"

"ہنھ۔ وہ تو تمہاری باڑ دیکھ رہے ہوں گے۔ میں جاؤں گی تو منھ بنا کر کہیں گے تیری بھاوج نہیں آئی؟"

شرارت سے مسکرا کر سعیدن نے ساجو کو چھیڑا۔ "اب تو بڑا پیار ہو گیا ہے بھیا کو تم سے؟"

"چل ہٹ آئی بڑی پیار والی۔ پیار نہیں وہ ہو گیا۔"

"سچ بھاوج پہلے تو بھیا تمھیں مارا کریں تھے پر اب ـــ"

"اری ماریں تھے تب بھی تو لاڈلا ہی میں مارے تھے ـــ" کچھ اٹھلا کر ساجو نے کہا۔

"اور اب تو پڑھ لکھ گئے اب کیوں مارنے لگے۔"

"ایک بات پوچھوں بھاوج۔ کیا سب ان پڑھ گنوار اپنی بیویوں کو ماریں ہیں؟" کسی خیال میں کھو کر چولھے کے نیلے دھوئیں کو تکتے ہوئے سعیدن نے پوچھا۔

"نہیں ری۔ نہ سب ان پڑھ ماریں ہیں نہ سب پڑھے لکھے بیوی کا مان اور آدر کریں ہیں۔ یہ تو مزاج پہ ہے۔ بد مزاجی اور غصہ پڑھا لکھا مرد

بھی کر سکے ہے اور گنوار ان پڑھ بھی۔ گیتا بی نے مجھے بتایا کہ ان کی ایک سکھی ہے۔ بی۔ اے پاس۔ اور میاں ولایت کا پڑھا ہوا پر جب چاہے بیوی کو مار بیٹھے ہے۔ اور وہ کالج کی پڑھی مار کھا لے ہے۔"

"پر تم تو کہو ہو بھیا نے پڑھنے لکھنے کے بعد مارنا چھوڑ دیا۔ گالی دینا چھوڑ دیا۔"

"بات یہ ہے باولی کہ تیرے بھیا دل کے اچھے ہیں۔ صحبت ایسی ہی تھی پہلے۔ اب ندیم بھیا اور انو پم بھیا کے ساتھ رہ کر اچھی باتیں سیکھیں۔ پھر پڑھا بھی۔ کچھ لوگ ہوں ہیں جو پڑھیں زیادہ ہیں پر اس کو سمجھیں نا ہیں کچھ ایسے ہوں ہیں جو جتنا پڑھیں اتنا ہی اُسے گنیں بھی ہیں، تیرے بھیا نے پڑھا بھی ہے گُنا بھی۔ وہ ان لوگوں جیسے نہیں جن پر گدھوں کی طرح کتابیں لدی ہوئی ہیں۔"

"پر بھاوج ان پڑھ گنوار کیا جانے بیوی کا مان اور آدر کیسے کیا جاوے ہے؟"

سعیدن اس چنتا میں گھلی جاتی تھی کہ اس کا ہونے والا میاں ان پڑھ گنوار ہے جانے اس سے کیا سلوک کرے گا۔

"یہ تو بھینا عورت پر ہے۔ اگر وہ مان کرا سکے ہے تو آدمی کیا جانور سے بھی کرا لے گی۔ اگر وہ ہے ہی ایسی بزدل اور کمزور کہ مرد اسے گھول کر پی لے تو پھر پاؤں کی جوتی بن کر رہے گی۔ شریف مرد تو نہیں مگر پاپی کمینہ مرد تو ایسی عورت سے جوتی لات اور گالی گفتار سے بات کریگا ہی۔۔۔"

"پر میاں سے عزت کیسے کرائی جاتی ہے؟" پریشان ہو کر سعیدن نے پوچھا۔

"ارے ابھی سے چنتا میں کیوں مری جا رہی ہے۔ سمے آنے پر خود دیکھ جائے گی۔ جس کے دل میں اپنی عزت ہو گی اور خود میاں کی عزت اور اس کی بات کا پاس کرے گی وہ آپ ہی سیکھ جائے ہے عزت کرانا بھی۔ اس کا گُر تو یہی ہے بھینا کہ میاں کی ہر اچھی اور ٹھیک بات مانو۔ اس کے گھر والوں کا مان آدر کرو، اس کی سیوا کرو، اپنا فرض ادا کرو۔ پر اتنا گرو نہیں کہ وہ سمجھے باندی لونڈی ہے جب چاہا مار لیا جب چاہا دلار کر لیا۔۔۔"

"بھاوج جانے تم یہ بڑی بڑی باتیں کرنا کیسے سیکھ گئی ہو۔ پر مجھے یہ بتاؤ۔"

"ارے ہٹ کیا بتاؤں ـــ باتوں میں لگا کر تو نے اتنا دن چڑھا دیا۔ لا کھانا مجھے دے تیرے بھیا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب میں خلن کے ہاں کل جاؤں گی۔" جلدی سے ساجو نے پوٹلی اُٹھائی۔

الھڑ، کنواری، ناتجربہ کار، سیدھی سادی گاؤں کی لڑکی کے دل میں ہزاروں سوالات اٹھتے اور خود ہی پانی کے بلبلوں کی طرح بیٹھ جاتے۔ کس سے کہے، کس سے پوچھے؟ ایک لے دے کے ساجو تھی مگر اس کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ نند سے اتنا لگاؤ کہ اس کی ہی باتیں بیٹھی سنتی رہے اور سعیدن اپنے اندیشوں کو آنسوؤں میں ڈبو دیتی۔

۲

دس بج چکے تھے مگر ابھی تک کہرے کی چادر نے سورج کو مغلوب کر رکھا تھا۔ وہ نظر تو آ رہا تھا مگر کچھ سہما سہما دبا دبا سا۔ بڑے جتن بعد اس کی کرنیں کہرے کی چادر کو چیر کر ٹھنڈی دنیا کو تھوڑی سی گرمی اور روشنی پہنچا دیتی

تھیں .... بارے خدا خدا کر کے بارہ بجے کہرا چھٹا، سیلن، تاریکی، اور دھند دور ہوئی اور آفتاب عالم تاب کا چہرۂ زیبا نظر آیا۔

خالدہ ابھی تک لحاف میں دبکی لیٹی تھی۔ کلوا سکول جا چکی تھی اور بڑی اماں باورچی خانے میں خالدہ اور اپنے میاں کے لئے بکری کا شوربا پکا رہی تھیں۔ سکینہ خالدہ کے برابر کے پلنگ پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ جب خوب دھوپ نکھر آئی تو وہ بانوں کا چھوٹا کھٹولہ جا کر صحن میں بچھا آئیں۔ اور خلن سے آکر کہا۔ "خلن چل اُٹھ باہر دھوپ میں چل۔"

"اچھا پھپی" سر سے لحاف اٹھا کر خالدہ نے جواب دیا۔ ذرا دیر بعد الکساہٹ سے اٹھی، رضائی اوڑھی اور دھیرے دھیرے باہر چلی۔ سکینہ نے لپک کر ایک گدا کھٹولے پر ڈال دیا اور خالدہ پھر لیٹ گئی۔ سکینہ اندر سے پیڑھی اٹھا لائیں اور اس پر بیٹھ کر خالدہ کی روئی کی صدری میں ڈورے ڈالنے لگیں۔ بار بار ان کی فکر مند نظریں خالدہ کی طرف اُٹھ جاتیں جو منڈیر پر بھٹرے ہوئے بیٹھے چڑیوں کے جوڑے کو چپ چاپ تکے جا رہی تھی۔

"ہائے کتنی دبلی ہو گئی ہے بچی۔ کھانسی کمبخت بھی چلے جا رہی ہے۔ بنڈا جلتا ہے۔ اے اللہ جلدی اس بچی کو اچھا کر دے ..... کہیں دشمنوں کو ایسی ویسی کوئی بیماری نہ ہو۔" من ہی من میں یہ سوچ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

انھیں خالدہ سے اتنی محبت کب سے ہو گئی یہ وہ نہیں جانتی تھیں۔ پہلے وہ اس سے کڑھا کرتی تھیں۔ بات بات پر الجھتیں۔ یہ ہنس مکھ، چونچال، کھلنڈری لڑکی انھیں ذرا نہ بھاتی۔ "ہر وقت ٹھی ٹھی، ٹھی ٹھی۔ جانے لوگوں کو ہنسنے کا کیا مرض ہو ہے؟ اس دنیا میں ہنسنے کیلئے ہے ہی

کیا؟ کس بات پر لوگ ہنستے اور خوش ہوتے ہیں۔ بدنصیب نہیں جانتے
کہ آج کی ہنسی زندگی بھر رلاتی ہے ــــ کچھ نہیں بے حسی اور بے حیائی ہے۔
انھیں خالدہ کی دلکش ہنسی ہی کی وجہ سے اس سے چڑ تھی۔

لیکن اب مہینوں سے وہ اس ہنسی کے لئے ترس رہی تھیں۔ اس
بے فکر، چونچال الھڑ لڑکی کے لئے ان کا دل تڑپتا تھا جو کھٹی کر کے ان کو
جلاتی تھی۔ جتنا ان کا غصہ بڑھتا اس کی ہنسی بڑھتی۔ وہ ہنس مکھ خالدہ کہاں
گئی؟ وہ چمکتی آنکھیں، مسکراتے ہونٹ کیا ہوئے؟ یہ زرد چہرہ اور ویران
آنکھیں، بھنچے ہوئے ہونٹ اس خالدہ کے تو نہیں۔ ہائے کس کمبخت کی نظر
لگ گئی ان کی بچی کو۔ کہیں خود انھیں کی تو نہیں؟

سارا گھر خالدہ کی وجہ سے پریشان تھا مگر کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتا
تھا کہ آخر بیماری کیا ہے؟ بڑی اماں نظر گزر کے چکر میں پڑی تھیں۔ ابن میاں
کا خیال تھا کہ جوان لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے تو یہی ہوتا ہے ــــ
صدیق حسن جب سے اس کی بیماری کی اطلاع پا کر آئے تھے، حکیم کا
علاج کرا رہے تھے اور اب شہر سے کسی ڈاکٹر کو لانے کی سوچ رہے تھے
مگر کیا مرض ہے کیوں ہے؟ اچھی بھلی موٹی تازی لڑکی کو یہ ایک دم گھن
لگنا کیوں شروع ہو گیا؟ یہ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ صرف سعیدہ
تھیں جو سمجھ رہی تھیں کہ کیا غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اس
کے دل میں اٹھنے والی ٹیسوں کی کھٹک انھیں خود اپنے دل میں محسوس
ہوتی۔ یہی کچھ ان پر بھی تو بیت چکا تھا۔ اسی طرح ان کے حال سے
بے خبر رہ کر تو بزرگوں نے انھیں دولت کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ کسی اور کا
کیا ذکر ــــ جس بیدرد کی عمر بھر من ہی من میں پوجا کی، جس کی محبت کی آگ

میں بھسم ہو کر تن من سب راکھ کر ڈالا وہ بے حس بھی آج تک ان کے دل کا حال نہ سمجھ سکا۔

اور آج پھر وہی کہانی ان کے سامنے دوہرائی جا رہی تھی۔ خالدہ محبت کی بھٹی میں پگھل رہی تھی اور سب اس کے حال سے بے خبر تھے۔ وہ ظالم، بے حس، بے درد لڑکا اسے ٹھکرا کر جا چکا تھا۔ اس کی محبت سے بے نیاز اس کی پوجا سے بے خبر۔ اور خالدہ!! ان سے زیادہ نازک، کمزور دھان پان لڑکی دھیرے دھیرے گور کنارے جا رہی تھی۔ کیا ہوگا؟ کیا کریں؟ کیسے اس کو بچائیں؟ یہ سوال ہر وقت ان کے دماغ میں چبھتا رہتا تھا۔ وہ بار بار صدیق حسن سے بات کرنا چاہتیں مگر سامنا ہوتے ہی جیسے زبان میں کوئی تالا ڈال دیتا۔ برسہا برس گزر گئے تھے انھوں نے صدیق حسن سے کھل کر بات نہ کی تھی۔ "ہاں" "ہوں" "جی"؟ "اچھا" "خیر" "دیکھا جائے گا" "ہو جائے گا" "نہیں تو" "ہاں ٹھیک ہوں" وہ ان اکہرے لفظوں یا دو لفظی جملوں میں ہر بات کا جواب دے کر جھگڑا سا توڑ کر بچھڑا دیتیں۔ مگر کیوں؟ یہ کوئی نہ جانتا تھا نہ جاننے کی تکلیف گوارا کرنا چاہتا تھا۔ آج سے بیس بائیس برس پہلے کی باتونی، شوخ، کھلنڈری، ہنسوڑ سکینہ بھلا اب کسے یاد تھی جو گھنٹوں ساتھیوں سے ہنسی دل لگی کرتی۔ صدیق حسن کو اتنا ستاتی اور چھیڑتی کہ وہ کھسیا جاتے اور یہ ہنستے ہنستے بےدم ہو جاتی۔ بڑی اماں کب جلاتی، چڑاتی اور ان کے کوسنے اور گالیاں کھا کر اور ہنستی۔ مگر وہ کب کسی کی پروا کرتی تھی؟ ابا سے ذرا ڈرتی ضرور تھی مگر پیٹھ پیچھے ان پر بھی فقرے کسنے سے نہ چوکتی تھی۔

مگر — ایک فولادی پنجہ بڑھا اور ان کی ہنسی، بے فکری، اور ان کی خوش دلی، ان کا سکھ چین، جوانی کی امنگیں سب کو کچل ڈالا۔

جب ان کی منگنی راجہ صاحب خیرت آباد سے ہوگئی تو اس سترہ اٹھارہ سالہ الھڑ لڑکی کو یہ احساس ہوا کہ وہ تو جانے کب سے کسی اور کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا کر اپنا دل اس کے چرنوں پر بھینٹ چڑھا چکی ہے اور اس احساس کے بعد سے ایکدم اس کی ہنسی کھو گئی۔ چونچالی ساتھ چھوڑ گئی۔ زبان پر تالا سا پڑ گیا ــ آنکھیں گہرے پانی کی جھیلیں بن گئیں جو دم بھر میں چھلک اٹھتیں۔ مگر کوئی نہ تھا جو اس درد کو سمجھتا۔ وہاں تو سارا خاندان ان کی خوش بختی پر مسرت اور رشک میں مبتلا تھا۔ "اتنے بڑے گھر کی بہو بنے گی سکینہ، راجہ کی بیوی ــ رانی بن کر رہے گی" ہر زبان پر یہی چرچا تھا۔ اس کی حالت کو قدرتی چیز سمجھا گیا۔ ہر شریف لڑکی کو بیاہ کے وقت میکہ چھوٹنے کا غم ہوتا ہی ہے۔ دولھا کون ہے، کیسا ہے، کیا عمر ہے، کیسا مزاج عادت ہے ــ اس کی سکینہ کو نہ خبر تھی نہ جاننے کی خواہش اور پروا۔ ان کے دل کی دنیا سونی ہے اور سونی رہے گی۔ جب اس میں کسی کو بسانا ہی نہ تھا تو پھر اس کی کیا فکر وہ شخص جو باندی خریدنے آرہا ہے کیسا ہے؟

اور اس خیال سے آج بھی سکینہ کے دل میں نشتر کی سی نوک چبھ جاتی کہ ان کا محبوب اس کے حال سے یکسر بے خبر ابن میاں کے ساتھ خوشی خوشی شادی کے انتظامات میں مصروف رہا۔ اپنی چچا زاد بہن صدیق حسن کو بہت پیاری تھی۔ چھوٹی سی چنچل، شریر سکینہ کو بہت چاہتے تھے۔ چھوٹی بہن کی طرح اور اب اس کی شادی کی تیاریوں میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ سوچنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہ کی کہ اس کی ہنسی کیا ہوئی؟ اس کی مسرت کس نے چھین لی؟ بیاہ سے پہلے ہر لڑکی غمگین ہوتی ہی ہے۔ دُنیا کی ریت ہی یہ ہے۔

دھوم دھڑکا، باجا گاجا، ہاتھی گھوڑے، شان وشوکت، اور آتش بازیاں اور بینڈ باجے، ناچ اور مجرے، کیا نہ تھا برات کے جلوس میں۔ بَری کے تلواں کار چوبی جوڑے اور جڑاؤ زیورات ان کے نازک جسم پر لاد دیئے گئے۔ گیارہ لاکھ روپے کی سنہری زنجیروں میں ان کو مضبوطی سے جکڑ دیا گیا اور جہیز کا ہزاروں کا سامان، جس نے ان کے باپ کو کھوکھ کر دیا تھا ان کو نئے گھر بدا کیا جانے لگا۔ باپ کا رونا، سہیلیوں کا بلکنا، چچی پھوپی کی گریہ وزاری وہ خاموشی اور بے تعلقی سے سُنتی رہیں۔ انھیں جتنا رونا تھا پہلے ہی رو چکی تھیں۔

اور خیرت آباد میں جس دلہن کو بیاہ کر لایا گیا وہ ایک بے حس، بے جان سنگِ مرمر کا بُت تھا جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان کے دل کے اندر بھڑکتے شعلوں کی ہلکی سی آنچ بھی تو کسی تک نہ پہنچی۔

سکینہ بیگم کی خشک آنکھوں میں جانے کتنے برسوں بعد آج پھر شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ شعلے جو اِن پرانے رسم ورواج کو جلا ڈالنا چاہتے تھے جو معصوم، بے زبان لڑکیوں کی بھینٹ لیتے ہیں۔ ان کی نظریں خالدہ پر جمی ہوئی تھیں مگر خیالات بھٹک کر کہیں سے کہیں جا پہنچے تھے۔

اور پھر — آہ — شادی شدہ زندگی کے وہ بھیانک روح فرسا پانچ سال!! وہ ان کے ادھیڑ اور انتہائی عیاش شوہر کی تین من کی لاش کا بھیانک روپ! وہ اس کی وحشیانہ ہوس کاری اور خوفناک حجت کے سین — کیسے ان کے نازک اور لطیف احساسات نے ان بیہودگیوں کو جھیلا — یہ خدا ہی جانے۔ ان کی آرزوئیں، تمنائیں اور مسرتیں تو پہلے ہی

دل کی گہرائیوں میں دفن ہو چکی تھیں۔ اب محبوب تصورات کو بھی انھوں نے دماغ کے کسی تاریک گوشے میں پھینک دیا اور ہمہ تن اس شخص کی خوشنودی میں مصروف ہو گئیں جس سے ان کا دل نفرت کرتا تھا، ان کا جسم گھن کھاتا تھا۔ ان کی روح پناہ مانگتی تھی مگر جسے ماں باپ نے، سماج نے، قانون نے مذہب کے نام پر ان کا جائز شریکِ حیات بنا دیا تھا۔ اس زردار حُسن پرست آقا نے اس کی خوب خوب قدر کی۔ وہ اس سے خوبصورت کھلونے کی طرح کھیلتا رہا اور اس کے جذبات و احساسات کو مسلتا رہا۔ آخر وہ ایک حسین باندی خرید کر لایا تھا اپنے نفس کی تسلی کے لئے! اور سال بھر کے اندر اندر یہ مسلا ہوا پھول، یہ بچکا ہوا کھلونا، اس کے ہوس پرست من سے اتر گیا اور سکینہ کی حیثیت اس کنیز کی سی رہ گئی جو آقا کی نظروں سے گر چکی ہوتی ہے۔ سوتوں اور سوتیلی اولاد اور کوڑیوں دوسرے عزیزوں سے بھرے اس گھر میں چار سال تک سکینہ نے وہ کچھ جھیلا جس کا خیال آج بھی ان کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔ انھیں اپنی جان کی پروا نہ تھی مگر عزت آبرو بچانا بھی وہاں آسان کام نہ تھا۔ اس عیاش رئیس کے بھرے گھر میں اس جیسے اور بہت سے مردوں کی کمی نہ تھی اور ان کی بیباک نظریں سکینہ کو ہر وقت خوف زدہ رکھتی تھیں۔ مگر ہندوستان کی یہ باعفت بیٹی اپنی عزت اور آن پر جان دے بھی سکتی ہے اور شاید لے بھی لے۔ یہ بات جلد ہی لوگوں کو معلوم ہو گئی۔ اور اس عرصے میں ایک اور لڑکی اس کے شوہر کی ہوس کی بھینٹ چڑھ کر اس کے گروہ میں شامل ہو چکی تھی اور تیسری کے لانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

برسوں ابن میاں کو یہ پتہ ہی نہ چلا کہ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کس حال میں ہے۔ وہ خوش نہیں ہے یہ وہ جانتے تھے۔ مگر اس پر کیا گزر رہی ہے یہ میکے

میں کسی کو پتہ نہ تھا۔ سکینہ کی خودداری اور شرافت نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ میکے والوں کو اس کی ذلت اور مصیبت کی خبر ہو۔ مگر کہاں تک؟ آخر وہاں بھی کچھ نہ کچھ واقعات پہنچ ہی گئے۔ ادھر سکینہ یہ سب سہتے سہتے بیمار پڑ گئیں۔ کھانسی اور بخار ان کے ہر وقت کے رفیق بن گئے۔ مجبور ہو کر ابن میاں جو بیٹی کی سسرال میں قدم رکھنا حرام سمجھتے تھے، دیکھنے گئے اور اس کا وہاں جو حال دیکھا اس نے انھیں رنج و غم سے پاگل سا بنا دیا۔ انھوں نے سینکڑوں گالیاں داماد اور اس کی سات پشت کو دیں، ہزاروں ان کو جنھوں نے یہ شادی کرائی اور اسی وقت لڑکی کو ساتھ لے کر چلے آئے۔ جہیز میں جو کچھ ملا تھا وہ بھی سسرال میں رہ گیا۔ اور گیارہ لاکھ کے مہر کا کاغذ صندوقچے میں حفاظت سے بند۔ ابن میاں کی "غیرت" نے یہ گوارا نہ کیا کہ مہر کا دعویٰ کریں اور ان کی بیٹی عدالت کچہری جائے۔ ادھر سکینہ کے عالی مرتبت شوہر راجہ صاحب خیرت آباد نے پیش بندی کر کے اپنی عفت مآب بیوی پر بدچلنی کی تہمت پہلے ہی سے لگا دی تاکہ اگر کہیں مہر کا دعویٰ کیا جائے تو وہ اسے بدکار ثابت کر کے مہر ادا کرنے سے صاف بچ جائیں۔ یہ آخری ضرب سکینہ کے پندار پر ایسی پڑی جس نے انھیں بالکل ہی صاحب فراش کر دیا۔

میکے میں ماں باپ، صدیق حسن، ان کی بیوی، چچی سبھی نے ہر ممکن دلجوئی کی۔ دوا علاج میں دن رات ایک کر دیا اور سال بھر کی مسلسل کوشش اور نئی ایجاد ہوئی دواؤں نے بظاہر ان کا جسم صحت مند کر دیا، مگر اندر والے کو جو گھن لگ چکا تھا اس کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔

اور اب سولہ سترہ سال سے وہ یہ بے کیف، سنسان، اجاڑ، بے رنگ

زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ماں بیٹی کے صدمے میں کڑھ کڑھ کر ختم ہوگئیں مگر وہ پتھر کی بت ہی بنی رہیں۔ پہلے انھیں تباہ و برباد کیا۔ اب رونے سے فائدہ؟ باپ کی جائداد بک گئی، زمینداری ختم ہوگئی، گھر میں فارغ البالی کی جگہ عسرت نے ڈیرا جمالیا مگر ان کو ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا۔ انھیں کیا اس روپے جائداد کو آگ لگانی تھی؟ صدیق حسن کی پرمسرت زندگی کی بہار اُجڑ گئی۔ کڑیل جوان بیوی اللہ کو پیاری ہوئی۔ ننھی ننھی بچیاں بے ماں کی رہ گئیں، ہر طرف قیامت برپا تھی مگر ان کی بے تعلقی اور خاموشی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کا دل تو پتھر بن چکا تھا۔ یا برف کا تودہ۔ جو ہمالیہ کی بلندیوں میں کسی ویران چٹان پر پڑا ہوا ہو۔

مگر — مگر اب انھیں کیا ہوگیا ہے؟ یہ پتھر میں دراڑ کیسے پڑگئی؟ برف کا تودہ پگھلنے کیوں لگا؟ یہ ٹھیرے پانی میں لہریں کہاں سے اُٹھنے لگیں۔ یہ کیسی بیقراری ان کے دل میں پیدا ہوگئی ہے۔ کیوں خالدہ کو دیکھ کر ان کے دل میں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ وہی پہلے جیسی محبت کی کسک!! کیوں جی چاہتا ہے کہ اس کے درد کا درماں کریں۔ جیسے یہ سب خالدہ پر نہیں پھر سے انہیں پر بیت رہا ہو، کیوں وہ صدیق حسن سے بات کرنے کو بیقرار ہیں؟ تو پھر کرتی کیوں نہیں؟ کیا ڈرتی ہیں کہ جگ بیتی میں آپ بیتی نہ کہہ بیٹھیں۔ جس راز کو بائیس برس سے بے اعتنائی، بے تعلقی اور سخت دلی کے تہہ در تہہ پردوں میں چھپائے بیٹھی رہیں کہیں وہ افشا نہ ہوجائے۔

جانے کتنی دیر تک وہ ان تصورات میں کھوئی بیٹھی رہیں۔ بار بار خالدہ کی نظریں بھٹک کر ان پر جم جاتیں۔ "کیا سوچ رہی ہیں پھپھو؟" اسے ان کی نظروں سے ڈر لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اس کے من کی بات جانتی ہوں۔

"اے ہے سکینہ کیا سوچ رہی ہے۔ ذرا دلہن کو کچھ کھلادے۔ رات بھی اس نے

کچھ نہیں کھایا تھا۔" زینب بی کی آواز نے سکینہ کو چونکایا۔ وہ گھبرا کر اٹھیں اور خالدہ کے لیے کھانا لے آئیں۔ مگر اس نے دو چار نوالے کے بعد انکار کر دیا۔
"میں کیا کروں پھپی۔ مجھے بھوک ہی نہیں لگتی۔"

وہ برتن اٹھا چکی تھیں کہ ساجو گھر میں داخل ہوئی۔ آج اس نے کوئی مہینہ بھر بعد خالدہ کو دیکھا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ "ہائے اللہ کیا ہو گیا خلن بی کو؟" گیتا کے جانے کے بعد سے خلن اور ساجو میں کافی دوستی ہو گئی تھی۔ جس میں عمر، حیثیت، درجہ، ذات پات کا فرق حائل نہ ہو سکا۔ دونوں مل کر گیتا کی، مدرسے کی، انویم اور ندیم کی اور پھر کتابوں کی اور دنیا بھر کی باتیں کیا کرتیں۔ مگر ادھر ساجو اپنی پریشانیوں اور کاموں میں ایسی الجھی رہی کہ بہت کم آ سکی۔ ادھر تارا کا بھی بیاہ ہو گیا تھا۔ خالدہ کے راز سے صرف وہی واقف تھی اور اب تو کوئی ایسا نہ تھا جو خالدہ کو ذرا سی تسلی دیتا۔ یہ اندر ہی اندر گھٹن خالدہ کو اور گھلائے دے رہی تھی۔

ساجو کو دیکھ کر ایک پھیکی مسکراہٹ خالدہ کے ہونٹوں پر آئی۔ "آؤ ساجو آؤ۔ تم نے بھی ہمیں بھلا دیا۔"

ساجو زبردستی کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر پیدا کر کے آگے بڑھی اور خالدہ کے پاس جا بیٹھی۔ سکینہ نے اسے پان بنا کر دیا۔ اب ساجو سے وہ رکی رکی نہ رہتی تھیں۔ خالدہ اس کے آنے سے بہل جاتی ہے، ان کے لئے یہ بڑی بات تھی۔

"اے ہے سکینہ آکے کھانا کھا لے ـــ پھر ابن کے کھانے کا وقت ہو جائے گا۔" زینب بی نے پکارا۔

سکینہ نے ساجو سے کھانے کے لئے کہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ "بی میں

تو صبح سویرے ہی کھا پکا کے آئی ہوں۔"

اور سکینہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"گیتا بی کی کوئی چٹھی آئی تمھارے پاس؟" ساجو نے پوچھا۔

"نہیں تو" بے دلی سے خلن نے جواب دیا۔ "بھلا کون یاد رکھتا ہے کسی کو اس زمانے میں۔"

"پر انوپم بھیا کی چٹھی تو آئی تھی ان کے پاس۔" ساجو نے کہا۔

"ہاں انوپم بھیا کا خط ابا کے پاس بھی آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ سنا ہے گیتا بمبئی پڑھنے چلی گئی ہیں۔"

"اے انوپم بھیا بھی تو بمبئی جانے والے ہیں۔ انھیں وظیفہ ملا ہے" ساجو نے بتایا۔

"اور — کچھ — ندیم — بھائی — کا پتہ بھی چلا؟" آنکھیں جھکا کر، رک رک کر خالدہ نے پوچھ ہی لیا۔

"بس انوپم بھیا نے یہی لکھا تھا کہ انھیں ولایت جانے کا وظیفہ نہیں ملا۔ پر جانے اب کہاں ہیں۔"

اور خالدہ کی آنکھوں میں امید کی جو ہلکی سی جوت جگمگائی تھی وہ پھر بجھ گئی۔

اسی وقت ابن میاں اور صدیق حسن اندر داخل ہوئے۔ ابن میاں تیزی سے باورچی خانے کی طرف چلے گئے۔ جب سے خالدہ بیمار ہوئی تھی انھوں نے اس کے پاس آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے دل کو یہی دھوکا دینا چاہتے تھے کہ وہ اچھی بھلی ہے۔ "اُنھ — ہٹاؤ بھی — اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔" جب سکینہ بیمار تھیں تب بھی ان کا یہی حال تھا۔ وہ تو اگر صدیق حسن نہ ہوتے تو ابن میاں اسی دھوکے میں رہتے اور وہ کب کی ان دکھوں سے چھٹکارا

پا چکی ہوتیں۔

صدیق حسن خلن کے پاس آئے۔ پیار سے بیٹی کا سر چھوا اور ساجو سے بولے "کیسی ہو ساجو — تمہارا مدرسہ ٹھیک چل رہا ہے؟"

ساجو نے دوپٹہ ماتھے پر ذرا سا کھینچتے ہوئے کہا۔ "ہاں میاں جیسے تیسے کام چل ہی رہا ہے"

صدیق حسن "ہوں" کر کے کچھ دیر کو چپ ہو گئے، پھر خالدہ سے بولے "آج کیسا جی ہے بیٹی؟"

"بالکل ٹھیک ہوں ابا جی"

"رات کو بخار تو نہیں ہوا؟"

"جی نہیں تو" مگر صدیق حسن نے دیکھا تو اب بھی بدن جل رہا تھا۔

"حکیم صاحب کی دوا سے تو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ سوچتا ہوں کل شہر جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو لے آؤں۔ تمہارا کیا خیال ہے ساجو؟"

"ہاں میاں ضرور کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اتنے دن ہو گئے اب تک جی سنبھلا ہی نہیں" فکرمند لہجے میں ساجو نے کہا۔

سکینہ باپ کے لئے پھلکے پکا رہی تھیں مگر کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی دو چار پھلکے پکائے اور کونڈے میں ہاتھ دھو اس عجلت سے باہر آئیں کہ ابن میاں دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔ عموماً ان کا ہر کام بہت آہستہ ہوا کرتا تھا۔

صدیق حسن نے خلن سے کہا۔ "کیوں خالدہ سول سرجن کو بلا لاؤں؟"

"نہیں ابا جی بے کار کا خرچ — میں تو اچھی بھلی ہوں۔ نزلہ بگڑ گیا ہے ذرا —" بے جان آواز میں خالدہ نے کہا۔

تو بیٹی ذرا کھاؤ پیو، ہنسو بولو، جلدی سے ٹھیک ہونے کی کوشش کرو۔"
انھوں نے پہلی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اتنے میں سکینہ کی تیز آواز
ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہوں۔ ہنسو بولو، کھاؤ پیو — اچھی ہو جاؤ — جیسے یہ اس کے
بس میں ہے۔ دیکھ نہیں رہے بھیا اس کا کیا حال ہو گیا ہے؟"

صدیق حسن کا سر ایک جھٹکے سے اٹھا اور آنکھیں سکینہ کی آنکھوں سے
لڑیں۔ آج ان میں غصّے کی وہی لہر، تیزی کی وہی چمک اور آواز میں طنز کی وہی
کاٹ تھی، بیس برس پہلے جس کے وہ عادی تھے۔

"کیا تم ہمیشہ ہی بے حس اور بے خبر رہو گے دوسروں کی طرف سے؟
دیکھ نہیں رہے لڑکی کا کیا حال ہو گیا ہے؟ روز بروز گھلتی چلی جا رہی ہے اور کسی
کو کچھ خبر نہیں۔ چچی نظر گزر کے چکر میں ہیں، ابا سمجھتے ہیں کچھ بھی نہیں، اور تم
نزلہ وزلہ سمجھتے رہو گے — تمھارا کیا ہے پلی پلائی لڑکی ہاتھ سے چلی جائے گی۔
لڑکیاں کمبختیں تو ہوتی ہی ہیں اسی لئے ....."

ان کی تیز و تلخ آواز سن کر باورچی خانے میں ابن میاں کا ہاتھ کا نوالہ
ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ بڑی اماں کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا، ساجو نے حیران ہو کر
انھیں دیکھا اور ظلن کے دل میں پھوپی کی محبت کا ایک نیا احساس ابھرا۔ اور
صدیق حسن بت بنے بیٹھے تھے جیسے بولنے اور ہلنے کی قوت باقی نہ رہی ہو۔
سکینہ اور بھی جھنجلا گئیں۔ "کسی کو اندازہ ہی نہیں کہ اس کو بیماری کیا ہے اور
یہ اندازہ ہوا ہی کب تھا؟ آپ لوگوں کے سینوں میں دل تھوڑا ہی ہیں۔
پتھر ہیں — پتھر — اے اللہ تو ایسے لوگوں کو لڑکیاں دیتا ہی کیوں ہے۔
ایسے ماں باپ کی لڑکی کو پیدا ہوتے ہی موت آجائے تو اچھا ہے — یہاں

گھل گھل کر تو نہ مرے گی — بے حس — بے درد، ظالم —" اور یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ برس گزر گئے تھے لوگوں نے انھیں نہ ہنستے دیکھا تھا نہ روتے۔ جتنے آنسو تھے وہ پانچ سالہ بیاہتا زندگی میں بہا چکی تھیں۔ مگر اس وقت دریا کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ہچکیاں لیتی ہوئی ننگے پاؤں اندر کی طرف بھاگ گئیں۔ صدیق حسن کو آج پھر سکینہ میں اسی سترہ اٹھارہ برس کی جذباتی، لڑاکا، بے باک سکینہ کا روپ نظر آیا جسے وہ مدت ہوئی بھول چکے تھے۔ وہ سکتے کے عالم میں جوں کے توں بیٹھے تھے۔ اور خالدہ پر جیسے منوں پانی پڑ گیا۔ سر اور زیادہ جھک گیا۔ زرد رخساروں پر جھکی ہوئی پلکیں اور ان پر کانپتے ہوئے شبنم کے قطرے انتہائی بے بسی اور انتھاہ یاس کی ترجمانی کر رہے تھے۔

"میاں، خلن بی کو آپ سکندر پور حبیب میاں کے پاس لے جائیے وہاں اچھی طرح دوا علاج ہو جائے گا۔" ساجو نے سکوت توڑا اور صدیق حسن کو جیسے ڈوبتے میں سہارا مل گیا۔

"ارے ہاں یہ تو تم نے بڑی اچھی بات بتائی۔ حبیب میاں کی بڑے بڑے ڈاکٹروں سے دوستی ہے۔ کیوں بیٹی سکندر پور اپنی چچی جان کے پاس چلوگی۔" خالدہ کے بے رنگ چہرے پر اتنی دیر میں کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ دل نے دھڑکنا اور تمناؤں نے مچلنا شروع کر دیا۔

"جی ہاں ضرور — میرا تو وہاں جانے کو بہت دل چاہتا ہے۔" آواز میں وہ لہک اور آنکھوں میں وہ چمک جس کے لئے صدیق حسن ترس رہے تھے۔

"میں آج ہی حبیب میاں کو خط لکھتا ہوں اور اپنی چھٹی بڑھوانے کی درخواست بھیجتا ہوں۔" انھوں نے مطمئن لہجے میں کہا۔ خالدہ بنیر دلائی اوڑھے

خاصی لپکتی ہوئی اندر دالان میں جا رہی تھی کہ پھپی کو خوش خبری سنائے، اور صدیق حسن غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیوں ساجو؟" انھوں نے ساجو کی طرف جھک کر، رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کیا تمھارا یہ خیال ہے — میرا مطلب یہ ہے کہ — کہ ظلن کو — ندیم سے — یعنی کہ — اسے ندیم کے انکار سے صدمہ پہنچا ہے؟" — کئی بار انھیں اپنے جملے کی ترتیب بدلنی پڑی۔ ساجو بے اختیار مسکرائی۔ ہائے کتنے بھولے ہوتے ہیں یہ باپ چچا بھی۔ ظلن محبت کی آگ میں جل کر بھسم ہوئی جا رہی ہے اور یہ کس معصومیت سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا اسے ندیم کے انکار کا صدمہ تو نہیں؟ اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ ساجو نے بہت آہستہ سے کہا۔ "میاں — ظلن بی کی زندگی پیاری ہے تو حبیب میاں سے کہیے کہ ندیم بھیا کو کسی طرح راضی کریں — نہیں تو اللہ نہ کرے — نہیں تو —" جملہ وہ بھی پورا نہ کر سکی۔

صدیق حسن لرز گئے۔ صورتِ حال اب آئینے کی طرح ان کے سامنے روشن تھی۔ وہ کیا کریں؟ آہ لڑکی کے باپ کی بے بسی!! کرب کے عالم میں ان کی نظریں دالان کی طرف اٹھیں۔ خالدہ سکینہ بیگم کے کندھے پر سر رکھے، ایک باہنہ ان کی گردن میں ڈالے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ . . . کتنی مشابہت ہے ان دونوں میں، یہ آج پہلی بار انھوں نے دیکھا — اور — دیکھتے دیکھتے — جیسے آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹنے لگا۔ سکینہ کی باتوں کا مفہوم بھی ان کی سمجھ میں آ گیا اور اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک کا مطلب بھی سمجھ گئے۔

بائیس برس بعد —

۳

گیتا کو وظیفہ مل گیا اور وہ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس کے ڈپلوما کورس میں داخل ہوگئی۔ پہلے کچھ دن وہ ہریش چندر کے ہاں رہی جو حبیب میاں کے بہت پرانے اور عزیز دوست اور بمبئی کے باثر آدمی اور پرانے سوشل ورکر تھے۔ پچھلے سال وہ اسمبلی کے ممبر چنے گئے تھے۔ خیال تھا کہ انھیں منسٹر بنا دیا جائے گا۔ مگر ہریش چندر کو منسٹری سے کہیں زیادہ سماج سیوا پیاری تھی اس لئے اس اعزاز کو قبول کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے۔ حبیب میاں کی طرح نوجوانوں کو وہ بھی قوم کا انمول سرمایہ سمجھتے اور ان کی ہر مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔ گیتا سے جھٹ انھوں نے باپ بیٹی کا رشتہ جوڑ لیا اور اس کے سرپرست ہی نہیں دوست بھی بن گئے۔ ان کا فلیٹ جو قلابہ میں تھا خاصہ بڑا تھا مگر دل اور خاندان اس سے کہیں زیادہ وسیع۔ ان کے خاندان کے افراد میں ہر وہ شخص آجاتا تھا جسے رہنے کا کہیں اور ٹھکانا نہ ملتا یا جو بیروزگار ہوتا، غریب ہوتا اور ہریش چندر تک کسی طرح پہنچ جاتا۔ کئی ایسے لوگ تھے جو دو چار دن یا مہینے دو مہینے کے لئے آئے تھے اور اب برسوں سے یہیں رہ رہے تھے۔ ان کی بیوی پرانے زمانے کی قدامت پرست پتی ورتا عورت تھیں جن کا دھرم تھا پتی کی سیوا اور بھگوان کی پرارتھنا۔ یہ اور بات تھی کہ پتی کی سیوا میں ان تمام ناخواندہ مہمانوں کی سیوا بھی شامل ہوگئی تھی جو اُن کے گھر پر مقیم رہتے تھے۔ بال بچہ کوئی نہ تھا۔ دو بچے ہوئے مگر بچپن ہی میں بھگوان کے ہاں سدھار گئے۔ اس محرومی نے ان کے دل میں ایک سختی اور

خشکی پیدا کر دی تھی اور ہر چیز سے بیگانگی اور بے تعلقی سی۔ مگر گیتا سے انھیں
اول دن ہی سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ ان کی ششی زندہ ہوتی تو اسی عمر کی ہوتی۔
اور اس خیال نے اس لڑکی کے لئے ان کے دل میں ممتا کا دبا جذبہ ابھار
دیا تھا۔ خود ہرش چندر تو خیر اسے بے حد چاہنے ہی لگے تھے۔ ابتدا میں وہ
اسے بہت گھبرایا ہوا اور پریشان پاتے تو طرح طرح سے بہلانے کی کوشش
کرتے۔ وہ اسے سیاسی جلسوں میں لے گئے۔ فلمی دنیا کی سیر کرائی، پریس کی
ہنگامہ خیزی دکھائی، اونچی سوسائٹی کے ڈانس اور ورائٹی شو کے پروگراموں اور
تاج محل ہوٹل کی پارٹیوں میں بھی ایک آدھ بار لے گئے مگر گیتا کہیں بھی تو مسرور
اور مطمئن نظر نہ آتی۔ وہ کہیں بھی تو نہ کھپتی تھی۔ گھر پر بھی اتنا ہجوم اور ہنگامہ
رہتا کہ نہ اسے پڑھنے لکھنے کا وقت ملتا نہ آرام کا۔ رات گئے تک سڑک پر گزرتی
بسوں اور موٹروں کا شور اور وکٹوریا کے گھوڑوں کی ٹاپ ٹاپ اس کو نیند سے
ناآشنا رکھتی۔ ہاں اگر اسے سکون ملتا تو سمندر کے کنارے بیٹھ کر۔ مگر یہاں بھی دن
ڈھلتے ہی وہ ہجوم اور ہنگامہ برپا ہو جاتا کہ وہ گھبرا جاتی۔ شام ہوتے ہی ہزاروں
آدمی گھروں سے نکل کر سمندر کے کنارے سیر کرنے آجاتے اور رات گئے تک
ہنستے بولتے، فلرٹ کرتے، کھاتے پیتے یا محض چپ چاپ بیٹھے رہتے اور
گیتا سوچتی کیا واقعی یہاں کے لوگوں کو تازہ ہوا اور کھلی ہوا اتنی پسند ہے یا
کوئی اور بات ہے جو انھیں یہاں کھینچ لاتی ہے؟ یہ تو مہینوں بعد اسے اندازہ
ہوا کہ ان میں سے بیشتر لوگ وہ ہیں جو اپنی تنگ و تاریک چالوں اور گھٹی ہوئی
کوٹھریوں اور تازہ ہوا اور روشنی سے محروم مکانوں کی اُمس، گھٹن، سیلن
اور بدبو سے گھبرا کر سمندر کے کنارے کی کھلی فضا میں اپنے دماغ کو روشنی،
دل کو تازگی اور پھیپھڑوں کو ہوا پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گیتا یہاں گھبرا اٹھی۔ اس بڑے شہر میں جو ایسے انسانوں کا جنگل سا لگتا وہ کھوئی سی جا رہی تھی۔ ہر طرف اجنبیت کا احساس۔ جیسے ہر شخص گھبرایا ہوا کسی طرف بھاگ رہا ہو۔ کسی کو کسی سے بات کرنے، دوسرے کا دکھ درد سننے کی فرصت ہی نہ ہو۔ ہزاروں موٹروں، بسوں اور گاڑیوں کی آمدورفت انسانوں کا ہجوم، ریلوں کا شور، اس کے اعصاب کو کچلے دیتا تھا۔ ایسے لگتا کہ اس کی شخصیت اور انفرادیت کچلی سی جا رہی تھی۔ وہ یہاں کیا پائے گی، کہیں خود کو ہی نہ کھو دے۔

منھ اندھیرے جب وہ قلابہ سے اندھیری، بجلی کی لوکل ٹرین میں سوار ہو کر اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف روانہ ہوتی تو تیزی سے گزرتی ہوئی ٹرین کی کھڑکی سے ایسے مفلسی اپنی پوری تباہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی۔ ذرا دور اسی جھونپڑیاں جن کی دیواریں زنگ خوردہ ٹین کے ٹکڑوں اور چھتیں کھجور کے پتوں کی رہین منت ہوتیں ہزاروں کی تعداد میں بنی ہوئی تھیں جن میں لاکھوں افراد بارش دھوپ اور سردی سے بچنے کے لئے سر چھپانے کی کوشش میں خود اپنی خستہ حالی اور آزاد ہندوستان کی خوشحالی کا مذاق اڑاتے معلوم ہوتے۔ اور یہ لوگ تو پھر بھی "خوش نصیب" تھے۔ کم سے کم سر چھپانے کا ٹھکانا تو تھا ان کے پاس۔ مگر ایسے لوگوں کی بھی تو کمی نہ تھی جو عالی شان بلڈنگوں کے سائے میں کسی دوکان کے سامنے یا کسی ہیبلک عمارت کی سیڑھیوں پہ ایک پھٹی چادر میں رات بتا دیتے یا محض پراسرار اخباروں کو اوڑھنا بچھونا بناتے تھے۔ تاروں بھرا ننگا نیلا آسمان ان کی چھت اور زمین کا سخت اور سرد سینہ ان کا چھپرکھٹ ہوتا۔ گیتا کانپ جاتی۔ ایک طرف یہ عالی شان عمارتیں، یہ نظر فریب گارڈن اور پارک، یہ شاندار ہوٹل ہیں اور دوسری طرف یہ خوفناک مفلسی،

تباہ حالی ..... اس کا جی چاہتا وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے اس شہر سے اور پھر اپنے کملا نگر میں جا کر بستی کے سیدھے سادے معصوم لوگوں کی سیوا کا دلکش کام شروع کر دے۔

ایک مہینے کی کوشش کے بعد آخر اسے بورڈنگ میں جگہ مل ہی گئی اور ہریش چندر خوش ہوئے کہ اب لڑکی اپنے ہم عمروں کے ساتھ رہ کر بہل جائیگی۔ مگر شروع میں یہاں گیتا کو اور بھی اجنبیت محسوس ہوئی۔ وہاں کم سے کم ہریش چاچا اور ماتا جی تو اپنے لگتے تھے اور یہاں تو جو لڑکیاں بورڈنگ میں اور جو لڑکے انسٹی ٹیوٹ میں نظر آتے وہ اسے بالکل ہی بدیسی معلوم ہوتے۔ جیسے وہ ہندوستان سے باہر کسی مغربی ملک میں چلی آئی ہو۔ ان کا رہن سہن بول چال، فیشن، انداز، طرزِ فکر و طرزِ معاشرت سبھی تو اسے عجیب معلوم ہوتا تھا۔ شام ہوتے ہی لڑکے لڑکیاں بانہوں میں بانہیں ڈال کر سیر تفریح کے لئے چلے جاتے، بعض لڑکیوں کی پارٹی اسی انداز میں سیر کو نکل جاتی، اور گیتا چپ چاپ اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ پڑھتے پڑھتے اکثر حروف غائب ہو جاتے اور سکندر پور اور کملا نگر کی تصویریں صفحات پر ابھر آتیں ..... خالدہ اور کلو کی آنسو بھری آنکھیں، تارا اور لتا کے مسکراتے چہرے، ساجو اور شراتی کی مخلص محبت بھری مسکراہٹیں، دم بھر جھلک دکھا کر غائب ہو جاتیں۔ پھر انوپم اور ندیم کے چہرے ابھرتے۔

اور پھر ــــ پھر ندیم کی پیش کش، خود اس کا انکار، ندیم کا اصرار اور پھر ناراضگی، اس کی بظاہر بے رُخی اور دل کی بے چینی ایک ایک بات کی یاد تازہ ہو جاتی۔ جانے ندیم کہاں ہیں؟ میں یاد ہوں یا بھول گئے؟ اور پھر

ڈراپ سین ہوتے ہوتے بابا اور ماں کی یاد موتیوں کی لڑیاں بن کر آنکھوں سے ٹپکنے لگتی۔

مگر دو تین ہفتے کے اندر ہی وہ اس زندگی سے مانوس ہونے لگی۔ چند دن سے لیلے کوکو والا اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ اس سے بڑی خصوصیت اور محبت کا اظہار کرتی اور بڑی ترکیب سے اس وحشی ہرنی کو رام کر رہی تھی۔ اب گیتا کی شامیں اتنی اداس اور طویل نہ رہی تھیں۔ دونوں اکثر ساتھ ساتھ فلم دیکھنے یا سمندر کی سیر کرتے چلی جاتیں۔

ایک دن گیتا کلاس میں داخل ہوئی تو اسے کونے کی ایک کرسی پر ایک شناسا صورت نظر آئی۔ ایک لمبا دبلا سانولا نوجوان انہماک سے کچھ لکھ رہا تھا۔ گیتا کا چہرہ دمک اٹھا اور پہلی بار اس کی سمجھ میں اس شعر کا مطلب آیا ؎

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

گھنٹہ ختم کر کے جب وہ باہر آئی تو انوپم ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ارے انوپم صاحب آپ! یہاں!!" اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ انوپم کے چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔

"میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"مگر آپ کب آئے؟ کیسے آئے؟ کہاں ٹھیرے ہیں؟ داخلہ اتنے دن بعد کیسے مل گیا؟" گیتا کے ایک دم اتنے سوالوں پر انوپم ہنس پڑا۔

"چار دن ہوئے آیا۔ ریل سے آیا۔ داخلہ پہلے ہی مل گیا تھا۔ لیٹ ہونے کی معذرت کرلی — ہریش صاحب کی بدولت معافی مل گئی۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھہرے کہاں ہیں؟"

"ہریش چندر صاحب کے ہاں۔"

"خوب ہیں ہمارے ہریش چاچا۔ گھر کیا ہے ان کا پورا بورڈنگ ہے۔"

"ہاں بڑے مخلص آدمی ہیں۔"

کئی لڑکے اور لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئے تھے اور اس "مغرور" لڑکی کو جو کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی حیرت سے اس "گنوار" لڑکے سے اس ذوق شوق سے گفتگو کرتا دیکھ رہے تھے۔

"اے ورما — کون ہے یہ؟ تمہارے دیس کا کوئی چھوکرا۔" لیلے نے قریب آتے ہوئے گیتا سے سوال کیا۔ یہاں سب لوگ اسے "سرنیم" سے پکارتے تھے اور لیلے تو مس کا جھگڑا ابھی نہیں لگاتی تھی خالی "ورما" ہی کہتی اور گیتا بیچاری اکثر بھول جاتی کہ یہ مردانہ نام "ورما" سے اسے بلایا جا رہا ہے۔ اس وقت بھی ایک لمحے کے لئے وہ کھو سی گئی۔

"ہاں لیلے بہن — یہ میرے ہم وطن اور دوست ہیں۔ مسٹر انوپم گیتا اور آپ ہیں مس لیلے سہراب جی رستم جی کوکو والا۔" اور انوپم اس انوکھے نام کی حیرت میں کچھ ایسا گم ہوا کہ اس نے لیلے کا بڑھا ہوا ہاتھ بھی نہیں دیکھا۔ پھر چونک کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کی تو لیلے زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ گیتا کا یہ بدھو دوست تفریح کا اچھا سامان رہے گا۔ اس نے سوچا اور بے تکلفی سے گیتا کے بازو میں بازو ڈال کر بولی۔ "اچھا مسٹر گیتا — آپ سے پھر ملاقات ہوگی اب ہم چلے۔" انوپم دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا اور وہ تقریباً کھینچتی ہوئی گیتا کو لیکر روانہ ہوگئی۔

۴

انسٹی ٹیوٹ سے کچھ دور ایک خاموش کونے میں چھوٹی سی ایک کھاڑی کے کنارے گیتا بڑے سے سیاہ پتھر پر بیٹھی تھی۔ سمندر کی لہریں پلٹ پلٹ کر آتیں اور اس کے سڈول پاؤں چوم کر واپس پلٹ جاتیں۔ ڈوبتے سورج کی گلابی کرنیں اس کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں اور ہوا کے تیز جھونکے اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے، ریت کے چمکدار ذرّے اس پر واری نثار جا رہے تھے مگر گیتا ان سب کی پوجا سے بے نیاز اُفق پر اڑتے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہلکے، بھورے، نیلے، گلابی اور دودھیا بادل جن کے کناروں پر سورج کی کرنوں نے سنہری اور روپہلی مقیش ٹانک دی تھی ––– زمین کی خوشنمائی سے بے خبر وہ آسمان کی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی لگ رہی تھی۔

انوپم اس سے کچھ دور ایک دوسرے پتھر پر، چند کتابیں لئے بیٹھا اس کی اور ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ گیتا کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی جس سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ زمین ہی کی نہیں اصل میں آسمان کی رنگینیوں سے بھی بے خبر تخیل کی کسی وادی میں گم ہے اور اس وادی میں انوپم کا گزر نہیں ––– یہ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔

انوپم کو یہاں آئے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو انوپم صاحب کم سے کم ایک گروپ کے لیڈر بن چکے ہوتے، مگر یہاں وہ ابھی تک اپنے کو اجنبی ہی محسوس کرتے تھے۔ دو چار لڑکوں سے تھوڑی بے تکلفی ضرور ہوئی مگر زیادہ تر اس سے الگ تھلگ ہی رہے اور خود اس نے بھی گھلنے ملنے

کی کوشش نہیں کی۔ ان کی دلچسپیاں، ان کی معاشرت، ان کا اندازِ گفتگو اور اندازِ فکر اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ پیٹھ پیچھے ہی نہیں سامنے بھی اس کا مذاق اڑانے سے نہ چوکتے تھے۔ کھدر کے کپڑوں اور جواہر کٹ جاکٹ میں ملبوس پاؤں میں سستی سی چمڑے کی چپل پہنے، یہ سنجیدہ سا نوجوان کسی طرح بھی تو ان فیشن ایبل، اسمارٹ، خوش پوش، خوش مزاج نوجوانوں میں کھپتا نہ تھا۔ انسٹی ٹیوٹ میں جن کی اکثریت تھی۔ لیکن انوپم ان قہقہوں اور استہزا کے نشانوں کے درمیان سے اس خوداعتمادی اور شانِ استغنا سے گزرتا جیسے وہ سب کٹ پتلیاں ہوں جن میں وہ اکیلا گوشت پوست کا انسان ہے۔ اسے ان کے درمیان کبھی احساسِ کمتری نہ ہوتا بلکہ اپنی اہمیت اور خودی کا جذبہ کچھ اور زیادہ ابھر آتا ___ یہی خودپسندی یا خودشناسی تھی جس نے انوپم کو یہاں سے بھاگ جانے سے باز رکھا۔ یہاں کی لڑکیوں سے تو وہ بالکل ہی الگ تھلگ رہتا۔ آج تک قصبوں اور دیہاتوں میں سوشل ورک کے سلسلے میں اسے پچاسیوں عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ کالج میں کچھ لڑکیوں نے ساتھ پڑھا بھی تھا۔ مگر اس انداز سے اس کا سابقہ نہ پڑا تھا۔ یہ تنے ہوئے جسم اور برہنہ ٹانگیں، نیچے گلوں کے یہ اونچے بلاؤز، سرخ سرخ ہونٹ اور نوکیلے ناخن، بے باک ہنسی اور فلک شگاف قہقہے یہ سب اس کے لئے نیا بھی تھا اور ناگوار بھی۔ اگرچہ وہ دیکھتا تھا کہ اس جیسے دیہاتی اور قصباتی نوجوان بڑے جلدی یہاں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، مگر وہ تو جیسے ڈرتا تھا کہ قریب گیا تو شعلوں کی زد میں نہ آجائے۔ ہاں لیلےٰ سے مجبور تھا جو جان جان کر ان دونوں کے پاس گھستی اور انوپم سے عجیب انداز کی خصوصیت کرتی۔ کبھی

مذاق اڑاتی، کبھی تعریف کرتی۔ کبھی پھبتیاں کستی، کبھی خصوصیت فرماتی۔ انوپم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر گیتا میں اور اس میں کیا چیز مشترک ہے جس کی وجہ سے دونوں میں اس قدر دوستی ہے۔ مگر گیتا اکثر اس کے گن گایا کرتی تھی۔ اس لکھ پتی گھرانے کی عیش و عشرت کی دلدادہ لڑکی کو سوشل ورک کا شوق کیوں چرایا؟ یہ انوپم کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جب وہ قیمتی ساڑھیاں اور بیش بہا زیور پہن کر کلاس میں آتی تو انوپم کے ذہن میں کسی کا یہ فرسودہ مصرع گونجنے لگتا ع

اے میں قرباں رن میں جاؤ گے اسی انداز سے؟

گندی چالوں، غریب محلّوں، مفلس لوگوں کی سیوا یہ خاتون اسی انداز میں کریں گی؟ یہ سوچ کر انوپم ہنس پڑتا۔

ان شوخ و شنگ تتلیوں کے درمیان اسے گیتا چنبیلی کا ایک تنہا پھول لگتی جو باغ کے کسی کونے میں چھپی جھاڑی میں کھلا ہوا ہو۔ جس کا دلنشین حسن بوالہوس نظروں کو نہیں کھینچتا بلکہ اس کی سادگی اور سندرتا کی ہلکی ہلکی مہک روحانی مسرت اور سکون بخشتی ہے۔

اگر کوئی انوپم سے پوچھتا کہ کیا وہ گیتا پر عاشق ہو گیا ہے تو وہ ہرگز نہ مانتا۔ بھلا کہاں گیتا اور کہاں وہ۔ گیتا بڑی گھرانے کی لڑکی اور وہ اس سے گھٹیا ذات کا معمولی فرد ــــ اگرچہ وہ ذات پات کے بھید بھاؤ کا خود سختی سے مخالف تھا اور اس اونچ نیچ کو ہٹانا اپنا فرض سمجھتا تھا ــــ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ ذہنوں سے اس زہر کا اثر آسانی سے خارج نہیں ہو سکتا۔ پھر کہاں گیتا کا حسن، اس کی ہر دلعزیزی اور جاذبیت اور کہاں اس جیسا کم رو کم حیثیت نوجوان۔ یہاں غیروں میں انوپم اسے اپنا معلوم ہوتا ہے اس لئے

وہ اس سے مل لیتی ہے۔ خصوصیت بھی کرتی ہے ورنہ کیا اسے یاد نہیں کہ یہی گیتا سکندرپور اور کملا نگر میں اسے ذرا بھی لفٹ نہ دیتی تھی۔

مگر عشق — عشق تو ان بندشوں کا پابند نہیں۔ اگر اسے گیتا سے پریم ہے تو اس سے دس گناہ کا دٹیں بھی ہوں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محبت مسائل کو سوچ بچار کر، کامرانی کا یقین کر کے تو کی نہیں جاتی۔ یہ کوئی سودا تو نہیں جو ٹھوک بجا کر، کھرا کھوٹا پرکھ کر کیا جائے —

مگر جب پریم ہو تب نا؟ اسے گیتا سے کیا کسی سے بھی پریم نہیں ہو سکتا محبت تو اسے صرف اپنے اس آدرش سے ہے جس کے لئے دس برس سے وہ اپنے کو کھپائے ہوئے ہے اور جس کے لئے اس ناپسندیدہ ماحول میں جد و جہد کر رہا ہے — اس کا آدرش ہے اپنے دیس کی سیوا کرنا اور اس کے باسیوں کو اوپر اُٹھانے کی سعی ..... اور یہ اسے حسین سے حسین محبوبہ سے زیادہ پیارا ہے۔

اس نے ایک لمبی سانس لی۔

پھر وہ گیتا کی اور کھنچا کیوں جا رہا ہے؟ اس سے باتیں کرتے سمے من میں خوشی کی کلیاں سی کیوں چٹکنے لگتی ہیں؟ کیوں یہ دنیا کیف و سرور سے بھرپور نظر آتی ہے؟ آسمان کی نیلاہٹ، سورج کی تابناکی، درختوں کی ہریالی، پھولوں کی مہک، پرندوں کی چہچہاہٹ، چاند کی سحر آفرینی، تاروں کی دمک، فضا کا حسن، ہوا کی لطافت۔ ہر چیز میں ایک نئے معنی کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب نہ انوپم جنے سکتا ہے اور نہ دینا چاہتا ہے۔ وہ اس بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ وہ یہاں تنہا ہے کوئی اور پرانا دوست اور ساتھی نہیں۔ سوا گیتا کے۔ اس لئے اسے اس کا

ساتھ اور صحبت اچھی لگتی ہے۔ اور خود گیتا کے دل میں کیا ہے؟ یہ بھلا وہ کیا جانے؟ عورت کے دل کی بات تو بڑے بڑے رشی منی بھی نہ سمجھ پائے وہ بچارا تو ٹھیرا ایک سیدھا سادہ دیہاتی نوجوان جس کی ساری دنیا اور زندگی کا سارا تجربہ سیوا تک محدود ہے۔ ہاں گیتا ساتھ ہوتی ہے تو وہ دونوں مطمئن و مسرور ہوتے ہیں یہ وہ جانتا تھا۔ البتہ جب لیلے دو میں تیسرا بن کر اس میں گھس جاتی ہے تو انوپم کا موڈ بگڑ جاتا ہے، یہ لیلے بھی سمجھتی تھی اور گیتا بھی جانتی تھی۔ مگر گیتا جان جان کر اسے جلاتی اور اس کا مذاق اڑاتی اور گیتا اسے سمجھاتی کہ لیلے تو بس مذاق کرتی ہے کبھی لیلے کو جھڑکتی "لیلے بہن تم کیا جانو انوپم صاحب کتنے ذہین اور قابل ہیں۔ جانتی بھی ہو سکندر پور اور کملا نگر میں لوگ ان کو پوجتے ہیں....."

"واہ رے مرے دیوتا —" لیلے قہقہہ لگاتی۔

"اور خود حبیب میاں سب سے زیادہ ان کو چاہتے اور ان کی قدر کرتے ہیں...." گیتا اپنی بات میں اور وزن پیدا کرنے کیلئے کہتی۔

"یہ حبیب میاں بھی مجھے نرے کوئی —" اور گیتا بگڑ اٹھتی "بس بس لیلے — تم ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کر سکتیں —" اور لیلے ہنس کر بات ٹال دیتی اور انوپم دل ہی دل میں گھٹتا رہتا۔ وہ اس کی ظرافت یا "ہیومر" سے افسوس ہے کہ محظوظ نہ ہو سکتا تھا۔ مگر کم سے کم ظاہر یہی کرنا پڑتا تھا۔ یہ تہذیب اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ لڑکیاں کسی نوجوان مرد پر پھبتیاں کسیں، مذاق اڑائیں، زبان کو بے لگام چھوڑ دیں اور خود اس سے ہر وقت تہذیب کے دائرے میں رہنے کا مطالبہ کریں۔ اگر سچی مساوات چاہتی ہیں تو پھر یہ رعائتیں کیوں؟

مگر گیتا کی خاطر وہ یہ سب گوارا کر رہا تھا۔ ان دونوں کی دوستی پچھلے دو مہینے میں غیر محسوس طور پر بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ کلاس میں اب ایک دوسرے کے برابر بیٹھتے۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ گیتا نوٹس بہت تیزی سے لیتی تھی اور پھر کاپی انوپم کی طرف بڑھا دیتی جسے نقل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی ایک بار پڑھ کر کام کی باتیں حافظے میں نقش ہو جاتی تھیں۔ انوپم مطالعہ بہت کرتا تھا اور گیتا کو ایسی کتابیں اور مضمون فراہم کرتا جو اس کیلئے مفید تھے۔ یوں بھی دونوں کے ساتھ رہنے سے گیتا کے ادبی، فلمی اور سیاسی ذوق پر کافی اثر پڑا تھا۔ پہلے وہ صرف ناول یا کہانیاں پڑھتی تھی اب سنجیدہ کتابوں کی طرف زیادہ دھیان دینے لگی تھی۔ پہلے صرف معمولی غزلوں یا انقلابی نظموں تک اس کے شعر وسخن کا ذوق محدود تھا، اور بمبئی آکر تو وہ صرف فلمی گیتوں تک رہ گیا تھا مگر اب کلاسکل شاعروں کا کلام انوپم کے منھ سے سن کر اسے ایک نیا لطف آنے لگا تھا۔ بہت گھٹیا فلم وہ پہلے بھی پسند نہ کرتی تھی، مگر دیکھ لیتی تھی۔ مگر اب دونوں اچھی طرح دیکھ بھال کر اس فلم میں جاتے جو اونچے درجے کا ہوتا چاہے ہندوستانی ہو یا انگریزی۔ سیاست میں اس کی دلچسپی بس اتنی تھی کہ گاندھی جی کی عقیدت مند، نہرو کی پرستار اور سوشلزم کی حامی۔ ادھر ندیم کی دوستی میں کمیونزم سے بھی بہت دلچسپی پیدا ہو چلی تھی، مگر وہ ان باتوں کو کبھی زیادہ سوچتی نہ تھی لیکن انوپم کی نظر سیاست کے ہر پہلو پر رہتی تھی اور چاہتا تھا کہ گیتا بھی ہندوستان ہی کی نہیں دنیا کی سیاست اور حالات پر کچھ نہ کچھ نظر رکھے اور دھیرے دھیرے وہ اسے اس طرف لانے کی کوشش بھی کر رہا تھا مگر گیتا یا تو بحث میں اس سے لڑ بیٹھتی یا پھر "ہٹاؤ بھی یہ جھگڑے" کہہ کر بساط الٹ دیتی۔

گیتا کی شامیں اب اکثر انوپم کے ساتھ گزرتی ہیں، یہ بات لیلےٰ کو بہت ناگوار تھی۔ اس "گنوار" "غریب" اور "کم رو" شخص کو کیا حق ہے کہ وہ لیلےٰ کی ہونہار، حسین، دلچسپ اور ذہین دوست کو اس سے چھین لے۔ اور گیتا کتنی بد مذاق ہے کہ لیلےٰ کے بجائے اس کی صحبت کو پسند کرتی ہے؟ بات کچھ نہیں بچاری نوجوان مردوں کی صحبت کو ترسی ہوئی ہے۔ خیر لیلےٰ اسے اسمارٹ فیشن ایبل رئیس نوجوانوں سے ملائے گی تو وہ اس جنگلی سے آپ ہی آپ دور ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر لیلےٰ نے گیتا کی طرف اور زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ اب تو اس کا اور انوپم کا مقابلہ آپڑا تھا۔ اسے ہر طرح اس کو نیچا دکھانا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جب لیلےٰ گیتا کو مدعو کرتی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اسے ٹال دیتی ہے اور انوپم کے ساتھ چلی جاتی ہے؟ یہ لڑکی اتنی اتراتی کس بات پر ہے؟ اس پر اپنی ذہانت، علم دوستی اور کیرکٹر کا رعب گانٹھنا چاہتی ہے؟ نہ وہ اس کی دولت سے مرعوب ہوتی ہے نہ شان وشوکت، فیشن وحسن سے متاثر! نہ اس کی محبت وسخاوت کو خاطر میں لاتی ہے؟ یہ گنوار لڑکا اسے لیلےٰ سے زیادہ پسند ہے؟ مگر لیلےٰ گیتا کو اس سے چھین کر رہے گی اور لیلےٰ نے گیتا پر محبت اور خصوصیت کی بوچھار شروع کر دی۔

اور گیتا ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی تعلیم اور انوپم کی نئی نئی دوستی پر مسرور اور مگن تھی۔ وہ کبھی کبھار انوپم کے ساتھ سیر تفریح کو چلی جاتی ہے یہ کوئی بری بات نہیں۔ وہ لیلےٰ کی محبت اور عنایت سے بھی بہت متاثر اور اس کی ممنون تھی، مگر ابھی تک یہ سمجھتی تھی کہ لیلےٰ محض وقت گزاری کے لئے پڑھ رہی ہے اور اسے اپنا مستقبل بنانا اور زندگی کی جد وجہد میں حصہ لیکر اپنا مقام

بنانا ہے۔ اس کا فیلڈ ورک شروع ہو چکا تھا۔ بمبئی کی گندی گلیوں، تاریک چالوں، تنگ کوٹھریوں میں صحت وصفائی کی مہم اس نے اور انوپم نے ساتھ مل کر شروع کر دی تھی۔ یہاں اسے قدم قدم پر انوپم کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ لیلیٰ کی دلچسپ صحبت اور سیر و تفریح کی نہیں اتنا گیتا جانتی تھی۔۔۔۔۔

مگر گیتا کو یہ احساس نہ تھا کہ وہ کتنا انوپم کے رنگ میں رنگتی جا رہی ہے یہ خیال بھی نہ آتا کہ پہلے وہ اس سے بچتی ہی نہیں بلکہ جلتی تھی۔ ہاں انوپم کو یہ ضرور یاد تھا کہ وہ اس سے زیادہ ندیم سے مانوس تھی مگر اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ندیم اس سے زیادہ خوش رو، خوش گفتار، خوش مزاج اور یار باش ہے۔ سبھی لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ یہاں صرف وہی ہے جس سے گیتا کو کوئی ذہنی رفاقت مل سکتی ہے اور اس لئے وہ اس سے مانوس ہو گئی ہے اور اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر انوپم نے گیتا کی شخصیت کو ابھارنا اور صلاحیتوں کو جلا دینا اپنا خوش گوار فرض سمجھا ۔۔۔ مگر کیوں؟ یہ سوچتی اس کی بلا۔

مگر اس وقت گیتا اتنی پریشان کیوں ہے؟ بار بار انوپم پوچھنا چاہتا مگر رک جاتا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔

"کیا بات ہے گیتا؟ بڑی پریشان سی نظر آ رہی ہو"؟ اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

گیتا چونک پڑی۔ "نہیں تو ۔۔۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

"پھر بھی ۔۔۔۔۔؟"

"ساجو دیدی کا خط آیا ہے ۔۔۔ خالدہ بہت بیمار ہے۔"

"ارے کب سے؟"

"کئی مہینے سے!"

"مگر کیا بیمار ہیں وہ ؟"

"لوگ کہتے ہیں - ایشور نہ کرے — اُسے ٹی بی ہے" اور یہ کہتے کہتے گیتا کا گلا رندھ گیا ۔

"مگر — تم پریشان نہ ہو گیتا — ٹی بی اب کوئی ایسی بیماری تو نہیں جس کا علاج نہ ہو سکے ۔ کتنے مریضوں کا علاج تو میں نے کرایا ہے — ان کا ٹھیک سے علاج ہونا چاہیے چند دن میں اچھی ہو جائیں گی ۔"

جتنا انوپم سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا گیتا کی سسکیاں بڑھتی جا رہی تھیں ۔ یہ بھی عجیب انسانی فطرت ہے کہ تنہائی میں بڑے سے بڑے غم کو سہار لیتا ہے مگر ہمدردی کے دو چار بول سن کر بے قابو ہو جاتا ہے — انوپم جانتا ہی نہ تھا کہ کسی روتی لڑکی کو کیسے چپ کیا جاتا ہے ۔ جتنا وہ گھبرا گھبرا کر اسے تسلّی دیتا اتنے ہی تیزی سے گیتا کے آنسو گرتے جاتے — یہاں تک کہ انوپم کی موٹی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ وہ چپ ہو جائے تو بہتر ہے ۔ تھوڑی دیر میں گیتا کی سسکیاں دھیمی پڑیں ۔ آنسو تھمے ، اس نے جھک کر سمندر میں منھ دھو کر پلو سے پونچھا اور جانے کیلئے کھڑی ہو گئی ۔ اپنی اس کمزوری پر وہ بہت شرمندہ سی لگ رہی تھی ۔ انوپم کچھ دور اس کے ساتھ ساتھ آیا ۔ دوراہے پر گیتا بورڈنگ کی طرف ہولی اور انوپم تیزی سے اسٹیشن کی طرف بھاگا ۔ جہاں اسے لوکل ٹرین قلابہ جانے کیلئے پکڑنی تھی

۵

بہار کا موسم شروع ہو گیا تھا اور بمبئی کی زندگی میں ایک نئی رونق چہل پہل

اور گہما گہمی پیدا ہوگئی تھی۔ اکثر تعلیمی اداروں میں موسم بہار کی چھٹیاں ہوگئی تھیں اور ہر طرف نوجوانوں کی پارٹیاں پک نک مناتی، سیر و تفریح کرتی نظر آتی تھیں۔ گیتا کے ہاں بھی ایک ہفتے کی چھٹی شروع ہونے والی تھی۔ ہریش چندر کا اصرار تھا کہ وہ چھٹیوں میں گھر آجائے۔ مگر گیتا وہاں کے ہجوم اور ہنگامے سے گھبراتی تھی۔ ادھر لیلےٰ مصر تھی کہ اس بار وہ ضرور اس کے ہاں چل کر رہے۔ گیتا کہیں بھی جانا نہیں چاہتی تھی بلکہ جم کر اپنی پڑھائی کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ لیکن لیلےٰ کسی طرح نہیں مانتی تھی اور گیتا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے مخلصانہ اصرار، اتنی دوستانہ پیش کش کو کیسے ٹھکرائے۔ اسے خود بھی لیلےٰ سے محبت ہوگئی تھی مگر دونوں کی مالی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور ہر وقت لیلےٰ کے احسان اُٹھانا اس کی خوددار طبیعت پر بڑا گراں گزرتا تھا۔ مگر لیلےٰ اسے کھانے، پہننے، سیر تفریح، فلم اور پک نک پر لے جانے کیلئے اتنا اصرار کرتی بلکہ اس انداز سے حکم دیتی جیسے چاہنے والی ماں بچے کو۔ اسی طرح اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی تھی۔ گیتا عجب الجھن میں پھنس گئی تھی۔ یہ دوستی اس کے جی کا جنجال سا بنتی جا رہی تھی، جسے نہ تو چھوڑتے بنتی تھی نہ نباہتے۔ وہ گیتا جس نے صفیہ بیگم اور نرجس تک کا زیور کپڑا کبھی استعمال نہیں کیا اسے لیلےٰ کی قیمتی ساڑھیاں اور سنگار کی اشیا دھڑلے سے استعمال کرنی پڑتی تھیں۔ اگر وہ اس کی دھونس میں نہ آتی تو لیلےٰ گلے میں باہیں ڈال کر خوشامد کرنے اور منہ بسورنے لگتی اور گیتا کو ہار ماننی پڑتی۔ اگر گیتا کی کم سے کم اتنی حیثیت ہوتی کہ وہ بھی لیلےٰ کو کبھی کبھار پک نک پر یا فلم دکھانے لے جاسکتی کبھی کبھار تحفہ دے سکتی تو اسے اتنا گراں نہ گزرتا۔ لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ وظیفے کی رقم بورڈنگ اور فیس کے اخراجات کے لئے بھی کافی نہ تھی۔

اس کی کمی اور جیب خرچ وغیرہ کے لئے صفیہ اسے روپیہ بھیجتی تھیں. جب سے بمبئی آئی تھی دو سوتی ساڑھیوں کے سوا کوئی کپڑا نہ خرید سکی تھی۔ انویم سے اسے کوئی تکلف نہ ہوتا تھا۔ دونوں کی حیثیت ایک ہی سی تھی۔ بس کا کرایہ دونوں اپنا اپنا دیتے۔ فلم کا ٹکٹ کبھی گیتا لے لیتی کبھی انویم۔ چائے کھانے کے پیسے جس کے پاس ہوتے وہ ادا کر دیتا۔ دونوں ہی وظیفے سے پڑھ رہے تھے۔ ہاں انویم کچھ ترجمہ کر کے، اخبار میں مضمون لکھ کر یا ایک آدھ ٹیوشن سے اپنی خرچ کی کمی پوری کر لیتا تھا۔ اور گیتا کا سرمایہ لے دے کر صفیہ بیگم کی فیاضی تھی۔ اسی لئے وہ لیلےٰ سے بچنا چاہتی تھی۔ بھلا ان سوتی کپڑوں، معمولی چپلوں میں وہ کیسے اس کے گھر جائے گی؟ اس کے تو نوکروں کے بھی بڑے ٹھاٹ ہیں اور وہاں اگر وہ لیلےٰ کی چیزیں استعمال کرے گی تو لوگ اسے کس نظر سے دیکھیں گے؟ یہاں لیلےٰ کی دلداری کی خاطر وہ اس کا سامانِ آرائش لے لیتی یا کبھی کبھار اس کا کوئی زیور یا ساڑھی پہن لیتی ہے تو کوئی اس کی یہ وجہ تھوڑی ہے کہ وہ آرائش دستگاری کی شوقین اور زیور و اچھے لباس کی دلدادہ ہے۔ مگر دوست کا دل بھی تو نہیں توڑا جا سکتا۔ گیتا ایسے حیلے حوالوں سے اپنے کو مطمئن کر لیتی۔

انویم سے اس نے ذکر کیا کہ لیلےٰ اسے اپنے ساتھ لے جانے پر بے حد اصرار کر رہی ہے تو وہ چپ سا ہو گیا اور گیتا سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ انویم کو یہ پسند نہیں۔ "اُنھ، یہ تو ہے ہی قدامت پسند اور پرانے خیالات کا دلدادہ۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر جیسے خود ہی صفائی دیتے ہوئے بولی۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ ایک دو دن کے لئے چلی جاؤں، نہیں تو لیلےٰ ناراض ہو جائے گی۔ وہاں سے پھر ہرش چاچا کے ہاں آ جاؤں گی۔"

"تمہاری مرضی ـــ میں روکنے کا کیا حق رکھتا ہوں ـــ مگر برا نہ ماننا گیتا ـــ تمہاری دوست جس ماحول اور جس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس میں تم کسی طرح بھی کھپ نہ سکوگی۔" انوپم نے بڑے ضبط سے کام لیکر بس اتنا کہا۔

"میں کیا اس میں کھپنے رہنے بسنے جا رہی ہوں۔" چڑ کر گیتا نے جواب دیا۔ "انوپم صاحب آپ بھول رہے ہیں۔ میں ایسی کمزور طبیعت کی نہیں کہ دوسروں کا اثر قبول کروں ـــ میں لیلے پر اپنا اثر ڈال سکتی ہوں ـــ آپ دیکھتے نہیں وہ پہلے کے مقابلے میں اب کتنی سادہ رہنے لگی ہے۔ علمی اور ادبی چیزوں میں دلچسپی لیتی ہے ـــ یہ سب میرا ـــ اور بے شک آپکا بھی ـــ اثر ہی تو ہے۔"

"آپ کی مرضی" دوبارہ انوپم نے رکھائی سے وہی جملہ دہرایا، مگر دل ہی دل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ انسان کتنا اپنے کو دھوکا دیتا ہے۔ گیتا دوسروں کا اثر کتنا جلدی قبول کرتی ہے یہ بات اس سے چھپی نہ تھی۔ مگر وہ یہی سمجھتی ہے کہ وہ لیلے کی اصلاح کر رہی ہے۔ انوپم کی ناگواری گیتا سے چھپی نہ رہ سکی، مگر اب تو اور ضد آگئی تھی۔

"میں کل لیلے کے ہاں چلی جاؤں گی۔ ہرش چاچا سے کہہ دیجئے گا کہ پرسوں میں ان کے ہاں آؤں گی مگر بس ایک دن کے لئے۔ پھر مجھے بورڈنگ آکے پڑھنا ہے۔"

مگر اگلے دن جب گیتا نے لیلے کی شاندار امریکن کار کو آتے دیکھا اور اس کے وردی پوش ڈرائیور نے لیلے کو سلیوٹ مارکر اس کا قیمتی سوٹ کیس اٹھایا اور گیتا کے پلاسٹک کے پرانے اٹیچی کیس کو حیرت کی نظروں سے دیکھا تو گیتا کو پسینہ آگیا۔ جی چاہا کہ اپنا اٹیچی اٹھا کر واپس کمرے میں بھاگ جائے۔

جہاں نوکروں کے یہ ٹھاٹ ہیں وہاں گھر والوں کا کیا رنگ ہوگا، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اور لیلے موٹر میں بیٹھی اسے پکار رہی تھی۔ "کم آن گیتا ڈیر ـــ کم آن ـــ سوچ کیا رہی ہو آؤ۔"

گیتا اس قیدی کی طرح جسے قید کا حکم ہو چکا ہو پریشان سی جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ لیلے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ گیتا کی کمر میں ڈال کر اپنی طرف کھینچ لیا اور باتیں کرنے لگی۔

"گیتا ڈارلنگ تم نروس نہ ہو۔ میرے ہاں سب تمھیں میری طرح چاہیں گے۔ پاپا تو بڑے گڈو ہیں۔ بس گھر میں ان کا کام چیک کاٹتے رہنا ہے۔ ماما کے لئے، نکی کے لئے، میرے لئے ـــ اور باہر بس نرے بزنس مین۔ ذرا دیر میں دس بار فون آتا ہے۔ بزنس بزنس اوہ گاش ـــ بزنس مائی فٹ۔ آدمی کو مشین بنا دیتا ہے ـــ مائی ڈارلنگ پاپا۔"

گیتا کی بڑی بڑی آنکھیں کچھ اور پھیل گئی تھیں۔

"ماما بھی بڑی سویٹ گرل ہیں۔ ہنسو نہیں، وہ سچ مچ لڑکی لگتی ہیں۔ پاپا جتنے موٹے ہیں ماما اتنی پتلی ہیں۔ کتنی کیئر کرتی ہیں اپنی فگر کی ـــ ایک ایکسپرٹ روز رات کو دو گھنٹے ماما کو جوان اور حسین رہنے کے گر سکھاتی ہے۔ گیتا، بلیو می، پارٹیوں میں لوگ ان کو میری بہن سمجھ لیتے ہیں۔" زور کا قہقہہ لگا کر لیلے نے کہا اور اتنے ہی زور سے کار نے جھٹکا کھایا۔ شاید ڈرائیور کی توجہ لیلے کی باتوں کی طرف ہو گئی تھی کہ وہ سامنے کا گڈھا نہ دیکھ سکا۔

"یو ایڈیٹ" جھڑک کر لیلے نے اس سے کہا اور پھر گیتا سے باتوں میں مشغول ہو گئی۔

"ڈانس میں ماما کو مجھ سے زیادہ آفر ملتے ہیں۔ نوجوانوں کا جمگھٹ مجھ سے

زیادہ ان کے گرد رہتا ہے اور وہ ایسا فلرٹ کرتی ہیں ان چھوکروں سے...؟"
اب گیتا کی آنکھیں ہی نہیں منھ بھی حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس نے آج تک کسی کو اپنے ماں باپ کے لئے اس طرح کی باتیں کرتے نہ سُنا تھا۔

"اور میرا بھائی نکی ڈیر بڑا سویٹ بدھو ہے۔ اتنا لمبا چوڑا شاندار نوجوان ہے، پر بھیجہ میں عقل ـــ بہت کم ہے ـــ بس کار، ڈا اور ریس اور بلڈ یٹش ـ یہی اس کے شوق ہیں ـــ بڑا روپیہ خرچ کرتا ہے۔ پاپا خفا ہوتے ہیں پر ماما اسے بہت چاہتی ہیں۔ پاپا ذرا پیسہ دینے میں کنجوسی کریں تو ماما ان کی وہ خبر لیتی ہیں کہ نہ پوچھو ـــ" ہنستے ہنستے لیلیٰ دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

مگر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ یہ گیتا کی سمجھ میں نہ آیا ـــ "پاپا ڈارلنگ کتنا ڈرتے ہیں ماما سے! ماما کہتی اتنی دولت کس کے لئے۔ بیٹے کو نہیں دے گا تو انکم ٹیکس میں چلا جائے گا۔ تمھارے مرنے پر گورنمنٹ ڈیتھ ڈیوٹی کے بہانے چھین لے گا ـــ بچارے پاپا ـــ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ ماما مجھ سے جلتی ہیں ـــ سوچتی ہیں میں ان سے چھوٹی کیوں ہوں۔ ویسے وہ اپنی عمر میرے برابر ہی بتاتی ہیں اپنے دوستوں کو ـــ پاپا کہتے ہیں میں بھی خوب خرچ کروں۔ مگر تم جانتی ہو میں سیدھی سادی سادگی پسند لڑکی ٹھیری ـــ مجھے نہ ریس کا شوق ہے نہ کار ڈرائیو کا، نہ پہننے کا نہ کھیل تماشے کا ـــ بس میں لکھنے پڑھنے میں مگن رہتی ہوں ـــ پاپا کہتے ہیں ایسی سادھو لڑکی ان کے ہاں کیسے پیدا ہوگئی ـــ مائی ڈارلنگ سویٹ پاپا....."

گیتا اس "سیدھی سادی سادھو" لڑکی کے عجوبہ پر غور کر رہی تھی کہ کار مالابار ہل کے ایک شاندار بنگلے کے وسیع پھاٹک میں داخل ہوئی۔ وسیع ہموار لان پر سبز مخمل کا دھوکا ہو رہا تھا اور اس کے کنارے رنگ برنگے

پھولوں کے تختے عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سرخ بل کھاتی ہوئی سڑک کے دونوں طرف سنگِ مرمر کے سڈول و برہنہ اسٹیچو نصب تھے۔ چھوٹے چھوٹے سنگِ مرمر کے حوضوں میں نصب خوبصورت فواروں سے آبی موتی بکھر رہے تھے اور گھنے درختوں اور رنگین چھتریوں کے سائے میں سنگ مرمر کے بنچ بچھے ہوئے تھے۔ پیتل اور چینی کے گملوں میں حسین و نایاب پودے لہلہا رہے تھے۔ شام کے دھندلکے میں یہ باغیچہ کسی پرستان کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک عالیشان کوٹھی تھی جس میں سے بجلی کی روشنی رنگین پردوں میں سے چھن چھن کر ہر طرف پڑ رہی تھی۔ گیتا اتنی مسحور اور مرعوب تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب لیلےؔ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اتارا اور اندر کس کس سے اس کا تعارف کرایا۔

نشاط دِلا میں آئے گیتا کو چار دن ہو چکے تھے۔ اس نے اگلے ہی دن لیلےؔ سے جانے کے لئے کہا مگر وہ کسی طرح بھی راضی نہ ہوئی اور اکیلی گیتا کے لئے اس سنہرے جیل خانے سے نکل بھاگنا دشوار تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لئے نئی اور عجیب و غریب بھی تھی اور پریشان کن بھی۔ ڈرائنگ روم کی وسعت سجاوٹ، بھاری بھاری مخملیں پردوں کی سلوٹیں، اطلسی صوفوں کی لچک، آبنوسی میزوں کی دمک، سنگِ مرمر، پیتل، کانسے اور چاندی کے بتوں کی برہنگی، ایرانی قالینوں کی دبازت، نادر پودوں کی لہلہاہٹ، منقش چھتیں اور اس میں لٹکے بلوریں جھاڑ اور فانوسوں کی چمک دمک، مصوری کے اعلیٰ نمونوں کی کثرت۔ کمرہ کیا تھا اچھا خاصا عجائب خانہ لگتا تھا۔ ڈائننگ روم کی ٹرک بھڑک اسے اور بھی بوکھلا دیتی۔ ہر طرف سائڈ بورڈز میں لگے ہوئے آئینے اور ان کے

اندر سجے ہوئے شیشے، چینی اور چاندی کے بیش بہا برتن، نقرئی چمچوں کانٹوں کی جھنکار، سفید اور سنہری وردیوں میں ملبوس بیروں کی فوج ۔ منٹ منٹ پر بدلتی ہوئی پلیٹیں اور سامنے آتی ہوئی انواع و اقسام کے کھانوں کی ڈشیں اور پھر ان کے کھانے کے آداب۔ خدا کی پناہ ۔ ایک بچاری گیتا کی جانِ ناتواں اور اتنی بہت سی مصیبتیں!! کبھی مچھلی کے کانٹے چھری سے پلاؤ کھانے لگتی اور کبھی پڈنگ کے چمچے سے سوپ جو اکثر اس کا منہ جلا دیتا تھا۔ کبھی جلتا ہوا آلو زبان کو جھلس کر رکھ دیتا تھا اور کبھی مچھلی کا کانٹا حلق میں پھنس جاتا اور اس گھبراہٹ میں کہ اس سے ایٹی کیٹ کے خلاف کوئی بات نہ ہو جائے کبھی نیپکن گر جاتا اور کبھی چمچہ یا کانٹا ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو مہذب اور ٹرینڈ بیرے نہایت ادب سے اسے دوسرا چمچہ پکڑا دیتے۔ مگر گیتا پسینے پسینے ہو جاتی۔ اسے پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ وہ کیا کھا رہی ہے اور ایک وقت بھی اسے پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔

پاپا کی بے لطف گفتگو اور بے ہنگم جسم، نکی کی اتراہٹ اور بکواس لیلے کی ہر ہر کھانے پر نت نئی سجاوٹ اور ماما کا تصنع ہر چیز اس کے ذہن پر بار تھی۔ ماما کیا تھیں اچھی خاصی جاپانی گڑیا لگتی تھیں جیسے کسی ماہر صناع نے انسانی روپ دیدیا ہو، مگر پھر بھی ہو وہ گڑیا ہی۔ بالوں میں مصنوعی لہریں، پنسل کی بنی مصنوعی بھویں اور نقلی پلکیں، لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ، مصنوعی انداز گفتگو ـــ مصنوعی اظہار خصوصیت۔ جانے شام کی پارٹیوں اور ڈانس میں نوجوانوں کو اس گڑیا میں کیا کشش معلوم ہوتی تھی کہ وہ اس کے گرد جمع رہتے ہیں؟ گیتا یہ کیا جانتی تھی کہ یہ گڑیا لاکھوں کی مالک ہے۔ وہ ان نوجوانوں کو صرف پلاتی اور کھلاتی ہی

نہیں بلکہ ان کی اندر بھی بہت سی ضرورتیں پوری کرنے میں فیاضی دکھاتی ہے۔
ممی جب آتا پاپا کی اور اس کی جھڑپ ہوتی۔ گفتگو انگریزی میں ہوتی مگر اتنا تو گیتا سمجھ ہی جاتی تھی کہ جھگڑا روپے پر ہو رہا ہے اور آخر میں ماما کی ڈانٹ پر پاپا کو چیک کاٹنا ہی پڑتا۔ چوبیس پچیس کا یہ لمبا تڑنگا خوبصورت نوجوان جس کا بے عیب مغربی لباس اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ پہلی نظر میں مرعوب کر لیتے ہیں، ذہنی طور پر بالکل دیوالیہ ہے یہ اندازہ گیتا کو پہلی ملاقات ہی میں ہو گیا تھا۔ مگر ماں باپ، بہن اور وہ خود اپنے پر کافی نازاں معلوم ہوتا تھا۔
گیتا کا بڈ روم لیسلے کے بڈ روم سے ملا ہوا دوسری منزل پر تھا۔ اس کی لمبی رنگین "فرنچ ونڈو" سے سامنے لہریں مارتا ہوا بحرِ ہند بڑا شاندار معلوم ہوتا تھا۔ سویرے کے سمے پچاسیوں چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں مچھلیاں پکڑتی ہوئی بیچ سمندر میں تیرتی اتنی سُندر لگتیں کہ بڑی دیر تک گیتا ان کے نظارے میں محو رہتی۔ لیکن جب یہی کشتیاں قریب آتیں تو دھوپ میں چاندی کے پتروں کی طرح چمکتے بادبان میلے چیتھڑے بن جاتے اور ان میں بیٹھے نیم برہنہ انسان اپنی غربت و جہالت کا اشتہار...... اور گیتا اس کوٹھی کی شان و شوکت، دولت و ثروت کا ان فاقہ کش انسانوں کی حالت سے مقابلہ کرتی تو اسے اپنے پر غصہ آنے لگتا۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ اُسے آج ہی چلا جانا چاہیئے۔ ہریش چاچا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انوپم تو بہت ہی خفا ہوں گے ـــ آج وہ ضرور چلی جائے گی ـــ مگر وہ "آج" پھر بھی نہ آسکی۔
وہ اس وسیع شاندار کمرے میں ایک رات بھی چین سے نہ سو سکی تھی۔ اول تو دیو ہیکل آبنوسی فرنیچر جیسے اس کے اعصاب کو کچلے دیتا اور پھر اسپرنگ دار مسہری جیسے ساری رات اس پر اپنے سارے بوجھ کے ساتھ مسلط رہتی۔

یہی کیا۔ باتھ روم سے کیا وہ کم پریشان تھی؟ نہاتی تو ہر طرف لگے ہوئے قدِ آدم آئینے اسے پانی پانی کر دیتے۔ صابن ملتی تو ٹب میں پاؤں پھسل جاتا۔ کرسی نما پاٹ نے قبض کا مریض بنا دیا۔ اف یہ باتھ روم اور بڈ روم — یہ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ ہال، یہ ماما اور پاپا — یہ نکی اور دوسرے نمائشی نوجوان — سب اس کے ذہن کو کچلے دے رہے تھے۔ کہاں آکر پھنس گئی وہ؟

آدھی آدھی رات تک نیچے ناچ گانا اور پینا پلانا ہوتا رہتا۔ پاپا اپنے دوستوں کے ساتھ ننھے ننھے گلاسوں میں "شربتِ جانفزا" سے دل بہلاتے رہتے اور ماما ادھر نوجوانوں کے ساتھ ڈانس کرتیں اور ادھر ان کے ساتھ جا کر "شربت" کا گلاس چڑھا آتیں۔ نوجوان اس کے لئے اور زیادہ ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ عجیب عجیب نظروں سے لیلیٰ کو کو والا کے اس نئے پالتو جانور کو دیکھتے اور اس کے پیٹھ موڑتے ہی قہقہے لگانے لگتے۔ ان فیشن پرست، دولت مند (یا دولت مندوں کے پرستار) نوجوانوں کی گفتگو کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس سے گیتا کو دلچسپی یا واقفیت ہوتی۔ امریکن اور انگلش فلمیں اور ہالی ووڈ اسٹارز، جدید ترین فیشن اور لباسوں کے تذکرے، بالوں کے اسٹائل اور لپ اسٹک اور نیل پالش کے رنگ زیرِ بحث رہتے یا پھر کریکٹ کلب، ریس اور جوئے کی دلچسپیوں کے تذکرے یا اور زیادہ بے تکلف ہوئے تو اپنے بزرگوں اور دوستوں اور خود اپنے معاشقوں کی داستانیں مزے لے لیکر بیان کی جاتیں اور غیر موجود لڑکے لڑکیوں کا مذاق اڑایا جاتا۔ لیلیٰ بھی یہاں وہ لیلیٰ نہ رہی تھی جو کالج میں تھی۔ ان کے پاس بیٹھ کر گیتا بیک وقت احساسِ کمتری اور برتری کے مرض میں مبتلا ہو جاتی۔ کبھی شرم سے وہ پسینے پسینے ہونے لگتی اور کبھی غصے سے سرخ ہو جاتی۔ کبھی وہ محسوس کرتی کہ ان سب کے سامنے

وہ کتنی چھوٹی حقیر اور ناچیز ہے اور کبھی اندازہ لگاتی کہ وہ ان سب سے کتنی اونچی، کتنی برتر ہے۔ اسے انوپم کی بات یاد آئی۔ "گیتا تم اس ماحول میں کسی طرح بھی نہیں کھپ سکو گی۔" وہ ذرا سا بہانہ ملتے ہی "ایکسکیوز می" کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی اور یہاں نوجوانوں کو اپنا مذاق اڑانے اور لیلے کو ان سے بچنے اور گیتا کی خوبیاں گنانے کے لئے چھوڑ جاتی۔

لیلے گیتا کی گھبراہٹ اور پریشانی کو سمجھ رہی تھی اور جہاں تک ہو سکتا اس کی دلداری کرتی۔ جانتی تھی کہ ایک بار وہ ہاتھ سے نکل گئی تو پھر کبھی ہتھے نہ چڑھے گی۔ اس اونچی سوسائٹی کی چاٹ لگا کر ہی وہ گیتا کو انوپم کے جال سے نکال سکتی ہے۔ وہ گیتا کو کیا سے کیا بنا سکتی ہے ۔۔ اس احساس سے اس کا سر غرور سے اور اونچا ہو جاتا۔ اور وہ موقع ملتے ہی گیتا کے پاس جا کر اس کی چاپلوسی شروع کر دیتی۔

چوتھے دن، جب گیتا واپس بورڈنگ جانے پر بہت ضد کر رہی تھی، لیلے ایک نوجوان کو لئے ہوئے اس کے پاس آئی۔ "گیتا ان سے ملو۔ میرے عزیز دوست کھنہ ۔۔ اور یہ ہے میری گیتا۔" اس نے بے تکلفی کے انداز میں تعارف کی رسم ادا کی۔

گیتا نے نظریں اٹھائیں۔ ایک گندمی رنگ کا خوش شکل نوجوان، خوش مذاق انداز کے کپڑے پہنے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر گیتا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا ہی کافی سمجھا۔

"یہ بھی تمہاری طرح ہندوستانی ہیں۔" لیلے نے کہا۔

"اور تم کون ہو؟ خالص انگریز؟" مسکرا کر گیتا نے کہا تو کھنہ بھی مسکرا

پڑا اور لیلے ہنستی ہوئی دوسری طرف مڑ گئی۔ "کھنہ تم گیتا کا جی بہلاؤ۔ بمبئی کے نوجوانوں میں ان کا دل نہیں لگتا۔"

کھنہ نے تاش پر گیتا کی صحبت کو ترجیح دی۔ دونوں پہلے رسمی سی اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے رہے، مگر جلدی ہی کھنہ کو اندازہ ہو گیا کہ گیتا کو نہ انگریزی بولنے کی مشق ہے نہ مغربی ایٹی کیٹ سے زیادہ واقفیت۔ اس نے نہایت صاف شستہ اردو میں باتیں شروع کر دیں اور گیتا کو ایسا لگا جیسے اس کے کانوں میں کوئی رس ٹپکا رہا ہو۔ یہاں کے غیر مانوس محاورے اور بمبئی زبان سنتے سنتے وہ پریشان ہو گئی تھی۔

ایک دن میں دونوں خاصے بے تکلف ہو گئے۔ اور اب جو لیلے نے اصرار کیا کہ گیتا پرسوں اس کے ساتھ ہی واپس بورڈنگ چلے تو تھوڑے سے انکار کے بعد گیتا راضی ہو گئی۔ "پڑھنا ڈھنا تو اب ہو چکا — اور ہریش چاچا کے ہاں جانے کا وقت بھی نہیں رہا۔ پھر کیا فائدہ لیلے کو ناراض کرنے سے؟"

آج نشاط دلا میں اس کا آخری دن تھا۔ کل صبح وہ اور لیلے واپس بورڈنگ چلی جائیں گی۔ آج کھانے پر بہت سے مہمان جمع تھے — ماما کئی سو کی بنارسی ساڑھی اور سلیولیس جالی کے چولی بلاؤز اور ہیرے کے زیورات میں ملبی آبنوسی میز کے سرے پر بیٹھی جگمگا رہی تھیں۔ ان کے داہنے اور بائیں بمبئی کے دو بہت بڑے سیٹھ بیٹھے تھے اور وہ بیک وقت دونوں سے فلرٹیشن کر رہی تھیں۔ وسط میں لیلے کے ایک طرف ایک منسٹر اور دوسری طرف کھنہ تھے اور کھنہ کے برابر گیتا اور گیتا کے دوسرے ہاتھ پر ایک مشہور لیڈر۔ لیلے پورے وقت منسٹر صاحب سے مصروفِ گفتگو رہی اور

لیڈر صاحب کے داہنے ہاتھ جو سیٹ خالی بیٹھی تھیں وہ ان سے اظہار خصوصیت فرماتے رہے۔ اس لئے کھنہ اور گیتا دونوں کو باتیں کرنے اور ایک دوسرے کی مدارات کرنے کا کافی موقع ملا اور شاید پہلی بار اتنے دن میں گیتا نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور لطف بھی اٹھایا۔ ڈنر کے بعد پاپا اور ان کے دوست پینے پلانے میں اور ماما نوجوانوں کے ساتھ برج میں جٹ گئیں۔ نکی، لیلیٰ اور اس کے کچھ دوست دوسرے کمرے میں ڈانس کر رہے تھے۔ گیتا کہاں جائے؟ احساسِ کمتری کا دورہ پھر پڑا اور ساتھ ہی دل کے اندر سے کسی نے ٹھوکے دینے شروع کر دئے۔ "یہ لوگ تیرے ذوق کے نہیں۔ تیرا یہ مقام نہیں۔ ان میں اور تجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے — اب جا کر پھر یہاں نہ آئیو — انٰیم نے ......"

کھنہ تاش، ڈانس اور شراب سب سے بچ کر ادھر آگیا "گیتا صاحبہ یہاں تو بڑی گرمی ہے۔ چلئے باغیچے میں بیٹھیں —" گیتا یہاں کی گھٹی ہوئی بدبودار فضا سے پہلے ہی اُلجھ رہی تھی۔ فوراً کھڑی ہوگئی۔ اسے ذرا بھی یہ احساس نہ ہوا اس مستعدی اور خوشی سے اس کا کھنہ کی یہ درخواست قبول کر لینا، کھنہ کو کس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہے۔

باغ میں سنگ مرمر کے فوارے کے کنارے پڑے بنچ پر دونوں جا کر بیٹھ گئے۔ بجلی کی رنگین روشنی میں فوارے سے برستے موتی جواہرات کی طرح جگمگا رہے تھے۔ سامنے سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا اسٹیچو نصب تھا جس میں حسین کیوپڈ ہاتھ میں تیر کمان اور ہونٹوں پر شریر مسکان لئے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ تاڑ کے چوڑے پتوں میں سے سولہویں شب کا زرد چاند جھانک رہا تھا۔ اور سمندر کی لہروں کا زیر و بم ہوا

میں بکھرا ہوا تھا۔

"گیتا — آپ کو بمبئی پسند نہیں — مگر دیکھئے — کتنا حسین منظر ہے یہ — ہاؤ لولی —" پہلی بار کھنہ نے گیتا کہہ کر اس سے بات کی۔

"ہاں یہ منظر تو واقعی بہت پیارا ہے۔" گیتا نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"آپ اور لیلے ایک ساتھ رہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"بہت دوستی ہے آپ دونوں میں۔ آپ دونوں فائنل ایر میں ہیں نا؟"

"نہیں میں تو پہلے سال میں ہوں۔ اسی سال بمبئی آئی ہوں۔"

"اچھا۔ آپ کا وطن — دلی ہے؟"

"جی نہیں، میں سکندر پور کی رہنے والی ہوں۔ دلی سے کچھ دور —"

"آئی سی . . . ."

"اور آپ بمبئی میں کب سے ہیں؟"

"سال بھر سے۔"

"کیا یہ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟" اور ساتھ ہی گیتا کو خیال آیا کہ نئی تہذیب میں ذاتی باتیں کہنا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔

"میں یہاں ٹاٹا کینسر ہاسپٹل میں ریڈیالوجسٹ ہوں۔"

"اوہ، یس — آئی سی —" گیتا سوچ رہی تھی کہ یہ ریڈیالوجسٹ کیا ہوتا ہے؟ وہ اب ان ہی لوگوں کی طرح انگریزی جملے استعمال کرتی ہے اس کا اسے احساس تک نہ تھا۔

"اب آپ سے کب ملاقات ہوگی؟" اشتیاق سے کھنہ نے پوچھا۔

"کب؟ جی؟ کہہ نہیں سکتی۔" گیتا کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

" آپ یہاں تو آتی رہیں گی نا مس کو کو والا کے ساتھ....." کھنّہ نے سوال سے زیادہ درخواست کے انداز میں کہا۔

" جی — شاید — مگر مجھے بہت پڑھنا ہے...." تذبذب کے لہجے میں کہا۔

" مگر...." کھنّہ نے بات شروع ہی کی تھی کہ برامدے سے لیلے نے پکارا۔" گیتا — کھنّہ — تم دونوں کہاں چھپ گئے — آؤ اندر آؤ — بڑے مزے کا گانا ہو رہا ہے۔"

گیتا جلدی سے کھڑی ہو گئی اور کھنّہ کو بھی اس کے ساتھ بادلِ ناخواستہ اندر جانا پڑا۔

۶

نشاط دلا سے واپس آکر گیتا پر کئی دن ایک خمار کی سی کیفیت طاری رہی جیسے بدن ٹوٹ سا رہا ہو۔ ایک طرف وہ مطمئن اور مسرور تھی کہ اس دم گھوٹنے والے ماحول سے چھٹکارا ملا، مگر رہ رہ کر کھنّہ کی دلچسپ صحبت اور پُر مذاق باتیں اور پھر نشاط دلا کی دلچسپیاں بھی دل میں چٹکیاں لیتی رہتیں۔

اس نے طے تو یہ کیا تھا کہ اب وہ لیلے کے ہاں نہ جائے گی مگر لیلے کے اصرار پر اسے دوبارہ سہ بارہ بھی جانا پڑا اور پھر تو گویا عادت پڑ گئی۔ ہفتے کی شام کا اُسے بھی لیلے کی طرح انتظار رہنے لگا تھا۔ اور جب وہ لیلے کے ہمراہ وہاں پہنچتی تو گیتا کو محسوس ہوتا جیسے بنگلہ آغوش کھولے اس کا انتظار کر رہا ہے۔

لیلےٰ کی خصوصیت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی عنایتوں کے بوجھ سے جیسے گیتا دب سی گئی تھی۔ لیکن اب وہ کتنی لیلےٰ کے رنگ میں رنگ گئی ہے اسے اس کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا۔ اب وہ گیتا کے کپڑے، زیور، روپیہ ہر چیز استعمال کرتی اور اس کی خودداری کو ذرا سی ٹھیس نہ لگتی۔ وہ اور لیلےٰ بہنوں کی طرح ہیں اور بہنوں میں کوئی مغائرت یا تکلف نہیں ہوتا۔ اس کا دھوکے باز دل یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا کہ اگر دو سگی بہنوں کی مالی حالت میں بھی اتنا تفاوت ہو تو خوددار بہن اپنی امیر بہن کا احسان اٹھانا گوارا نہ کرے گی۔

وہ اب کتنے فلم دیکھنے لگی ہے، کتنی بار تھیٹر گئی ہے۔ جوہو اور چوپاٹی اور ہینگنگ گارڈن کی کتنی سیر ہوتی ہے اور ان سب کا اس کی تعلیم پر کیا اثر پڑ رہا ہے اس کے سوچنے کی گیتا کو فرصت کہاں تھی؟ اسے بننے سنورنے اور نئے نئے فیشن کرنے کا شوق کتنا بڑھ گیا ہے اس کا احساس بھی شاید نہ تھا۔ ہر لڑکی کو حق ہے کہ اپنے کو اسمارٹ اور دلکش بنائے۔ اس میں سوا قدامت پسندوں کے اور کسی کو کبھی برائی نظر نہیں آتی۔

لیکن ایک بات کا ہلکا سا احساس ضرور تھا کہ وہ لیلےٰ سے کچھ دبی دبی سی رہنے لگی ہے۔ پہلے ان کی دوستی میں برابری تھی۔ لیلےٰ کی دولت ثروت، شان و شوکت کسی نے گیتا کو احساس کمتری میں مبتلا نہ کیا تھا۔ وہ بلا تکلف بحث مباحثہ کرتیں، لڑتی جھگڑتیں، گیتا بے جا بات پر لیلےٰ کو ڈانٹ بھی سکتی تھی، روٹھ بھی جاتی تھی مگر اب وہ بات نہ رہی تھی۔ یوں دونوں میں بے تکلفی اور خلوص کچھ ضرورت سے زیادہ ہی نظر آتا۔ کالج میں زیادہ تر ساتھ ساتھ رہتیں۔ شام کو ساتھ سیر کو جاتیں چھٹیاں ساتھ گزارتیں۔ مگر گیتا کو لیلےٰ کی نظریں اور مرضی کا رخ دیکھنا پڑتا تھا۔

ابتدا میں کئی بار انوپم نے گیتا کو ہریش چندر کے ہاں چلنے کیلئے کہا ایک دو بار فلم دیکھنے کے لئے مدعو کیا۔ مگر گیتا نے کسی نہ کسی بہانے انکار کر دیا۔ اور پھر جیسے انوپم کی نظروں سے بچنے لگی ــــ اور انوپم حیرت و صدمے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس انقلاب کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

نشاط وِلا کا ماحول اب گیتا کے لئے اجنبی نہ تھا۔ اپنا کمرہ، "اپنا باتھ روم" اسے بہت پسند تھا۔ اسپرنگ دار مسہری پر لیٹتی تو ایسا لگتا کہ کسی محبوب کے بازوؤں میں جھولا جھول رہی ہو۔ گرم پانی کے ٹب میں لیٹ کر اخبار پڑھتے وقت وہ اپنے کو کوئی اپٹوڈیٹ شہزادی یا ہالی وڈ کی حسینہ تصور کر کے خود ہی مسکرا پڑتی۔ سجتے وقت قدِ آدم آئینوں میں ہر زاوئے سے اپنا عکس دیکھ کر اپنے حُسن و جوانی پر اس کی آنکھیں غرور سے شرابی ہو جاتیں! جو ادا اُس کی ہے لیلےٰ کی کسی ایک دوست کو بھی نصیب نہیں۔ خود لیلےٰ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی! اس کا آئینہ یہ بات بار بار اُسے جتاتا تھا، اور جب وہ مصنوعی سامانِ آرائش سے اس شراب کو دو آتشہ بنا کر باہر آتی تو لیلےٰ اور پاپا اور ممی اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیتے۔ لیلےٰ یہ سوچ کر من ہی من میں خوش ہوتی کہ اس کی گڑیا اب کتنی بدل گئی ہے۔ گیتا ایک کھلونا ہے جس سے لیلےٰ کھیل رہی ہے۔ اگر کوئی یہ بات گیتا سے کہتا تو وہ اس کا منھ نوچ لیتی مگر اس کے سوا یہ بات سبھی سمجھ رہے تھے اور کالج میں بھی اور لیلےٰ کے گھر پر بھی لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ بات گیتا غریب نہیں جانتی تھی۔ وہ اب رمی اور برج کھیل لیتی تھی۔ "شربت جانفزا" سے اب بھی اسے پرہیز تھا۔ مگر دوسروں کو پیتے دیکھ کر اُبکائی نہیں آتی تھی۔ ڈانس کرنے کی ہمت تو نہیں پڑی تھی مگر اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے وہ اس کی

مشق کرتی ہے یہ بات لیلے کو بھی معلوم نہ تھی۔ برہنہ اسٹیچو اور مصوری کے شاہکار دیکھ کر اب اس کا منہ شرم سے لال نہیں ہوتا۔ آرٹ کا ذوق کلچر کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ ماما بچاری کو خواہ اس تے مصنوعی گڑیا سمجھ لیا تھا۔ ایک رئیس، مہذب، فیشن ایبل اپٹوڈیٹ لیڈی کی یہی شان ہونی چاہیئے۔ پاپا بھی نرے بزنس مین نہیں۔ بڑے خوش اخلاق اور خوش مزاج بڈھے ہیں جو اس پر خاص طور پر مہربان ہیں۔ نکی بھی ایسا بدھو کہاں ہے، آجاتا ہے تو ساری محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ لیلے کے دوستوں نے اب اسے اپنے حلقے میں داخل کر لیا تھا اور وہ بھی گیتا کو اتنے بور نہ لگتے تھے۔ وہ بھی اب گیتا کے مداح بن گئے تھے۔ وہ بولتی کم تھی سنتی زیادہ تھی، اپنی ناواقفیت اور جھینپ کو چھپانے کے لئے وہ زیادہ تر دوسروں کی باتیں سنتی جس میں انہاک اور شوق کا اندازہ ہوتا تھا اور اس سے بولنے والے کی انانیت اور خود پسندی کو بڑی غذا ملتی۔ انجانے میں گیتا نے نفسیات کے اس گُر سے بہتوں کو شہید کر لیا تھا کہ لوگوں کو سننے سے زیادہ سنانے کا شوق ہوتا ہے۔ ہاں جن باتوں میں وہ ان لوگوں سے زیادہ واقف تھی ان میں حصہ لیتی اور اس وقت اس کی علمی واقفیت اور ادبی ذوق کا ان سطحی نوجوانوں کو قائل ہونا پڑتا۔ باقی وقت گیتا بیٹھی مسکراتی رہتی اور لوگوں یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ ناواقفیت کی مسکراہٹ ہے یا آگہی کی۔

ہاں جب وہ اور رکھنہ اکیلے ہوتے تو یہ نقاب ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں بے تکلفی سے باتیں کرتے اور ایک دوسرے کی باتوں میں یکساں دلچسپی لیتے تھے۔ گیتا جب نشاط دلا جاتی تو شام کو وہاں کھنہ ضرور آتا اور وہ لیلے کے لئے نہیں، اس کے لئے آتا ہے ــــ یہ گیتا کا دل جان گیا تھا۔ وہ دعوت،

پارٹی، برج، فلم، پک نک ہر جگہ گیتا کا قرب تلاش کر لیتا اور لیلے جانتے بوجھتے انجان بن جاتی۔ ذرا مچھلی اچھی طرح دام میں آجائے۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے لا سے کو کھینچ لے گی۔

کھنہ گیت کا مداح ہے یہ گیتا جانتی تھی مگر وہ کچھ اس انداز سے اس کی تعریف کرتا کہ گیتا کو بُرا نہ لگتا بلکہ ایک بوتل کا نشہ اس پر چڑھ جاتا۔ وہ اسے اپنے حسنِ جوانی کی نہیں حسنِ ذوق اور حسنِ سیرت کی تعریف معلوم ہوتی۔ کوئی اور نوجوان اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتا تو گیتا کی تیوری بدل جاتی مگر کھنہ کی تعریف پر وہ بھلا کیسے بُرا مانتی؟

"اوہ گیتا!! میں سمجھا کوئی نازک سی کشتی سبک رفتاری سے سطحِ آب پر تیر رہی ہے!"

"کتنا اچھا ذوق ہے آپ کا۔ اس ساڑھی اور بلاوز کی میچنگ غضب کی ہے۔ اور اس پر یہ نازک نازک سا سنگار ___ اس زمانے میں بھی ایسی خوش ذوق لڑکیاں ہوتی ہیں؟" اور گیتا اپنے حسنِ ذوق کی اس تعریف پر کھِل اُٹھتی۔

"جوڑے کا یہ اسٹائل لگتا ہے جیسے آپ ہی کے لئے ایجاد ہوا ہے۔"

"گیتا آپ جو سُرمہ لگاتی ہیں اس میں موتی کٹواتی ہیں کیا؟"

ان جملوں پر گیتا کی آنکھیں ضرور جھک جاتیں لیکن ہونٹوں پر جو انجانی سی شرمیلی مسکراہٹ آجاتی ہے وہ کھنہ کی کتنی ہمت افزائی کرتی ہے۔ یہ ناتجربہ کار الھڑ گیتا کیسے سمجھتی؟ اسے یہ خیال نہیں آتا کہ کھنہ اس کا اتنا پرستار ہوتے ہوئے بھی کبھی اس کی ذہنی صلاحیت، کی تعریف کیوں نہیں کرتا؟ ہمیشہ اس کے حسنِ ادا کا بکھان ہی کیوں کرتا ہے؟ یہ سب سوچنے کا اس

کے پاس وقت ہی کہاں تھا؟

اور وقت یونہی دھیرے دھیرے بیتتا رہا۔

۷

حبیب میاں کی صحت کچھ عرصے سے خراب تھی مگر انھیں اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ ڈاکٹر کہتے آرام کریں، سادہ کھانا کھائیں اور زندگی میں باقاعدگی پیدا کریں۔ یہاں تینوں باتیں ناممکن۔ اچھے اور مرغن کھانے کا شوق، کام کا جنون اور بے قاعدگی زندگی کا اصول۔ صفیہ پرہیزی اور سادہ کھانا پکواتیں مگر آئے دن کی دعوتوں کا کیا علاج تھا؟ کام کا بار ہلکا کرنے کیلئے انھوں نے خود ان کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا مگر نتیجہ اُلٹا نکلا۔ حبیب میاں ان کی دلچسپی دیکھ کر عورتوں اور بچوں کا کام اور زیادہ پھیلانے لگے۔ کام کم کیا ہوتا اُلٹا دوگنا ہو گیا اور صفیہ بیگم خود اتنی مصروف رہنے لگیں کہ گھر کے کاموں کے لئے بھی وقت مشکل سے نکلتا۔ حبیب میاں جیسا خود ان تھک کام کرتے اسی طرح دوسروں سے لیتے تھے۔ صفیہ کو خود اپنے کام سے بہت لگاؤ اور دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مگر اس خیال سے اُلجھتی تھیں کہ وہ بجائے کام ہلکا کرنے کے اُلٹا کام کا بوجھ بڑھانے کا سبب بن گئی ہیں۔ ایک صبح آٹھ بجے سے رات گئے تک حبیب میاں کاموں میں پھنسے رہے۔ صفیہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیسے ان کا دوا علاج پابندی سے کرائیں۔

اس وقت وہ دن بھر کی تھکی ہاری صحن میں کیاریوں کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت لوگوں کا مجمع ان کے گرد نہ

تھا، ذرا سا وقت سکون : آرام کے لئے مل گیا تھا ورنہ اپنی اور میاں کی ہر دلعزیزی ان کے لئے وبال جان بنتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ الجھ کر کہتیں ع

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی

اور پھر خود ہی اپنی بات پر ہنس پڑتیں۔

خالدہ اوپر سے بنائی کی تھیلی ہاتھ میں لئے اُتری کہ چچی جان سے نمونہ پوچھ کر ڈالے، لیکن ان کو یوں لیٹا دیکھ کے ٹھٹک گئی۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھیں۔ ایک پیر کیاری تک پھیلا ہوا تھا اور ان کے ہاتھی دانت کے سے پیر پر چنبیلی کی ایک شاخ جھک آئی تھی اور بڑا سا کھلا ہوا پھول ان کے انگوٹھے کو بوسہ دے رہا تھا۔ سر پر سایہ فگن امرود کے پیڑ کا ایک زرد پتہ ان کی گود میں آگرا تھا ____ اور وہ خود ایک سنگِ مرمر کی مورتی لگ رہی تھیں ____ خالدہ کھڑی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

ندیم نے پہلے دروازے پر انا بوا کو پکارا ____ کوئی جواب نہ پا کر آہستہ سے اندر داخل ہوا۔ صفیہ بیگم کی کرسی کی پشت اس طرف تھی اور خالدہ کا چہرہ پہلی نظر میں وہ پہچان نہ سکا کہ یہ دبلی پتلی زرد رو لڑکی کون کھڑی ہے۔ دو قدم اور آگے بڑھا، خالدہ نے آہٹ پا کر نظر اٹھائی......

سامنے اس کی زندگی ____ اس کی دُنیا ____ مجسم کھڑی تھی! دونوں کی نگاہیں ملیں اور ذرا دیر کے لئے بندھ کر رہ گئیں۔

خالدہ بے خودی کے عالم میں اپنے روٹھے پریتم کے دیدار سے روح کو سیراب کر رہی تھی۔ وہی متبسم چہرہ، وہی شریر آنکھیں، وہی البیلے پن سے الٹے ہوئے بال اور ان میں چمکتے ہوئے چند سفید تار اور ہونٹوں کے کونوں پر وہی دبی دبی سی مسکراہٹ...... ہاں ماتھے پر ایک شکن بھی اُبھر آئی تھی

جو اس سے پہلے خالدہ نے نہ دیکھی تھی۔

اور ندیم حیرت سے اس تصویر بے خودی کو دیکھ رہا تھا۔ شربتی آنکھوں میں حیرت و مسرت کی لہریں رقصاں، چھوٹی سی ستواں ناک کے پھڑکتے ہوئے نتھنے.... ایک دوسرے سے ذرا سے جدا گلابی ہونٹوں میں سے چمکتی ہوئی موتیوں کی قطار.... بھورے گھونگھریالے بالوں کی لٹیں جو پیشانی پر بکھر گئی تھیں.... اور پتلی لمبی گردن میں موتیوں کے ہار کے متصل ایک نیلی رگ ابھر آئی تھی۔ ایک ہاتھ سینے پر رکھا تھا جیسے اندر سے پھڑکتے جذبات کو سہارا دے رہا ہو، اور دوسرا جس سے تھیلی گر گئی تھی سامنے کی طرف ویسے ہی اٹھا ہوا تھا۔ پریم و پوجا کی ایک مجسم دیوی سامنے کھڑی تھی جس کے چہرے پر محبت کے نقوش اور وفا کا نور کرنوں کی طرح ہالہ کئے ہوئے تھا۔

اس کا یہ روپ آج تک ندیم کی نظروں سے کیسے چھپا رہا؟ یہ وہ کملا بیگم کی چھوٹی سی گھٹیا سی سڑیل کھی کھی کرتی ہوئی لڑکی نہ تھی جس کی طرف کبھی غور سے دیکھنے کی زحمت ہی ندیم نے گوارا نہ کی تھی۔ یہ تو حسن و دلکشی کا کوئی اور ہی مجسمہ ہے..... ندیم کیا سمجھ سکتا تھا کہ پریم کی دھیمی آنچ نے خالدہ کی سندرتا کو کندن کی طرح تپا کر اسے ایک ملکوتی شان بخش دی ہے۔

اور پھر جیسے خالدہ کو ہوش آ گیا۔ پلکیں جھکیں، رخساروں پر سرخی ابھری، ہونٹ سختی سے بند ہو گئے، دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں گتھ گئے۔ محبت و اشتیاق کے رنگوں پر خودداری اور حیا کے رنگ غالب آ گئے۔

وہ بغیر ایک لفظ کہے، ایک اور نظر ڈالے، دھیرے سے گھومی اور واپس چلی گئی۔ ندیم کھسیایا ہوا کھڑا رہ گیا۔ کہاں وہ بے تابی! کہاں یہ بے اعتنائی!! عورت کو سمجھنا سچ مچ بڑا دشوار ہے۔

جانے وہ کب تک اس حال میں کھڑا خالدہ کے انداز حیرت و مسرت میں کھویا رہتا کہ صفیہ بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "ارے کون ندیم — تم کب آئے؟ وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ صفیہ نے شکایت کی "کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لاکھ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ آخر ہو کہاں مگر کھوج ہی نہ ملا۔ ایسی بھی کیا بے مروتی؟"

"کیا بتاؤں آپا" کچھ شرمندگی کے ساتھ ندیم نے کہا۔ "اپنی ساری امیدوں کو خاک میں ملتا دیکھ کر میں ایسا مایوس اور بددل ہوا کہ پھر کسی سے ملنے کو جی ہی نہ چاہا۔"

"تمھارا سا سمجھدار لڑکا اتنی سی بات پر بددل اور مایوس ہو جائے! وظیفہ نہ ملا نہ سہی۔ اپنے ملک میں کیا اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں۔ وہ دورِ غلامی گیا جب صرف ولایت پلٹ ہی کو قابل سمجھا جاتا تھا" صفیہ نے سمجھانا چاہا۔

"آپا آپ نہیں جانتیں۔ صرف یہی بات نہ تھی، میں زندگی کی ایک اور بازی بھی ہار گیا ہوں۔" ندیم نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہاں بھی تم غلط چال چل گئے تھے۔ یا یوں کہوں کہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تم نے سمجھا کہ گیتا تمھیں چاہنے لگی ہے۔ جواب میں تم بھلا کیوں نہ اسے چاہتے۔ بیچارے مرد کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ جو لڑکی اسے اچھی لگے سمجھتا ہے کہ وہ ضرور اس سے محبت بھی کرتی ہے۔ اور اس خیالی محبت کا تصوّر اس کی انانیت کو بڑی تقویت دیتا ہے اور پھر وہ "اس کی خاطر" اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جو سچی محبت ہوتی ہے اس کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ نظر بچا لیتا ہے۔" بیچاری صفیہ کو لاگ لپیٹ کے ساتھ بات کرنی نہیں آتی تھی۔

"نہیں آپا یہ آپ کی نا انصافی ہے۔ مرد صرف محبت سے محبت کرتا ہے۔"
"جی نہیں۔ مرد — میرا مطلب ہے اکثر مرد — صرف حسن کا پرستار ہوتا ہے — ہو سکتا ہے بعد میں وہ حسنِ سیرت سے بھی متاثر ہو جائے۔ تم بھی پہلے گیتا کی صورت کے مداح ہوئے پھر اس کی شخصیت سے مرعوب۔ سمجھا وہ تم پر عاشق بھی ہے۔ اب تم بھلا کیسے عاشق نہ ہوتے۔ کیوں بھئی نہ یہی بات؟"
"نہیں آپا — آپ غلط تجزیہ کر رہی ہیں۔ میں سچ مچ گیتا کو چاہتا تھا مگر اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ دھوکہ دیا۔"
"نہیں ندیم۔ گیتا نے تمھیں ہرگز دھوکا نہیں دیا بلکہ اس دھوکے کے جال سے آزاد کرایا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے پریم کرتے ہو۔ وہ اتھاہ، اٹل پریم جس کو عشق کا مقدس نام دیا جا سکے....."
"میں تو کرتا تھا" ندیم نے زور دیکر کہا۔
صفیہ ہنس پڑیں "کرتا تھا — یہ 'تھا' ہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ اُنس تھا، دلچسپی تھی، لگاؤ تھا، عشق نہ تھا۔ سچا عاشق یہ کبھی سوچ ہی نہیں سکتا کہ وہ عشق کرتا تھا۔ عشق تو میاں جاوداں ہوتا ہے۔ جدائی ہو یا وصل۔ فراق ہو یا قربت، وہ ہمیشہ موجود، باقی — قائم رہنے والا جذبہ ہے۔"
اس اچانک حملے سے گھبرا کر ندیم نے مدافعت کی۔ "آپ لفظی گرفت کر رہی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے...."
"میں کوئی گرفت نہیں کر رہی بھیا۔ میں تو یہ بتا رہی ہوں کہ جس جذبے کو تم نے عشق سمجھا تھا وہ نوجوانی کی ہنگامی کیفیت تھی اور اس میں ناکام ہو کر تمھیں اپنی زندگی تباہ نہیں کرنی چاہیے۔ تمھارے سامنے دنیا پڑی ہے۔

خدمت اور ترقی کا وسیع میدان ہے — کچھ کرنے کے، بننے کے موقع ہیں۔ ہمیں تو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں ندیم۔"

ندیم کو بدگمانی تھی کہ گیتا کو صفیہ بیگم نے بہکایا تھا مگر اس وقت جس انداز سے وہ باتیں کر رہی تھیں اس میں ندیم کو خلوص اور اپنایت کا رنگ نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"مگر تم اتنے دن رہے کہاں ؟"

"کچھ دن ابّا کے پاس رہا۔ پھر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ وہاں بھی جی نہ لگا۔ اس کے بعد جگہ جگہ پھرتا رہا - بہار، بنگال، ساؤتھ بھی گیا اب کشمیر سے آ رہا ہوں —"

"تو خوب سیریں کیں۔ مگر — مگر کیا کرنے گئے تھے ؟"

"اصل مقصد تو سیر کرنا اور ہندوستان دیکھنا تھا۔ ویسے کچھ اور کام بھی تھا۔" ذرا رازداری کے انداز میں ندیم نے جواب دیا۔

"اچھا اب سمجھی، پارٹی سیوا ہو رہی ہوگی۔" ہنس کر صفیہ نے کہا۔

"آپ جانتی ہیں میں کسی پارٹی کا ممبر نہیں۔"

"ہاں مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری ہمدردی کس پارٹی سے ہے۔ اور کس کے لئے کام کرتے ہو . . . . ."

"اس کے لئے کام کرنا تو ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے۔" گرم ہو کر ندیم نے کہا۔ "ہمارے دیس میں بھوک ہے، افلاس ہے، عدم مساوات ہے، سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ ان سب کو ختم کر کے ایک متوازن عوامی حکومت کے قیام کی کوشش ہر محبِ وطن کا پہلا فرض ہے۔"

صفیہ نے ہنس کر کہا۔ "اوہو اب آئے تم اپنے اصلی روپ میں۔ میں سوچ ہی

رہی تھی کہ اتنی دیر سے تمہیں جوش کیوں نہیں آیا لیڈر صاحب "۔ ندیم بھی کھسیانی ہنسی ہنس پڑا۔

" مجھے ایک اخبار نے حالات دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ خیر چھوڑیئے ان چیزوں سے آپ کو کیا دلچسپی۔ یہ بتائیے حبیب میاں کہاں ہیں کیسے ہیں؟"

" ہوتے کہاں کام میں مصروف ہوں گے۔ اور صحت کا حال کیا بتاؤں کئی مہینے سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ کھانا ہضم نہیں ہوتا، خون بن نہیں رہا جسم میں۔ طبیعت گری گری رہتی ہے مگر وہاں پرواہی نہیں "۔

" مگر آپا آپ کو تو غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کا باقاعدہ علاج کسی اچھے ڈاکٹر کا ہونا چاہیئے "۔

" آپا کیا اپنا سر پھوڑلے "۔ رنج و غصے کے ساتھ صفیہ بیگم بولیں۔" ان پر تو کسی کی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ بچارے ڈاکٹر رمضان کہتے کہتے تھک گئے کہ بمبئی جا کر کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھا کر تشخیص کرالو۔ مگر انہیں دنیا جہان کے کاموں کی فرصت ہے اس کے لئے نہیں "۔

ندیم نے صفیہ بیگم کو زیادہ پریشان دیکھا تو موضوع بدلنا چاہا۔" آپا کیا صدیق چچا آئے ہوئے ہیں؟"

" نہیں تو "۔

" میں جب اندر داخل ہوا تو میں نے ایک لڑکی کی جھلک دیکھی تھی مجھے خیال ہوا کہ شاید خالدہ ہے "۔

کب سے ندیم پوچھنا چاہ رہا تھا کہ خالدہ یہاں کیسے؟ مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر بات کو گھما کر کسی نہ کسی طرح پوچھ ہی لیا۔

" خالدہ تو دو مہینے سے میرے پاس ہے۔ بہت سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اب

خدا خدا کر کے ذرا طبیعت سنبھلی ہے۔"

ندیم نے گھبرا کر کہا۔ "کیا بیمار تھی؟"

"پہلے تو ڈاکٹروں کو شبہ تھا کہ خدانخواستہ ٹی بی ہے۔ مگر خیر شکر ہے خدا کا کہ سب معائنوں وغیرہ کے بعد یہ تشخیص غلط ثابت ہوئی۔۔۔۔"

"شکر ہے۔" بے اختیار ندیم کے منھ سے نکلا۔

"تم بھی شکر ادا کرتے ہو؟ کس کا؟" مسکرا کر صفیہ نے نقرہ کیا۔

"ایسے ہی عادتاً منھ سے نکل جاتا ہے۔ تو خالدہ کو کیا بیماری تشخیص ہوئی؟"

"بیماری تو کوئی بھی نہیں بس اندر ہی اندر کوئی غم اسے گھلائے دے رہا ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے صفیہ نے جن نظروں سے ندیم کو دیکھا انھوں نے ندیم کا شبہ یقین سے بدل دیا۔

"ڈاکٹر علاج ضرور کر رہے ہیں۔" صفیہ نے بات جاری رکھی۔ "مگر اس کے درد کی دوا تو اسی بے درد کے پاس ہے جس کی محبت میں وہ شمع کی طرح خاموشی سے گھل رہی ہے۔۔۔۔" شاید صفیہ ابھی سب کچھ کہہ ڈالتیں مگر لٹنے میں کھنکارتے ہوئے حبیب میاں اندر داخل ہوئے۔ ندیم نے دیکھا کہ وہ کافی بدلے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ چہرے پر زردی، بال اور زیادہ سفید اور جسم لٹکا لٹکا سا۔ مگر ہونٹوں پر وہی شوخ مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی دمک جیسے شمعیں روشن ہوں۔

"اوہو یہ بھگوڑا آج کہاں سے آگیا؟ کہاں تھے حضرت اتنے دنوں سے؟" انھوں نے ندیم کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"متوازی عوامی حکومت کے قیام کی کوشش فرما رہے تھے۔" صفیہ نے ہنس کر کہا۔ اور ندیم گھبرا گیا۔ صفیہ سے تو وہ گھنٹوں بحث کر سکتا تھا مگر حبیب میاں کے سامنے زبان نہ کھلتی تھی۔

تینوں بیٹھ گئے۔ حبیب میاں نے مسکرا کر کہا: "ادھر کیسے بھول پڑے۔ کیا اب سکندر پور میں پروپیگنڈہ مہم چلانے کا ارادہ ہے؟"

"آپ لوگوں سے ملے عرصہ ہو گیا تھا اس لئے چلا آیا۔"

"اور.....؟"

"اور اپنی نالائقی کی معافی چاہنے۔ اس وقت رنج اور مایوسی میں بے ملے چلے، کہے سُنے چلے جانے پر میں بہت شرمندہ ہوں....."

"اور.....؟"

"اور یہ مشورہ کرنے کہ اب میں کیا کروں؟"

"کیوں پارٹی سیوا سے جی بھر گیا؟"

"جی نہیں۔ اس کے لئے تو زندگی بھر کام کروں گا، مگر آپکے اس سرمایہ پرست ملک میں پیٹ کی خاطر بھی تو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔" حبیب میاں کی جرح پر ندیم جھنجلا گیا تھا۔

"اور اس کے لئے اس سرمایہ پرست دیس کے پرستار کی مدد چاہتے ہو؟" طنز سے حبیب میاں نے کہا۔

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ سے بڑھ کر سچا اشتراکی اور عوامی حکومت کا حامی اور کون ہو سکتا ہے۔ اور....."

"جی بس مجھے تو بخشئے اس عزت افزائی سے۔ میں نہ عوامی نہ اشتراکی۔ سیدھا سادا مسلمان اور اپنے وطن کا پرستار اور خادم ہوں۔ مجھے اور کوئی اعزاز نہیں چاہیئے۔"

صفیہ کو ندیم پر رحم آگیا: "اے بھئی کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے۔ چھوڑو اس قصے کو اور وعدہ کرو کہ اسے کام دلواؤ گے کہیں؟"

"کیا معلوم! ان حضرت کا نام بلیک لسٹ میں ہوا تو؟"

"واہ اس کا نام کیوں ہونے لگا بلیک لسٹ میں۔ اتنے دن سے بیکار پریشان پھر رہا ہے۔ اب آپ اسے کام دلوا دیجئے تو وہ جم کر جی لگا کر کام کریگا۔ اور پھر ہم اس کا گھر بسائیں گے۔"

حبیب میاں بیوی کا مطلب سمجھ کر مسکرا پڑے۔ عورتیں بھی کتنی جلدی پانی پر پل باندھ لیتی ہیں۔

"اچھا تمھاری خاطر کوشش کروں گا۔" اور یہ کہتے کہتے کراہ کر انھوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"میاں آپ کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔" ندیم نے کہا۔

"ہاں بہت تھک گیا ہوں۔ آج کل کام زیادہ ہے اور جسم میں جیسے سکت نہیں رہی اب کچھ کرنے کی۔"

صفیہ پریشان نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔ "آپ کیوں میری جان کے دشمن ہوئے ہیں۔"

حبیب میاں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"اپنا علاج دوا نہیں کرتے، میری بات نہیں مانتے۔ اللہ جانتا ہے میں اپنا سر پھوڑ لوں گی۔"

"تم تو وہمی بھی ہو اور احمق بھی۔"

"نہیں میاں۔ آپا ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ کو کہیں باہر جا کر آرام کرنا چاہیئے۔ بلکہ پہلے بمبئی جا کر صحیح تشخیص کرا لیجئے۔"

"آرام اور علاج کے لئے وقت کہاں سے آئے گا۔ میرے اپنے سامنے کام پھیلے ہوئے ہیں اور اب تو اسمبلی شروع ہونے والی ہے۔"

"بھاڑ میں جائیں کام اور چولھے میں جائے اسمبلی۔ یہ سب کیا تمھاری صحت سے بڑھ کر ہیں" جل کر صفیہ کے منھ سے نکلا۔

"بے شک ہیں" حبیب میاں نے زور دے کر کہا۔ "یہ کیسی دیش بھگت عورت ہے جو ایک شخص کی صحت کو ملک کے مفاد پر ترجیح دیتی ہے"

"میری تو ساری دنیا ساری زندگی وہی ایک بے درد شخص ہے" صفیہ کا گلا بھر آیا۔

"میاں واقعی آپ مان جائیے۔ مرض بڑھانا اچھی بات نہیں" ندیم نے اصرار کیا۔

"ارے مجھے مرض ورض کچھ نہیں۔ بس زیادہ کھانے کا مرض ہے اور یہ سب صفیہ کا قصور ہے" انھوں نے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھا۔

صفیہ چڑ کر بولیں۔ "بس بس مجھے باتوں میں نہ بہلائیے۔ میں کہے دیتی ہوں کہ اب میں ایک نہ سنوں گی۔ اگلے ہفتے ہم ضرور بمبئی چلیں گے"

"ہم؟ یہ ہم کیا معنی؟ کیا تمھیں بھی کوئی بیماری ہے؟" حبیب میاں نے پھر چھیڑا۔

"میری سب سے بڑی بیماری آپ جو ہیں" صفیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ حبیب میاں خوش ہوئے کہ مطلع صاف ہو گیا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ "اچھا اب ذرا اب مجھے آرام کرنے دو"

نرجس اس سال پرائیویٹ بی اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہی تھی۔ دن بھر اونگھتی، رات بھر جاگتی اور شام ہوتے ہی پڑ کر سو جاتی۔ آج بھی وہ جانے کب سے سو رہی تھی۔ شام گہری ہو چلی تھی۔ صحن میں جلتے بجلی کے بلب کی روشنی

کھڑکی کی چق سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ نرجس نے آنکھیں کھولیں۔ بند کرلیں۔ پھر کھولیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رات بھر سو کر صبح کو اٹھی ہے یا شام ہے؟ کونے میں تخت پر کوئی چیز ہلتی نظر آئی۔ یہ کیا ہے؟ اوہو! بی خالدہ جانماز پر بیٹھی ہیں!! نرجس اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ سر پر دُہرا دوپٹہ لپٹا ہوا، آنکھیں بند، دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اُٹھے ہوئے اور ہونٹوں میں بے آواز دعا۔ کھڑکی سے روشنی کی ایک لہر ٹھیک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو اس کی بند آنکھوں سے لڑھکتے ہوئے گول گول موتیوں میں ہیرے کی سی دمک پیدا کر دیتی تھی۔

نرجس بڑے مذہبی ماں باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود مذہبی نہ تھی۔ نماز ماں کے خوف سے کبھی کبھار پڑھ لیا کرتی۔ روزہ تو بیمار ہونے کی وجہ سے معاف ہی ہو گیا تھا۔ مگر دل کی گہرائیوں میں مذہب کا احترام موجود تھا۔ اس وقت خالدہ کو دیکھ کر جو عقیدت و عبودیت کی ننھی سی دیوی معلوم ہو رہی تھی اس کا دل ایک عجیب کیفیت سے بھر گیا۔ "یا اللہ میں پاس ہو جاؤں"۔ اچانک اس کے لب پر یہ دعا کیوں آئی یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

خالدہ نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے جو تر بتر ہو گئے۔ پھر اس نے جانماز لپیٹی اور تخت سے اٹھی تو نرجس کو بیٹھا دیکھ کر اس کی طرف آئی۔ مگر نرجس حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ کیا یہ وہی خالدہ ہے؟ آنکھوں میں نئی چمک، ہونٹوں پر مدھر مسکراہٹ، گالوں پر لالی۔ وہ اداس، بیمار، چڑچڑی خالدہ کیا ہوئی؟

"اوہو خالدہ بی — کیا پایا — بڑی خوش ہو"

"ہٹیے بھی" خالدہ نے شرما کر کہا۔

"ارے بات تو بتا کمبخت — یہ لال کیوں ہوئی جا رہی ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں نرجس آپا" اور نرجس کے گلے میں باہیں ڈال کر زور سے اس سے لپٹ گئی۔

"کچھ تو ضرور ہے۔ کیا تیرے اس بدھو۔۔ بے وفا کی کوئی خبر ملی ہے؟"

خالدہ نے اپنا منہ نرجس کی گود میں چھپا لیا اور ایک ساتھ روتے اور ہنستے ہوئے کہا۔" وہ خود آئے ہیں نرجس آپا"

نرجس نے زور سے اسے بھینچ لیا۔"پاگل — دیوانی" نرجس اور کچھ نہ کہہ سکی۔

۸

بمبئی۔ قلابہ

۲ر دسمبر ۱۹۵۸ء

میری محترم آپا۔ آداب قبول کیجیے!

شرمندہ ہوں کہ خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ آج کل فیلڈ ورک میں مصروف تھا، اس لئے تاخیر ہوئی۔ امید ہے کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔

میں زندہ ہوں مگر خوش نہیں۔ جیسا کہ آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں نہ یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق آئی ہے اور نہ یہاں کی زندگی میں اپنے کو کھپا سکا ہوں۔ یہ شہر مجھے انسانوں کا جنگل سا لگتا ہے۔ ہر چیز پہ تجارتی فضا چھائی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں فن، خلوص اور سیوا کی پرکھ بھی تاجرانہ انداز میں کی جاتی ہے۔ لوگوں کے معیارِ زندگی میں اتنا فرق

ہے کہ دیکھ کر نفرت اور عبرت ہوتی ہے۔ ایک طرف لاکھوں کی کوٹھیاں اور عالی شان بنگلے ہیں تو دوسری طرف ایسی جھونپڑیاں بھی کم نہیں جن کو دیکھ کر افلاس بھی ندامت سے پانی پانی ہو جائے۔ پھر ہزاروں ایسے بھی ہیں جن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس پر "گھر" کی تہمت لگائی جا سکے۔ ان میں مزدور بھی ہیں اور بے روزگار بھی، کلرک، منشی، بابو بھی ہیں اور ایم۔ اے۔ بی۔ اے پاس باہر سے آئے نوجوان بھی جو حسرت سے کروڑپتی سیٹھوں اور فلم اسٹاروں کی پچاس پچاس ہزار کی کاریں اور لاکھوں کے بنگلوں کو دیکھتے اور سینوں میں یہی سب بننے کی آرزو دل کو پروان پڑھاتے ہیں۔ آیا اس "فیلڈ ورک" کے سلسلے میں مجھے ایسی چالوں میں جانا پڑا ہے جہاں شاید کبھی بھی سورج کی کرنیں، تازہ ہوا کی لہریں اور زندگی کی تمناؤں کا گزر نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ غربت جہالت، گندگی، بے حسی اور مصیبت کا مستقل قیام ہے۔

ادھر اپنے ساتھی سوشل ورکروں کو دیکھتا ہوں تو اور زیادہ مایوسی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سماج سدھار اور دیش سیوا کے لئے نہیں کسی اچھی سی نوکری کی خاطر یہ ٹریننگ پا رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے سے کتراتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہر ایک اپنی جگہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اکیلا کر بھی کیا سکتا ہوں۔ یہ تو سارا نظام — سارا ڈھانچہ ہی بگڑا ہوا ہے ... اپنے کو دھوکا دینے کے لئے، ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے ہم لوگ ایسی بہت سی باتیں سوچ کر دل کو بہلا لیتے ہیں ... مگر میں کیا کروں کہ ان دھوکوں سے بھی دل بہلا نہیں سکتا۔ حقائق سے آنکھ چرائی نہیں جاتی،

بے حس نہیں بن سکتا۔ اس لئے کڑھتا رہتا ہوں، سوچتا رہتا ہوں ــــ اور سمجھ نہیں پاتا کہ کیا کروں! بہر حال امید کی ایک کرن میرے سامنے ہمیشہ جگمگاتی رہتی ہے اور وہ ہے آپ کی اور حبیب میاں کی مثال۔

آپ گیتا کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھیں تو اچھا تھا۔ اس کے بارے میں کیا لکھوں؟ ممکن ہے آپ شکایت سمجھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ گیتا اب وہ سکندر پور والی گیتا نہیں رہی۔ ان کی حالت دیکھ کر جو روحانی تکلیف ہوتی ہے وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے سارے سہانے سپنے چور چور ہو گئے ہوں۔ جیسے سورگ کی دیوی کو کسی نے کیچڑ میں دھکیل دیا ہو، جیسے نمائش و عشرت و امارت سادگی، خلوص، سیوا اور تیاگ کا منہ چڑا رہی ہوں ــــ جیسے بمبئی کملا نگر کا مذاق اڑا رہا ہو۔

میں جب آیا تو گیتا وہی پہلے کی سی گیتا تھی۔ محبت و خلوص سے ملیں۔ ہم دونوں میں جلدی ہی دوستی ہو گئی ــــ مگر پھر ــــ پھر وہ مجھ سے چھین لی گئیں اور آج کل یہاں کے مشہور سیٹھ کوکو والا کی بیٹی لیلے کا سایہ بنی ہوئی ہیں۔ ان میں اور لیلے میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ آپ دیکھیں گی تو پہچان نہ سکیں گی۔ دو نوجوان آج کل ان کے ساتھ ہر جگہ نظر آتے ہیں جن میں سے ایک لیلیٰ کا بھائی ہے ــــ اور بمبئی بھر میں اپنے بدنام کیرکٹر کی وجہ سے مشہور ہے۔

آپا گیتا ڈوب رہی ہے۔ بھنور میں پھنس گئی ہے۔ صرف

آپ اسے بچا سکتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں اس میں اثر پذیری کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ آپ کے پاس تھی تو وہ آپ کا عکس معلوم ہوتی تھی۔ کملا نگر میں رہ کر اس کا دیس سیوا اور پریم کا جذبہ اور نکھر اُٹھا تھا۔ مگر اس ماحول میں شاید وہ سب کچھ بھول گئی ہے۔

لیکن آپا — میں ابھی تک اپنے کو یہ دھوکا دے رہا ہوں کہ یہ سب اوپری اور کچے رنگ ہیں۔ اس کے دل گہرائیوں میں اب بھی اسی آدرش زندگی کی لگن موجود ہے۔ اس کا دل پاک ہے وہ معصوم ہے۔ اس کا ذہن پوتر ہے۔ ہاں وہ اس شیش محل میں بوکھلا سی گئی ہے۔ دیر سویر وہ ضرور خود کو پہچان لے گی اور اس دلدل سے نکل آئے گی۔

مگر — مگر مجھے خوف یہ ہے کہ کہیں اس کی سادہ لوحی سے کھیلنے کی کوشش تو نہیں ہو رہی؟ لیلےٰ اور اس کا بھائی اور دوسرے نوجوان اسے کسی جال میں تو پھنسا نہیں رہے ہیں — ایسا نہ ہو — ایشور نہ کرے — ایسا نہ ہو آپا کہ — خطرے کا وہ احساس ہی نہ کر پائے اور کوئی ناگ اسے ڈس لے — اور اس گندے ماحول میں یہ کوئی عجیب یا نئی بات نہ ہوگی۔

تب — تب میں کیا کروں گا؟

آپا — آئیے اور گیتا کو بچا لیجئے۔

میں ہوں آپ کا پریشان

انعیم

صفیہ یہ خط پڑھ کر چکرا گئیں۔ یہ تو وہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ گیتا بدل گئی ہے

اس کے خط جو پہلے ہر ہفتے پابندی سے آیا کرتے تھے اب ہفتوں نہ آتے اور جو آتا وہ بھی اکھڑا اکھڑا سا نہایت مختصر۔ وہ سوچتیں، نئی جگہ ہے۔ بڑا شہر، نئی نئی دلچسپیاں، دوستیاں، جوان لڑکی ہے۔ کہاں تک ہم بڈھوں کو یاد رکھے۔ قدرتی بات ہے نوجوانوں کو اپنے ہم سنوں کے ساتھ سیر تفریح زیادہ اچھی لگتی ہے۔ مگر جو باتیں انوپم نے لکھیں ۔۔۔ ان کا تو انھیں سان گمان بھی نہ تھا۔ وہ اتنی بدل سکتی ہے؟ ایسے لوگوں کی صحبت پسند کرنے لگی ہے؟ ناممکن۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ گیتا اور ایسی ہو جائے، نہیں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے انوپم میاں اس پر عاشق ہو گئے ہیں۔ اور عشق کے ساتھ بدگمانی لازمی ٹھہری۔ ہے بھی وہ بڑا قدامت پرست لڑکا۔ سب کو اپنا جیسا دیش بھگت، اور آدرش کے لئے جان دینے والا دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر لکھا ہے۔

حبیب میاں کو اب انھوں نے بمبئی جا کر علاج کرانے پر راضی کر لیا تھا اور خود بھی ساتھ جانے کی تیاری کر لی تھی۔ لاکھ حبیب میاں نے روکا مگر وہ مانی نہیں۔ جب سے وہ بیمار رہنے لگے تھے یہ اور بھی ان کا سایہ بن گئی تھیں۔ انھوں نے سوچا اب تو میں بمبئی جا ہی رہی ہوں وہاں خود گیتا کو دیکھ لوں گی۔ اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو میرے وہاں جانے کے بعد سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ان کی موجودگی میں گیتا کسی اور کا اثر قبول کر سکے؟

کتنا بھروسہ تھا انھیں اپنی شخصیت اور ذات پر وہ نہیں جانتی تھیں کہ نوجوانی کی عمر میں انسان کیا کیا رنگ بدل سکتا ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

انھوں نے انوپم، گیتا اور ہریش چندر کو اپنے پہنچنے کی تاریخ سے مطلع کیا اور خود تیاری میں لگ گئیں۔

۹

گیتا کچھ دن سے محسوس کر رہی تھی کہ لیلے کی گرم جوشی سرد مہری سے بدلتی جا رہی ہے اور نکی کی مہربانیاں اس کے حال پر بڑھ رہی ہیں۔ جب وہ نشاط دلا جاتی تو نکی وہاں ضرور موجود ہوتا اور اس گرم جوشی اور تپاک سے اس کا خیر مقدم کرتا کہ گیتا گھبرا جاتی۔ وہ کئی بار اسے "چھوٹے چھوٹے" تحفے پیش کر چکا تھا (جن میں سے کوئی بھی سینکڑوں سے کم کا نہ تھا) لیکن گیتا نے ہر بار معذرت کر کے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار ایک ننھی سی سونے کی جڑاؤ رسٹ واچ پر اس کا جی بہت للچایا۔ مگر اتنا بھی سمجھتی تھی کہ لیلے سے تحفے لینا اور بات ہے اور کسی نوجوان اور غیر مرد کا تحفہ قبول کرنا بہت نامناسب بات سمجھی جاتی ہے۔ لیلے کئی بار تلخی سے ٹوک چکی تھی۔ "یہ کیا بات ہے گیتا؟ جیسی میں ویسا نکی۔ تم اس کی ہر چیز سے انکار کر کے اس کا دل توڑ دیتی ہو۔ کتنے چاؤ سے لایا ہے وہ یہ چیزیں!" مگر گیتا ہنس کر بات ٹال دیتی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ لیلے ایک طرف نکی سے اس کی دوستی اور خصوصیت بڑھانا چاہتی ہے اور دوسری طرف کھنہ کی خصوصیت اسے سخت ناگوار گزرتی ہے۔ کھنہ اب بھی گیتا کے آس پاس رہتا تھا اور زیادہ سے زیادہ اسے اپنی طرف متوجہ رکھتا۔ اس کا اور نکی کا مقابلہ آ پڑا تھا۔ نکی اگر اپنی دولت و امارت، "تحفے تحائف" اور "خوش مزاجی اور ظرافت" سے گیتا کو زیر کرنا چاہتا تھا تو

کھنہ اپنی "خوش ذوقی"۔ "اعلیٰ اخلاق"۔ "ذہانت و عالی ظرفی"۔ "خلوص اور سچی محبت" کے داؤں پھینک کر اسے جیتنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور گیتا کے رویے نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ نکی اس میدان میں اس سے بازی نہیں جیت سکتا۔ خود گیتا محسوس کر رہی تھی کہ جتنی نکی سے اس کی نفرت بڑھ رہی ہے اتنی ہی وہ کھنہ کی طرف جھکتی جا رہی تھی۔ کھنہ کئی بار بورڈنگ ہاؤس بھی آ چکا تھا اور لیلےٰ اور گیتا کو اپنے ساتھ فلم یا سیر کے لئے لے جا چکا تھا۔ اگرچہ گیتا کو یقین تھا کہ وہ لیلےٰ کو مجبوراً مدعو کرتا ہے اس میں اسی کی خاطر یہاں آتا ہے۔ لیلےٰ اب یہ کوشش کرتی کہ گیتا سے بچ کر تنہا کھنہ کے ساتھ گھومے پھرے، مگر کھنہ اصرار کر کے گیتا کو مدعو کرتا اور لیلےٰ جل بھن کر رہ جاتی۔ اور کسی نہ کسی حد تک یہ سب گیتا سمجھ رہی تھی۔ جانے کیوں اسے ایک چھپے ہوئے غرور اور طاقت کے احساس سے انوکھی سی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

دسمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ کرسمس کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ نشاط دلائیں کرسمس کی اور نئے سال کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں اندر اور باہر بجلی کے قمقموں، کاغذ کی جھنڈیوں اور رنگین غباروں سے گھر کو سجا دیا گیا تھا۔ طرح طرح کے پروگرام، ڈانس، ڈراما، پک نک وغیرہ کے بنائے گئے تھے۔ انگلش ڈراما سیزر اور کلوپیٹرا اسٹیج کیا جانے والا تھا۔ لیلےٰ ہیروئن کا پارٹ لینا چاہتی تھی۔ مگر نکی کا اصرار تھا کہ اس کا قد، صورت اور ناک نقشہ اس کے لئے موزوں نہیں بلکہ گیتا بنی بنائی کلوپیٹرا ہے۔ لیلےٰ کی ناگواری اور گیتا کے انکار کے باوجود اسے مجبور کیا گیا کہ وہ کلوپیٹرا کا پارٹ کرے۔

اور ظاہر ہے میز کا پارٹ نکی نے خود لیا۔ گیتا کو انگلش بولنے کی مشق نہ تھی مگر جب پارٹ لے لیا تو اب اسے اچھی طرح کرنا بھی تھا۔ دن رات محنت کر کے اس نے مکالمے یاد کئے، لہجہ ٹھیک کیا۔ اور اب تو کئی بار اس کی ریہرسل بھی ہو چکی تھی۔

مگر اب گیتا سوچ رہی تھی کہ کیسے نشاط دلا جانے سے بچا جائے؟ ایک تو نکی کی خصوصیت اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے حبیب میاں اور صفیہ بیگم کے آنے کی وہی تاریخیں تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اس زمانے میں وہ بھی ہریش چاچا کے ہاں جا کر ان کے ساتھ رہے۔ گھبرا رہی تھی کہ صفیہ اس کے لباس اور فیشن پر اعتراض کریں گی۔ الجھ رہی تھی کہ وہاں انوپم بھی آیا کرے گا، اتنے دن نہ آنے پہ ہریش چاچا مذاق میں فقرے کستے رہیں گے۔ مگر خیر — ان سب باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ آپا اور میاں کو سمجھنا چاہیئے کہ ہر کوئی ان کی طرح قدامت پرست تو نہیں بن سکتا — اور انوپم کون ہوتا ہے اس کے معاملات میں ٹانگ اڑانے والا — وہ جہاں چاہے جائے، جس سے چاہے دوستی کرے دوسروں کو کیا حق ہے اس میں دخل دینے کا — مگر بہرحال اسے اس وقت — جبکہ میاں بیمار بھی ہیں صفیہ بیگم کے پاس جا کر ہی رہنا چاہیئے۔

اس نے لیلیٰ کو یہ سب سمجھا کر کہا۔ ”لیلیٰ بہن — میں اس چھٹی میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گی۔“ مگر یہ سنتے ہی لیلیٰ بگڑ اٹھی۔ وہ اب اصرار اور خوشامد نہیں کرتی تھی۔ حکم دیتی تھی یا ڈانٹ ڈپٹ اور طنز کرتی تھی۔ ”یہ کیا فضول باتیں کرتی ہو۔ کچھ اپنے وعدے کا بھی پاس ہے کہ نہیں۔ کلو پیٹرا بننے کا یا تو وہ چاؤ تھا کہ مری جا رہی تھیں یا اب جب ساری تیاری

ہو چکی تو انکار کر رہی ہو جانے سے — تم چاہتی ہو سارا پروگرام ٹھپ ہو جائے۔
نہیں تمہیں جانا پڑے گا — میں کسی طرح بھی نہ مانوں گی۔"

الفاظ سے زیادہ اس کا انداز گفتگو گیتا کے لئے ناقابل برداشت تھا۔
مگر کرے کیا؟ ایک تو بات تو سچ تھی۔ وہ نہ گئی تو ڈراما نہ ہو سکے گا۔ سب
اسے گنوار اور بدتمیز سمجھیں گے۔ پھر اتنی بار جا چکی ہے۔ لیلے کے اتنے احسان
اٹھا چکی ہے اب کیسے ایک دم بے رخی کرے؟ اتنے دن لیلے کے اشاروں
پر کٹ پتلی کی طرح ناچتے رہنے کے بعد ان دھاگوں کے جال کو توڑنا آسان
بھی تو نہ تھا.....

لیلے نے اب اپنا رخ بدلا "گیتا ڈارلنگ دیکھو مان جاؤ — میں
تمہیں لے کر جاؤں گی، نہیں تو مزا نہ آئے گا کسی چیز میں — ممی، پاپا، نکی،
کھنہ سب تمہارے منتظر ہوں گے وہاں — تم ڈرامے کے بعد فوراً چلی آنا۔
کوئی تمہیں نہ روکے گا....."

اس اصرار میں وہ خلوص اور اپنائیت نہ تھی جس کی گیتا عادی تھی
مگر وہ کرتی بھی کیا آخر — اور مجبوراً اسے لیلے کے ساتھ جانا پڑا۔

۲۶ر دسمبر کو صبح کے وقت انوپم بمبے سنٹرل پر ہریش چندر کے ساتھ کھڑا
حبیب میاں کی ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ بار بار اس کی نظریں گیتا کی
تلاش میں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اب ایسا بھی کیا کہ وہ آپا اور میاں کو
لینے اسٹیشن پر نہ آئے؟

اور گیتا اس وقت نشاط ولا کے بڑے ہال میں سیزر اینڈ کلوپیٹرا کی
ڈریس ریہرسل میں اپنے کو بھولی ہوئی، ہال میں بیٹھے لوگوں سے بار بار

دادو تحسین وصول کر رہی تھی۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ پرانا سال رخصت ہو چکا تھا اور نئے سال کے جنم کی خوشیاں زور شور سے منائی جا رہی تھیں۔

نشاط دِلا میں اس وقت عجیب ہنگامہ اور دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی سانہ بج رہے تھے۔ کھانے اور پینے کا دور چل رہا تھا۔ پاپا اور ان کے مصاحبین، ماما اور ان کے عاشقین، لیلے اور اس کے احباب، نکی اور اس کے یار دوست، سب مسرت و جوش میں بدمست نظر آ رہے تھے۔ ان کے قہقہے چھت کو پھاڑے دیتے تھے اور ایک دوسرے سے ان کی بے تکلفیاں اور چہلیں بڑھتی جا رہی تھیں ـــــ ڈانس کے قدم تیز ـــــ اور تیز ـــــ اور تیز ہوتے جا رہے تھے۔

اس طوفانِ بدتمیزی نے گیتا کو بدحواس کر رکھا تھا۔ سب کے سخت اصرار پر صرف چند بوندیں اس نے حلق سے اتاری تھیں اور صرف ایک چکر ڈانس کا لگایا تھا۔ مگر یہ چند بوندیں اور ایک چکر اسے چکرا دینے کے لئے کافی تھا۔ ہال میں اس وقت اسے کوئی اپنا نہ نظر آ رہا تھا۔ کھنہ بھی اس سے بے نیاز اور بے خبر لیلے کی باہوں میں باہیں ڈالے، اسے سینے سے چمٹائے ڈانس میں کھویا ہوا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں جو چمک اور چہرے پر جو کیفیت تھی وہ گیتا سہار نہ سکی۔ یہ فضا اس کا دم گھونٹے دے رہی تھی۔

چپکے سے اس نے پہلو کا ایک دروازہ کھولا اور باہر کھسک آئی۔ دھیرے دھیرے برآمدے کی سیڑھیاں اتری، سپاہی چوکیدار اور ملازم ـــ کوئی بھی سامنے نہ تھا ـــ شاید وہ سب بھی اپنے آقاؤں کی نقل میں نیا سال

منا رہے تھے کہیں ....

گیتا تاڑ کے ایک لمبے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اندر اس کی بصارت چکا چوند کرنے والی روشنیوں اور بے حیائی کے منظروں سے، سامعہ موسیقی کی تیز تانوں اور قہقہوں کے شور سے، شامہ شراب کے بھبکوں سے اور ذہن ان سب کے ملے جلے اثرات سے مجروح ہو رہا تھا۔ یہاں تاروں بھرے سیاہ آسمان کے سائے میں، اوس کی بوندوں کی خوشگوار خنکی اور تازہ پھولوں کی بھینی بھینی مہک نے اس کے زخمی احساسات پر مرہم کا کام دیا — اس نے اپنا تھکا ہوا سر تنے سے ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کرلیں، ٹانگیں پھیلا دیں۔ اف کتنا سکون، کیسی شانتی — اندر سے نکلتی موسیقی کی تانیں، قہقہوں کا شور، اور ہر طرف سے بجنے والے گھنٹوں کی صدائیں اسے دور — بہت دور سے آتی معلوم ہو رہی تھیں — اور دھیرے دھیرے — وہ خاموش ہوگئیں۔ نیند کی پری نے گیتا پر اپنا سایہ ڈال دیا۔

اور پھر یکایک وہ چونک پڑی۔ کوئی لجلجی سی چیز اس کی گردن میں لپٹ گئی تھی۔ "آہ — سانپ .... سانپ — سا — ن — پ —" ایک گھٹی ہوئی آواز گیتا کے گلے سے نکلی — اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "آہ کیسا بھیانک سپنا تھا۔"

مگر — مگر — اس کی کمر سے اب بھی کوئی لجلجی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ تڑپ کر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی — مگر ناکام ہوئی۔ اب گیتا پوری طرح ہوشیار ہو چکی تھی — کسی کی باہیں اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھیں اور اس کا منھ جس سے بدبو کے بھبکے اڑ رہے تھے — اس سے اتنا قریب۔ اتنا قریب تھا — زور سے گیتا کو ابکائی آئی — اور دوسرے جھٹکے میں وہ

سانپ کی گرفت سے آزاد تھی اور سانپ اس کے پیروں میں پڑا بل کھا رہا تھا نشے میں بدمست منھ منھ میں بکتا ہوا۔ "میری جان — مائی ڈارلنگ — مائی سویٹ ہارٹ — پلیز — پلیز — مائی لو — آئی لو یو — آئی لو یو — گیتا پلیز — ڈونٹ بی اینگری — ڈارلنگ — مائی —"

اور گیتا کی اونچی نوکیلی ایڑی کا سینڈل ہر ہر لفظ پر اس کا منھ کچل رہا تھا۔ "شٹ اپ، شٹ اپ۔ بدتمیز — بے ہودہ — آئی ہیٹ یو۔ ہیٹ یو۔ آل آف یو جنگلی — سور — بدتمیز —" نفرت کے بے انتہا جذبے اور غصے کے بے پناہ جوش میں بھی وہ اس سے زیادہ سخت لفظ کوئی نہ کہہ سکی مگر سینڈل کی مار میں اور زیادہ سختی آتی گئی۔ ... یہاں تک کہ خون کی ایک پتلی سی لکیر پر اس کی نظر پڑی جس نے اس کی ایڑی کو سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا۔...

گیتا کانپ اٹھی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نکی بے سُدھ پڑا تھا — کیا یہ مر گیا؟ اچھا ہوا — مگر — مگر — پولیس — پولیس — وہ کہاں جائے۔ کیا کرے —؟ اس ناپاک گھر میں اب وہ کبھی قدم نہ رکھے گی — پر اب کہاں اس کا ٹھکانا ہے — وہ قاتل ہے — قاتل۔

وحشت کے عالم میں اس نے چاروں طرف دیکھا — دُور سے ایک سیٹی کی آواز پر اس کا بند بند کانپ اُٹھا — بدنامی — جیل — موت — اور وہ بدحواسی میں پھاٹک کی طرف دوڑی!

پیچھے سے کسی نے اس کا کندھا پکڑ کر زبردستی روکا "ٹھیرو ذرا!" گیتا ایسے چونکی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"اتنا گھبرا کیوں رہی ہو گیتا — وہ مرا نہیں — بے ہوش ہو گیا ہے۔ بے حیا کی رسّی دراز ہوتی ہے۔" کھنہ کھڑا اسے تسلی دے رہا تھا۔

"میں نے سب دیکھا گیتا۔ اس مردود کی یہی سزا تھی۔ تم جیسی بہادر لڑکیاں ہمارے دیش کی عزت ہیں۔"

گیتا اب بھی کچھ نہ بول سکی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے اور ساری جان سے لرز رہی تھی۔

"مگر تم جا کہاں رہی تھیں؟"

"کہاں جاؤں — کہاں؟" ایک چیخ کی طرح گیتا کے منھ سے نکلا۔

"چلو میں تمھیں بورڈنگ ہاؤس چھوڑ آتا ہوں۔" یہ کہہ کر کھنہ نے اس کا بازو تھاما اور آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف لے چلا۔ سامنے سے ایک ٹیکسی آرہی تھی، اسے اشارہ کیا اور جیسے ہی وہ رکی گیتا کو بٹھا کر خود بیٹھنا چاہتا تھا کہ گیتا نے اشارہ کیا۔ "نہیں — تم باہر بیٹھو۔" اب اسے کسی پر بھروسہ نہ تھا۔ کھنہ ذرا دیر مذبذب کھڑا رہا، مگر گیتا کے تیور بگڑے ہوئے تھے — آخر وہ چپ چاپ باہر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "اندھیری" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

گیتا پچھلی سیٹ پر اوندھی پڑی تھی اور من ہی من میں کہہ رہی تھی۔ "ایشور — ایشور — بھگوان — اے خدا میری سہائتا کرو — میں بے سہارا۔ اناتھ — بے بس ہوں — مجھے ان بھیڑیوں سے بچاؤ ایشور — بچاؤ —" اس کے رونگٹیں رونگٹیں سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ اور باہر بیٹھا کھنہ جانے کیا کیا منصوبے بنا رہا تھا۔

۱۰

خالدہ گھر واپس آئی تو بالکل بدلی ہوئی۔ چہرے پر زردی کی جگہ سرخی، آنکھوں

میں نزاشا کی جگہ آشا کی دمک، ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ، باتوں میں چونچالی۔ جو دیکھتا ماشاء اللہ ہف نظر، چشم بد دور کہہ کر اظہار مسرت کرتا۔ ابن میاں تک نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ "خوب موٹی ہو کر آئی ہے خلن تو تو وہاں سے؟"

بڑی اماں چیخ پڑیں۔ "اے ہے ابن اپنی ایڑی دیکھو اس میں گو لگا ہے لو اور سنو میری بچی کو نظر لگا رہے ہو۔ سکینہ اس پر سے کالا دانہ تو اتار دیجو ذرا۔" سکینہ نے مسکرا کر خالدہ کو دیکھا اور نظر اتار دی۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ اس کی بیماری دور ہو چکی ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ یہ انھیں معلوم نہ تھا۔ مگر خالدہ میں یہ نئی زندگی اس کا ثبوت ہے کہ اسے گوہر مراد مل گیا ہے۔

خالدہ بھی انھیں دیکھ کر کچھ کم خوش اور حیران نہ تھی۔ وہ اب پہلے کی سی اکل کھری، اداس اور خاموش سکینہ نہ تھیں۔ وہ ہنستی بولتی تھیں — صوفیانہ مگر اچھے عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ گھر اور گھر کے کاموں سے انھیں خاص طور پر دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کلو تو ان کے گلے کا ہار ہی رہتی ہر وقت۔ دیکھنے میں بھی تو وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور کم عمر لگنے لگی تھیں۔ بڑی اماں ان کو بڑے پیار سے مخاطب کرتی تھیں اور وہ بھی ان سے بڑے ادب سے بات کرتیں۔ یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی؟ یہ خالدہ کی سمجھ میں نہ آیا مگر پھوپی کی عنایت اور محبت کی بر کھا ہو رہی تھی اس سے خوش بھی تھی اور متاثر بھی۔ انھوں نے اس کے کئی نئے جوڑے بنائے تھے اور اپنے ہاتھ سے سی ٹانک کر رکھے تھے۔ اس کی پسند کی کئی چیزیں منگوائی تھیں۔ شاید اتنے دن دور رہنے کی وجہ سے ان کی محبت اتنی بڑھ گئی ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ خود اس میں کتنی تبدیلی آگئی ہے اور

لوگ اسے دیکھ کر اس سے زیادہ حیران ہیں جتنی وہ سکینہ کو دیکھ کر ہوئی ہے۔
شام کو اکیلے میں ساجو نے خلن کو چھیڑا۔ "خلن بی! سکندر پور میں کیا پایا؟"
خالدہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ "کیا پایا؟ میں سمجھی نہیں؟"
"ہم سے نہ چھپاؤ خلن بی۔ کچھ تو ضرور پایا ہے۔ ہم جانتے ہیں بھینا تمھارے من کی مراد مل گئی ہے۔" ساجو نے اسے گدگداتے ہوئے کہا تو خالدہ دوہری ہو گئی۔
"سچ بتا ۔۔ وہاں ندیم بھیا آئے تھے نا؟" خالدہ کا منھ لال ہو گیا مگر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
"تم سے کتنی بار ملے؟" ساجو نے پوچھا۔
"کئی بار" آہستہ سے خالدہ نے کہا۔
"اکیلے میں یا سب کے سامنے؟"
"سب کے سامنے"
"کیا باتیں ہوئیں؟"
"کچھ بھی نہیں۔"
"جھوٹ۔ کچھ تو ضرور ہوئی ہوں گی۔"
"نہیں ساجو دیدی۔ میری ہمت ہی نہیں پڑی کچھ کہنے کی۔"
"ارے تو ان کی بھی ہمت نہیں پڑی؟ انھوں نے بھی بات نہیں کی؟"
"ایک بار صرف کی۔" بمشکل خالدہ نے اتنا کہا۔
"تمھیں میری قسم خلن! کیا کہا تھا!"
"ان کو احمد آباد کے کسی کالج میں جگہ مل گئی ہے۔ جس دن وہ

جانے لگے — اس دن میں — میں — وہ —" خالدہ ہچکچا رہی تھی۔

"ہاں ہاں رک کیوں گئیں۔ تو میں — میں — وہ — وہ —"

"جاؤ ہم نہیں بولتے — تم سے۔ تم تو نقلاتی ہو ہیں" خالدہ نے روٹھ کر کہا۔

"اے ہے میری چھوٹی موئی روٹھ گئی۔ اچھا اب نہ کچھ کہوں گی۔" ساجو نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"ہاں تو پھر؟"

"بس اس دن، دن بھر مجھے رونا آتا رہا۔ بار بار منھ دھوتی مگر مار ساری آنکھیں سوج گئیں۔ چچی جان نے دیکھا، ہنسیں اور مجھے گلے لگا کر بولیں۔ ابھی سے کیوں رو رہی ہے بداگی تو دور ہے، پر میں احمق سمجھی ہی نہیں اس وقت۔ ان کے باہر جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ چلے آ رہے ہیں۔"

"ابھی سے وہ کہنے لگی؟" ساجو سے بھلا کہاں رکا جاتا۔

"ہٹو بھی ساجو دیدی۔ ہر وقت تمھیں مذاق ہی سوجھتا ہے۔" شرما کر خالدہ نے جواب دیا۔

"اچھا معاف کر دو اب کی بار — ہاں تو تم نے دیکھا وہ چلے آ رہے ہیں تو کیا کیا؟"

"کرتی کیا — سوچ رہی تھی دوسرے کمرے میں بھاگ جاؤں مگر پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لئے ...... بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی — جانے کے لئے وہ بالکل تیار کھڑے تھے — میں نے لاکھ روکا مگر یہ آنسو کمبخت — نہ رکنا تھے نہ رکے۔" خالدہ کہتے کہتے چپ ہو کر خلا میں دیکھنے لگی۔

"ہاں پھر کیا ہوا؟" ساجو نے پوچھا۔

"واہ - کیا کوئی کہانی سن رہی ہو۔"

"ہاں بڑے مزے کی کہانی ہے - آگے سناؤ۔"

"نہیں سُناتی -"

"تمھیں ندیم بھیّا کی قسم!"

"اُفوہ تم تو بہت ستاتی ہو ـــ بس کچھ دیر وہ کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر ـــ پھر ـــ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اور میرا بھی ـــ بلکہ میں تو ساری جان سے کانپ رہی تھی سا جو جیسے کپکپی چھٹ گئی ہو ـــ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگے......"

"کیا کہنے لگے؟" ساجو نے اسے رکتے دیکھ کر پوچھا۔

"کہنے لگے ـــ میری ننھی پجارن ـــ کیوں ان انمول موتیوں کو بکھیر رہی ہو۔ مجھے اور زیادہ رونا آگیا تو میرے پاس بیٹھ گئے، اپنے رومال سے میرے آنسو پونچھے اور جب باہر سے کسی نے پکارا تو جلدی سے کھڑے ہو گئے - پھر جاتے جاتے پلٹے ـــ اور بولے - "خلن ـــ ندیم ـــ تمھارا ہے ـــ تمھارا ـــ" لفظ عاشق باوجود کوشش کے خالدہ کے منھ سے نہ نکلا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا کر دوہری ہوگئی -

ساجو نے خوش ہو کر کہا - "مبارک ہو خلن بی - بڑے دیہا شیر کو شکار کیا۔ چلے تھے بڑے سورما بن کر - ہتھیار ڈالنے پڑے نا میری خلن کے سامنے۔"

خالدہ اپنے من کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے تخیل میں اب بھی ندیم چلتا پھرتا، ہنستا باتیں کرتا نظر آتا ـــ اس کی محبت قبول کرلی گئی۔ یہ تسلی اس کے لئے کافی تھی ـــ آگے کیا ہوگا؟ شادی ہوگی؟ کب ہوگی؟ اس کی اسے کوئی

فکر نہ تھی۔ وہ تو ہر وقت اس کے دل کے اندر براجمان ہے۔

گھر میں کتنا بڑا انقلاب آ گیا ہے اس کی اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اپنی زندگی کے خوشگوار انقلاب میں وہ اتنی مگن تھی کہ دنیا کی کسی اور بات کی فکر کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔

تین دن بعد صدیق حسن سہارن پور سے رخصت لے کر آئے تو اسے دیکھ کر جوشِ مسرت میں رو پڑے۔ مگر وہ کچھ گھبرائے سے کیوں ہیں؟ یہ خالدہ سوچ رہی تھی۔ اتنے میں سامنے سے سکینہ بیگم آتی نظر آئیں۔ ابا جان انھیں دیکھ کر مسکرائے کیوں؟ سکینہ پھوپی کے چہرے پہ یہ سرخی اور آنکھوں میں چمک کیسی؟ ان کا بادامی ریشمی دوپٹہ ماتھے پہ کیوں کھسک آیا؟ اس نے پھر ایک نظر باپ پہ ڈالی ایک ان پہ۔ مگر کچھ سمجھ نہ پائی۔

صدیق حسن نے دو بار کھنکار کر گلا صاف کیا، کچھ کہنا چاہا مگر کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔ اب سکینہ بھی پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور صحن میں کھڑی موتی بیگم مسکرا مسکرا کر یہ ناٹک دیکھ رہی تھی۔ آخر صدیق حسن نے کسی نہ کسی طرح کہہ ہی ڈالا۔ "ظلن تو اپنی امی سے ملی؟" جملہ بے تکا سا ہے یہ وہ جانتے تھے، مگر آخر کس طرح بات سمجھائیں۔ — خالدہ نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا جیسے کہتی ہو کہ میری اماں اس دنیا میں کہاں ہیں؟ وہ اور بھی گھبرا گئے، مگر بات تو اس بدھو لڑکی کو کسی طرح سمجھانی ہی تھی۔ سکینہ سے بولے۔ "بھئی تم ہی بتا دو نا اپنی بیٹی کو۔" مگر وہ ان سے بھی زیادہ نروس ہو رہی تھیں۔ لپک کر موتی بیگم آگے بڑھی۔ "آپا — تم بھی بس بدھو ہو — بھئی اب ہماری اماں بن گئی ہیں۔" اس نے سکینہ بیگم سے لپٹ کر کہا۔

اور اب خلن کی ڈوبی سمجھ میں یہ بات آئی کہ سکینہ کا اس کے باپ سے عقد ہوگیا ہے۔ وہ چند لمحے بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی پتلیاں کبھی باپ کی طرف مڑتیں کبھی سکینہ کے چہرے کی طرف۔ وہ دونوں اس گنہ گار کی طرح جو اقبالِ جرم کے بعد کٹہرے میں کھڑا اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کا منتظر ہو اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جانے خالدہ کو یہ نیا رشتہ لینا آئے کہ نہ آئے۔ جوان کنواری لڑکی کے بیاہ کی جگہ باپ اپنا بیاہ رچالے۔ یہ کوئی اچھی بات ہے؟ اور پھر صدیق حسن کا سا باپ جس کو اولاد سے والہانہ محبت تھی اور جس نے ساری جوانی ویران اداس تنہائیوں میں گزار دی تھی۔

مگر اس خبر سے جو شاک خالدہ کو پہنچا اس سے وہ چند لمحوں ہی میں سنبھل گئی۔ پہلے اس نے باپ کے کھچڑی سر کو بوسہ دیا اور دو آنسو اس پر نچھاور کر کے سکینہ کی طرف مڑی۔ "امی ——— میری امی" آہستہ سے اس نے کہا اور سکینہ نے لپک کر جوشِ مسرت میں اُسے لپٹا لیا۔ مہینہ بھر سے وہ اسی فکر میں تھیں کہ دیکھیں خالدہ اس سنجوگ کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ صدیق حسن نے گھر بھر کو منع کر دیا تھا کہ کوئی اس کی خبر خالدہ کو نہ دے۔ وہ خود ہی بتائیں گے۔ اسی لئے نہ صرف سکندر پور میں بلکہ یہاں آکر بھی چار دن تک خالدہ اس حادثے سے یکسر بے خبر رہی۔

موتی بیگم نے جو ابا جان اور امی کی محبت کی برکھا آپا پر ہوتے دیکھی تو بہت ناگوار ہوا۔ خالدہ کو جھکیلتی ہوئی بولی۔ "ہٹو آپا —— امی میری ہیں۔ تمھاری نہیں ——— تم تو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئی تھیں اب ہیں نا امی؟"

"ہٹ پرے گدو ——— امی تو میری ہیں ——— ہیں نا امی؟" خالدہ نے سکینہ بیگم کے گلے میں دونوں باہیں ڈال کر گدو کا منھ چڑایا۔

"ائیں ایں ... آئی بڑی امی والی — ابا جان امی میری ہیں نا؟"
اس نے باپ کے کندھے کا سہارا لیا۔

"دونوں کی۔" صدیق حسن نے مسکرا کر کہا اور انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سارے جہان کی مسرتیں ان کے گھر پر نازل ہو رہی ہیں۔ ان کا دل بے اختیار شکر کے جذبے سے بھر گیا۔

تارا اور لتا کی شادی کے بعد سے سندر سنگھ کے گھر میں اور بھی ویرانی برسنے لگی تھی۔ سریندر پھر فیل ہو گیا تھا اور باپ نے اسے پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ سیتا دیوی نے ان سے خفا ہو کر بیٹے کو اپنے بھائی کے پاس پٹیالے بھیج دیا تھا۔ اور ان کے اپنے پتی سے اور بھی تعلقات بگڑ گئے تھے۔ جتنی ان کی بدمزاجی اور بدزبانی بڑھتی گئی، سندر سنگھ کی بے اعتنائی اور بے رخی بڑھی۔ وہ تو بس فرض نباہ رہے تھے ورنہ بیوی سے وہ ایسا کانپتے جیسے گائے قصائی سے۔ ذرا دیر کو کھانا کھانے اندر آتے۔ ماں سے دو چار باتیں کرتے اور پھر جلدی سے باہر نکل جاتے۔ اس پر ان کی بیوی اور بھی بگڑتیں۔ "انھیں تو میری صورت سے نفرت ہے۔ میرے سائے سے پناہ مانگتے ہیں۔ انھیں تو کوئی شوخ چنچل چاہیے تھی۔ وہ بھی کر لیں نا صدیق میاں کی طرح بڑھاپے میں دوسرا بیاہ۔"

جب سے صدیق حسن کا عقد ہوا تھا سیتا دیوی کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ضرور سندر سنگھ بھی کسی سے بیاہ رچائیں گے۔ ساس بہو میں بھی ہر وقت ٹھنی رہتی تھی۔ گھر کیا تھا اچھی خاصی رزم گاہ تھی۔ سندر سنگھ کا زیادہ وقت گاؤں کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ اب بھی سرپنچ اور

پردھان تھے۔ اور اب وہ گاؤں کے مسئلوں میں اور اس کی ترقی کی کوششوں میں واقعی دل و جان سے حصہ لیتے تھے۔ انھیں بار بار انوپم' گیتا اور ندیم کی یاد آتی۔ ہائے کیسے مخلص ساتھیوں کو انھوں نے یہاں سے نکلوا دیا۔ کیسے لوگوں کا اپمان کیا۔ اسی گناہ کی سزا تو اب وہ بھگت رہے ہیں۔ ان کا دل چاہتا کہ پھر گیتا یہاں آئے، پھر اس کا مرکز ان کے گھر میں کھلے، پھر میلے، ناٹک اور دلچسپ پروگرام ہوں اور اندر باہر زندگی کی لہر دوڑے۔ مگر کیسے؟ انھوں نے تو گھر آئی لچھمی کو لات ماری تھی ـــ ٹھنڈی سانس لیتے اور کہتے ؎

آرزو دل سے بنا کرتی ہیں تقدیریں کہیں؟

گیتا کی محبت اب پھر ان کے دل میں اسی زور شور سے اُبھر آئی تھی۔ وہ لتا اور تارا سے زیادہ انھیں یاد آتی۔ اپنی سختی اور بے انصافی پر کڑھتے۔ ہائے کتنا دل دکھایا انھوں نے اس بے ماں باپ کی بچی کا۔ جی چاہتا کہ وہ آئے اور وہ اسے سینے سے لگا کر خوب روئیں۔ مگر کبھی اتنی ہمت بھی نہ پڑی کہ حبیب میاں ہی سے اس کی خیریت پوچھوا لیتے۔

۱۱

حبیب میاں کو پہلے پرائیویٹ ڈاکٹروں نے دیکھا۔ انھیں کچھ کینسر کا شبہ تھا۔ صحیح تشخیص کے لئے سب کی رائے ہوئی کہ کینسر اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ حبیب میاں پریشان ضرور ہوں گے، مگر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ مگر صفیہ تو ان دس دن میں نیم جان ہوگئیں۔ سب انھیں سمجھاتے۔

ڈاکٹر تک تسلی دیتے کہ محض کینسر اسپتال میں داخلہ پریشانی کی بات نہیں یہ تو احتیاط کا تقاضا تھا۔ مگر کسی بات سے بھی انھیں تسکین نہ ہوتی۔ دن بھر حبیب میاں کے پاس اسپتال میں رہتیں اور رات ساری دعا مانگتے بیت جاتی۔ بس ایک ہی جملہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا اور ہونٹوں تک آتا۔ "مولیٰ انھیں اچھا کردے۔ ان کے بدلے چاہے تو میری جان لیلے"

اس دس دن میں انوپم نے حبیب میاں کی تیمارداری اور صفیہ کی دلداری میں دن رات ایک کر دیا۔ اسے نہ پڑھنے کا ہوش تھا، نہ امتحان کی فکر۔ میاں کو کوئی تکلیف نہ ہو، آپا کی پریشانی کسی طرح کم ہو۔ بس یہی دو فکریں تھیں۔ صفیہ کی ممتا اس کے لئے اور بڑھ گئی۔ سوچتیں ان کا کوئی جوان بیٹا ہوتا تو کیا اس سے زیادہ خدمت اور خیال کرتا جتنا انوپم کرتا ہے۔ ادھر ہریش چندر کا یہ حال تھا کہ بس نہ تھا کہ بھاوج کے پاؤں کے نیچے پلکیں بچھادیں، یا دوست کے لئے جان دیدیں۔ بمبئی کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور اسپتال میں ہر طرح کی آسانی اور آرام ان کی وجہ سے فراہم تھا۔ مگر صفیہ اس دل کمبخت کو کیا کرتیں جو کسی طرح نہ سمجھتا تھا نہ سنبھلتا تھا۔

دس دن میں سب معائنے وغیرہ ختم ہوگئے۔ امید تھی کہ دو ایک دن میں سب رپورٹیں آجائیں گی۔ حبیب میاں کی صحت پر اچھا اثر پڑرہا تھا۔ طبیعت بحال نظر آتی تھی اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ کینسر کا اندیشہ غلط ثابت ہوگا۔

حبیب میاں آج اجازت لے کر اپنے ایک دوست کو واچا نرسنگ ہوم میں دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ صفیہ ہریش چندر کے ہاں اپنے کمرے میں

کھڑکی کے سامنے بیٹھی بظاہر موجیں مارتے سمندر کے نظارے سے لطف اٹھا رہی تھیں. مگر دھیان کہیں اور تھا اور دل میں وہی دعا "یا اللہ تو ان کو اچھا کردے"۔

انوپم کمرے میں داخل ہوا تو صفیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ جب کوئی آتا وہ سمجھتیں کہ گیتا آئی ہے. بار بار انوپم سے پوچھتیں۔ "گیتا نہیں آئی؟" انوپم چور سا بن جاتا۔ اداسی میں چھٹیاں تھیں. بیلنے کے گھر جانے یا وہاں گیتا کو فون کرنے کو اس کا دل گوارا نہ کرتا تھا. بعض وقت سوچتا کہ بورڈنگ میں جا کر دیکھے، شاید گیتا واپس آگئی ہو۔ مگر واپس آتی تو یہاں ضرور آتی — مگر شاید بیمار ہو؟ لیکن اب تک اسے وہاں جانے کی فرصت نہ ملی تھی۔ آج پھر صفیہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا: "گیتا کا کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں آپا۔ میں بورڈنگ جا نہیں سکا"۔

"تو چلو انوپم — آج میں خود بورڈنگ چلتی ہوں — اس بے وفا — بے محبت — بے غیرت سے خود مل کر آتی ہوں جسے میاں کی خیریت تک پوچھنے کی توفیق نہیں ہوئی — اُف اللہ — دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے؟" بڑے دُکھ کے ساتھ انھوں نے کہا۔ لوگ یوں بھی بدل سکتے ہیں؟ محبت و خلوص کو یوں بھی ٹھکرایا جاتا ہے۔ اپنے یوں غیر بھی بن جاتے ہیں؟ یہ باتیں صفیہ جیسی حساس کے لئے سخت تکلیف دہ تھیں۔

انوپم ہچکچا رہا تھا۔ جانے گیتا وہاں ہوگی بھی یا نہیں؟ مگر — کالج تو کل ہی تھکل رہا ہے۔ ضرور اب تک وہ آگئی ہوگی۔ اور یہ سوچ کر

وہ صفیہ کو وہاں لے جانے پر راضی ہو گیا۔

گیتا کو بورڈنگ واپس آئے دو دن ہو چکے تھے۔ سارا بورڈنگ خالی تھا صرف دو مدراسی لڑکیاں تھیں جن سے گیتا کی کوئی دوستی نہ تھی۔ ایک بار وہ اسے دیکھنے آئیں مگر گیتا منھ لپیٹے پڑی رہی۔ "معاف کرنا میری طبیعت بہت خراب ہے۔" اس نے اکھڑے لہجے میں کہا تو وہ خفا ہو کر چلی گئیں۔ جب وہ کمرے سے نکلیں تو گیتا نے سُنا کہ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی۔ "شاید اس کی کوکو والا سے لڑائی ہو گئی ہے، اس نے گھر سے نکال دیا ہوگا۔"

گیتا نراش، بددل، دنیا سے بیزار اپنے پلنگ پر بھوکی پیاسی دو دن سے یونہی پڑی ہوئی تھی۔ اڑی ہوئی رنگت، بکھرے بال، سوجی آنکھیں (جو رونے سے نہیں نہ سونے سے سوج گئی تھیں) اس اڑتالیس گھنٹے میں ذرا دیر کو بھی تو اسے سکون نہ ملا تھا۔ نکی کی ذلیل حرکت نے اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی خودداری، عزتِ نفس، اس غرور و انانیت کو لیلا کے کمینے بھائی نے خاک میں ملا دیا تھا۔ آہ وہ کیا تھی ـــ کیا بننے آئی تھی ـــ اور کیا بن گئی؟ وہ ـــ وہ جسے اپنے پر ناز تھا ـــ جو سمجھتی تھی، کہ اس کی ایک عفت مآب نگاہ کی گرمی سیہ کار سے سیہ کار کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔ جسے یہ غرّہ تھا کہ کسی کی مجال نہیں کہ بیباک نظروں سے اس کی طرف تاک سکے ـــ جس نے ندیم کی کوئی گستاخ نظر برداشت نہ کی تھی ـــ اسی نازو غرور کے بل پہ تو اس نے خاندان سے، برادری سے اور سماج سے ٹکر لی تھی۔ وہ جس کی پاکدامنی کی سکندر پور قسم کھاتا تھا، جس کی حیا اور شرافت کا کملا نگر قائل تھا۔ جس کی مثال اپنا

زجس کو دیا کرتی تھیں ۔ وہ اس ۔۔ اس شیش محل میں ایسی چوندھیا گئی؟
اس عیش وعشرت کی زندگی سے اتنی مرعوب ہو گئی؟ ان تتلیوں اور بھونروں
میں اتنی کھوئی گئی کہ اپنے کو بھلا بیٹھی؟ اس نے اپنی خصوصیات کو خاک میں
ملا دیا ۔ اپنی انفرادیت چولہے میں جھونک دی ۔ اپنی شخصیت کو مسخ کر ڈالا
لیلےٰ جیسی لڑکی کی پرچھائیں بن کر رہ گئی ۔ نکی جیسے بدمعاش کی، بے جانے
بے سمجھے بوجھے ہی، اتنی ہمت افزائی کی کہ وہ اس کو تباہ کرنے پر تل گیا۔
اس نے اسے بھی کوئی ۔ کوئی ۔۔۔۔۔
یہ احساس اسے کچلے دے رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیا
سچ مچ وہ لیلےٰ کے خلوص اور محبت سے متاثر ہوئی تھی؟ اب تک اس نے
اپنے کو یہی دھوکا دیا تھا۔ مگر افسوس کہ اب دھوکے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔
پھر کس لئے؟ کس لئے اس نے اس سوسائٹی کو قبول کیا؟ کیوں لیلےٰ
کی دوستی کے جال میں پھنسی۔ سامانِ آرائش، اچھے کپڑوں اور زیوروں،
تھیٹر۔ فلم، پک نک، تفریح سیر تماشے کی خاطر؟ کیا نشاط و لاکی شان و
شوکت اور آرام وہ زندگی کے لئے اس نے اتنی بڑی قیمت ادا کی؟ آہ
کیا وہ اتنی عیش پسند، دولت پرست، نمود و نمائش کی دلدادہ ہے کہ
اس نے اپنی ذات کو داؤں پر لگا دیا؟
اسے آخر ہو کیا گیا تھا؟ لیلےٰ نے اس پر جادو کر دیا تھا۔ انوپم کی سچی پرخلوص
دوستی کو اس نے کس بری طرح ٹھکرا دیا اس بیہودہ لڑکی کی نمائشی وقتی دوستی پر۔
ہائے وہ اپنے بابا اور ماں کی سیرت اور وصیت کو بھلا بیٹھی۔ بابا کے آخری الفاظ
جیسے لوہے کی تپتی سلاخوں کی طرح اس کے دماغ میں سوراخ کر رہے تھے۔
"گیتا بیٹی ۔ میرے پاس دولت نہیں۔ پیسہ نہیں ۔ تجھے بے سہارا

چھوڑ رہا ہوں۔ مگر ہاں ایک دولت تجھے ورثے میں ضرور ملی ہے — وہ ہے اعلےٰ اخلاق اور اونچی سیرت! دنیا میں تجھے قدم قدم پر مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جانے کیسی کیسی کٹھنائیاں تجھے جھیلنی ہوں گی۔ مگر مجھے آشا ہے کہ میری بیٹی ہر مصیبت میں ثابت قدم رہے گی — تیرا باپ سوا اس نیک نامی کے جس کا اس نے عمر بھر پالن کیا ہے تیرے لئے کچھ اور نہیں چھوڑ رہا — میری جان — اس کی رکھشا کرنا تیرا فرض ہے۔ ایشور تیرا نگہبان رہے۔"

وہ — جوان کے ایک ایک لفظ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتی تھی سب کچھ اس چند ماہ میں بھول گئی۔ "اے ایشور میرے بابا کی آتما پر کیسی تکلیف گزری ہوگی"! اس نے زور سے سر کو پلنگ کی پٹی پر مارتے ہوئے کہا۔ "اسے آخر کیا ہو گیا تھا؟ لیلےٰ کی دوستی؟ اس کے خاندان سے راہ و رسم؟ اس کے بھائی سے میل جول — اس کی ہمت افزائی — کیسے ہو سکی اس سے؟ یہ ہمت افزائی نہیں تو کیا تھا؟ پہلے ہی دن جب اس نے خصوصیت کا اظہار کیا تھا تو منہ پر اس کے کیوں تھوک نہیں دیا؟ کیوں اس کی باتیں سنیں؟ بار بار اس گھر میں کیوں گئی — کرسمس پر اس کا تحفہ کیوں قبول کیا ... کیوں؟ کیوں؟

اس نے گھڑی میز پر سے اٹھائی اور زور سے دیوار پر دے ماری مگر پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔

"نہیں گیتا نہیں — ان باتوں سے کچھ نہ ہوگا — تو گر گئی — بدنام ہو گئی — اب سب تجھے ذلیل سمجھیں گے۔ آپا — میاں — انور — ندیم نرجس — ہریش چاچا کوئی تیرا منہ نہ دیکھے گا"۔ اس کا دل درد و غم سے

پھنسا جا رہا تھا۔ وہ بے کس ہے — اس کا کوئی نہیں — کوئی بھی نہیں۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن — مگر جو تھے — اس کے ہمدرد، دوست چاہنے والے — ان کو بھی تو اس نے چھوڑ دیا —

"آہ میں کتنی بدنصیب ہوں — آپا اور میاں اتنے دن سے بمبئی میں ہیں اور میں ان سے ملی تک نہیں۔ میاں بیمار ہیں — اور میں احسان فراموش سنگدل بے مروت انھیں دیکھنے تک نہ گئی — جن کی بدولت علم کا سرمایہ، عمل کی لگن مجھے ملی — جنھوں نے مجھے بچانے کے لئے بندوق کے سامنے اپنا سینہ تان دیا — وہ آپا جنھوں نے مجھے نرجس سے بڑھ کر چاہا۔ ماں کی محبت، بہن کی رفاقت اور دوستی کی نعمت دی — میں ان کے پاس نہ گئی بلکہ کھیل تماشے میں مگن رہی۔ نشاط دلا میں ناٹک کھیلنے کو میں نے ترجیح دی، اپنی عزت خاک میں ملانے کے لئے؟ آہ اگر ایشور کا کرم میرے حال پر نہ ہوتا تو تباہی میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ اگر میں جاگ نہ پڑتی.... اگر عین وقت پر میری طاقت و ہمت جواب دے جاتی؟"

وہ سر سے پیر تک لرزے کے مریض کی طرح کانپ رہی تھی "اے ایشور مجھ پر رحم کر۔ میرے من کو شانتی دے۔"

وہ بیقراری سے کمرے میں ٹہل رہی تھی کہ ملازمہ نے آ کر کہا۔ "ایک صاحب تم سے ملنے آیا ہے مس صاحب۔"

گیتا سوچ میں پڑ گئی۔ کون ہو گا۔ "انور ہم نہیں — وہ کیوں آئے گا۔ پھر سوا لکھنہ کے اندر کوئی جانتا بھی تو نہیں کہ میں یہاں ہوں۔" اس نے پلنگ سے ایک شال اٹھا کر اپنے بکھرے بالوں اور میلے کپڑوں کے گرد لپیٹ لی اور سیڑھیوں سے اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف بالکل خواب کے سے عالم میں

چل پڑی۔

بیچ کمرے میں کھنہ کھڑا منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گیتا کو آتے دیکھ کر وہ لپک کر آگے بڑھا۔ گیتا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، چہرہ سفید تھا اور آنکھیں پھیلی ہوئی۔ کھنہ نے اس کے بازو تھامے اور کوچ پر بٹھا دیا جہاں وہ گر سی پڑی۔ اس کا سر ہی نہیں سارا کمرہ گھومتا معلوم ہو رہا تھا۔

کھنہ نے اس کے برابر بیٹھ کر اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے لیا اور سہلانے لگا۔ جیسے تسلی دینے کے لئے لفظ نہ مل رہے ہوں۔ گیتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔ اتنے دن میں پہلی بار اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے۔ اور ان آنسوؤں نے جیسے اس کی جلتی آنکھوں اور سلگتے دل پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مار دیا۔ کتنا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دل کھول کر روتی رہی۔۔۔ کچھ دیر تک کھنہ خاموش بیٹھا رہا، اچھا ہے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

"تم نے یہ اپنا کیا حال بنا لیا ہے گیتا ڈارلنگ۔" جذبات سے بھرائی آواز میں آخر اس نے کہا۔

گیتا جواب نہ دے سکی۔ شدتِ گریہ اسے بولنے ہی نہ دیتی تھی۔ کھنہ کا معطر رومال تر بتر ہو چکا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیوں اتنی پریشان ہو؟ تم نردوش ہو۔ پاک اور معصوم ہو۔ یہ میں جانتا ہوں۔ اور کبھی کسی کو اس واقعہ کی خبر نہیں۔ اس مردود نے لوگوں سے یہی کہا کہ وہ نشے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔"

"تو وہ مرا نہیں بے ایمان۔" نفرت کے ساتھ گیتا نے کہا، اور کھنہ ہنس پڑا۔

"کتنی بھولی لڑکی ہے۔ بھلا تمہاری چند ٹھوکروں سے اس جیسا

دیوہیکل مرد مر سکتا ہے؟"

"کاش مر جاتا۔ پھر کسی پاکباز لڑکی کی معصومیت سے کھیلنے کی کوشش تو نہ کرتا؛" دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا کر گیتا نے کہا۔

"تم نے اسے ایسا سبق دیا ہے گیتا کہ اب اگر ذرا بھی غیرت ہے تو عمر بھر اسے یاد رکھے گا۔ مگر گیتا ڈارلنگ — اس دنیا میں صرف نکی ہی نہیں — اور بھی بہت سے بھیڑیے، درندے ہیں — تم اکیلی، ناتجربہ کار الھڑ لڑکی — کس کس سے مقابلہ کرو گی۔ کس کس سے بچو گی — یہ تو سوچو۔"

"آہ کھنہ — میں کیا کروں — کیا کروں" کراہ کر گیتا نے کہا۔ دنیا میں صرف وہی ایک اسے اپنا نظر آرہا تھا۔

"تم آخر گھبراتی کیوں ہو۔ تم پر کسی کو کوئی شبہ نہیں۔ نکی اب تمھاری طرف آنکھ اٹھانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا نہ لیلائے کو ہی ....."

"مجھے لیلا یا اس کے منحوس بھائی کی رتی بھر پروا نہیں کھنہ صاحب۔ میں تو یہ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی ہوں کہ اس ذلیل سوسائٹی میں میں گئی ہی کیوں تھی؟ آہ آپ کیا جانیں کہ میں کس باپ کی بیٹی ہوں — میں نے کن بلند سیرت لوگوں میں تربیت پائی ہے .... لوگ مجھے کیا سمجھتے تھے۔ اور اب — اور اب — میں کسی کو منھ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہی۔" گیتا کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ تم پاک ہو، معصوم ہو، نردوش ہو۔"

"کیا سچ مچ تم ایسا ہی سمجھتے ہو مجھے؟" بے اختیار گیتا پوچھ بیٹھی۔

"ہاں پیاری گیتا — تم میرے لئے دنیا کی سب سے پوتر، سب سے سندر سب سے پیاری ہستی ہو — میں تمھیں صرف تمھیں چاہتا ہوں۔ صرف تمھیں ہی

چاہا ہے۔ اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ اس دل میں تمہارے سوا کوئی نہیں اور کوئی نہیں۔۔۔"

کھنہ کا گرم گرم سانس گیتا کے ماتھے کو چھو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں جیسے کوئی امرت ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنے دھڑکتے دل کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیا تھا۔ اسے سہارا مل گیا۔ منزل مل گئی۔ ساتھی مل گیا۔

"گیتا میری جان۔ ہم کل ہی رجسٹرار آفس میں چل کر سول میرج کر لیں گے۔" کھنہ نے گیتا پر جھکتے ہوئے کہا" بولو منظور ہے۔"

گیتا بول نہ سکی۔ مگر اس کے ہاتھ کو ذرا سی جنبش ہوئی اور وہ کھنہ کے ہاتھ میں کھنہ کے ہونٹوں کی طرف بڑھا۔۔۔۔

دروازہ دھڑ سے کھلا۔ قہر مجسم بنی لیلے اجمشید جی کوکو والا کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کھنہ کے ہاتھ سے گیتا کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا جیسے کوئی سخت جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

مگر کیوں؟ گیتا حیرت سے دونوں کو باری باری دیکھ رہی تھی۔ لیلے اتنی برہم کیوں ہے؟ کھنہ اتنا سہم کیوں گیا ہے؟ وہ لیلے کا غلام نہیں۔ میں لیلے کی زر خرید نہیں۔ ہم دونوں کو اپنا جیون ساتھی چننے کا حق ہے۔ کھنہ نے مجھے پیام دیا ہے۔ کوئی گناہ نہیں کیا — خیر — یہ قصہ کیا ہے؟

"اوہ — آئی ایم سوری مس ورما۔" آخر لیلے نے اپنے پر اتنا قابو پا یا کہ بول سکے۔" ویری ساری۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ یہاں بورڈنگ میں روميو جولیٹ کھیل رہی ہیں کھنہ کے ساتھ۔" زہر میں بجھے طنزیہ انداز میں لیلے نے کہا۔ وہ دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے، کھنہ کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈالے کھڑی تھی۔ غصے میں اس کا سینہ زور زور سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔
اور گیتا نے دیکھا کہ کھنہ کی نظریں جھک گئیں اور پیشانی پر پسینہ آگیا۔
"ہاں مسٹر کھنہ — آپ کو تو معلوم نہ تھا کہ گیتا کہاں ہے! شاید اپنے گارجین کے ہاں چلی گئی۔ یہی بات تھی نا؟ اب بھی! نکی سے بچا کر تم یہاں اپنی معشوقہ کو لائے تھے کہ اکیلے میں گل چھرے اڑاؤ — بے وفا — کمینے ذلیل — تو نے ادھر مجھے دھوکا دیا اور ادھر یہاں اس سے ....."
شیرنی کی طرح بپھر کر گیتا کھڑی ہو گئی اور غضبناک لہجے میں بولی۔
"لیلے اپنے حواس میں رہو — اب اگر تم نے کوئی بیہودہ لفظ منہ سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا یہ سمجھ لو۔ تم جیسی خود ہو ویسا ہی کیرکٹرلس دوسروں کو سمجھتی ہو۔ مگر یاد رکھو — میں —"
"آہا بڑی کیرکٹر والی — نشاط ولا میں تیری حرکتیں مجھ سے چھپی تھیں کیا۔ ادھر نکی کو گھائل کیا ادھر کھنہ کو مجھ سے چھینا — اور بڑی پاکباز بنتی ہے..."
"اس بدمعاش کو تو ایسا سبق دے کر آئی ہوں کہ عمر بھر یاد رکھے گا کہ کسی شریف لڑکی کو چھیڑنے کی کیا سزا ہوتی ہے۔" گیتا نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔ اور یہ ہے کھنہ — وہ —"
"یہ ہے کھنہ — وہ" لیلے نے نقل اتارنے کے لہجے میں کہا: "یہ ہے کھنہ وہ میرے عاشق ہیں، میرے پرستار ہیں — میں ان پر جان دیتی ہوں — وہ مجھ پر فدا ہیں — کیوں؟"
"میں یہ سب کچھ نہیں جانتی۔ مگر کھنہ نے مجھ سے — یعنی وہ مجھ سے۔ یعنی ہم دونوں۔" گیتا نے مڑ کر کھنہ کی طرف دیکھا، اس امید پر کہ وہ لیلے کو پوری بات سمجھا دے۔ مگر وہ ان دونوں کی طرف سے پیٹھ موڑے کھڑی

کے باہر دیکھ رہا تھا۔

"ہماری بلی ہمیں سے میاؤں۔ میرے ٹکڑوں پر پلنے والی۔ میرا جھوٹا کھانے والی — مجھ سے ٹکر لینے چلی ہے بیچاری — مگر احمق — بے وقوف تو نہیں جانتی کس دھوکے میں ہے — کھنہ تیرا نہیں — میرا ہے —" کچھ اردو کچھ انگریزی میں، بھرے لہجے میں لیلیٰ نے گیتا سے کہا اور پھر کھنہ کے پاس جاکر زور سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے کچھ ناز، کچھ غصہ، کچھ تنبیہہ کے انداز میں بولی۔

" ڈارلنگ — بولتے کیوں نہیں — اس — اس عورت کو بتا دو نا — کہ تم — میرے — کہ میں تم — کہ میں — میں تمہارے ہونے والے بچے کی ماں ہوں —" اس نے بات طنز و غصے میں شروع کی تھی۔ مگر جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اپنی لاچاری اور بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے شعلے پانی میں بدل گئے اور رخساروں پر ٹپک آئے۔ وہ کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

گیتا کے دل میں ایک شعلہ بھڑکا — دماغ سے لپٹیں نکلیں — باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف پلٹی — مگر — یہ کیا؟

دروازے پر انوپم اور صفیہ جانے کب سے کھڑے تھے۔

صفیہ بیگم کے چہرے پر حیرت، غصہ، نفرت اور گہرے دکھ کی کچھ ایسی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انوپم کا چہرہ لاش کی طرح زرد اور بے حس تھا۔

گیتا سے آنکھیں چار ہوتے ہی صفیہ بیگم نے اپنی نظریں پھیر لیں۔ مڑیں۔ انوپم کا بازو دیکھ کر کھینچا — پھر پلٹیں — زور سے کمرے کے اندر تھوکا اور

تیزی سے سیڑھیوں سے اُتر گئیں۔

گیتا نے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ "آپا — آپا — آپا —" گھٹی ہوئی رندھی ہوئی، ٹوٹی ہوئی آواز میں منھ سے نکلا "آپا — نہ جاؤ —" دو قدم بڑھی — اور کھڑے قد سے زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

۱۲

"تم تو باؤلی ہو بھابی"۔ ہریش چندر نے ہنس کر کہا۔ "کتنا ہی سمجھاؤ مانتی ہی نہیں۔ کہتا تو ہوں کہ حبیب کو کینسر نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ سب ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے —"

"مگر میرے منھ میں خاک — تشخیص میں غلطی تو نہیں ہوئی —" صفیہ کی پریشانی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔

"وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ مگر سچ ہے۔ عشق است و ہزار بدگمانی — بس انھیں آرام کی اور پابندی سے دوا کھانے اور وقت پر کھانا کھانے کی ضرورت ہے اور کچھ نہیں۔"

"خدا کرے آپ سچ بول رہے ہوں۔ مجھے دھوکا نہ دیتے ہوں۔" کھوئے ہوئے لہجے میں صفیہ نے کہا۔ وہ اس بیس پچیس دن میں آدھی بھی نہ رہی تھیں اور رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

"وہ تو خیر ٹھیک ہیں اور ٹھیک رہیں گے مگر آپ ضرور بیمار ہو جائیں گی بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ مر جائیں گی"۔ غصّے اور تنبیہہ کے انداز میں ہریش چندر نے کہا۔

"آپ کے منھ میں گھی شکر۔ خدا ایسا ہی کرے اور میں ان کی بلا لیکر ختم ہو جاؤں۔" کس والہانہ انداز میں یہ جملہ انھوں نے کہا کہ ہریش چندر حیران رہ گئے۔

"آپ زندگی کو ایسی حقیر چیز سمجھتی ہیں کہ ہر وقت موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں؟"

"حقیر — نہیں بھیا — زندگی سے بڑھ کر پیاری اور دلکش چیز کیا ہو سکتی ہے۔ بھلا کسی ناکارہ یا حقیر چیز کی بھی قربانی دی جاتی ہے؟ اور اپنی عزیز ترین ہستی پر آدمی وہی چیز نچھاور کرتا ہے جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہو اور میرے پاس اپنی اس جان کے سوا اور کیا ہے؟" اور ہریش چندر ان کا منھ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب بھی خاکِ ہند سے ایسی ستی عورتیں پیدا ہوتی ہیں؟ ایشور اس دیس کی عورت کو کس مٹی سے بناتا ہے؟ کیسے وہ یوں ہنسی خوشی محبوب پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی ہے؟ وہ اتنے متاثر تھے کہ بڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے اگرچہ یہ خاموشی ان پر بہت بار تھی۔ آخر کچھ دیر میں انھیں ایک موضوع سوجھ ہی گیا۔ وہ کئی دن سے اس پر ضعیفہ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

"بھابی میری ایک بات مانیں گی؟"

"کیا؟"

"آپ سکندر پور جانے سے پہلے ایک بار — میری خاطر — گیتا سے مل لیجئے۔" انھوں نے رک رک کر کہا۔ حالات سے وہ بڑی حد تک واقف ہو چکے تھے اور دو بار گیتا سے جاکر مل بھی آئے تھے۔

"آپ کوئی اور حکم دیتے تو میں سر آنکھوں سے مانتی — مگر بھائی۔ اس ناہنجار لڑکی سے ملنے پر مجھے مجبور نہ کیجئے۔"

"انسان کو اتنا سخت دل نہیں ہونا چاہیئے۔"

"میں سخت دل سہی۔ مگر سوال سخت دلی یا نرم دلی کا نہیں اصول کا ہے میرے کچھ اخلاقی معیار ہیں۔ کچھ اصول ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ ایک ایسی لڑکی سے ظاہر داری کروں جس سے میں نفرت کرتی ہوں۔"

"یہ کیسے اخلاقی ستون آپ لوگوں نے تعمیر کر لئے ہیں جن کی بلندی کو کوئی چھو ہی نہیں سکتا؟ ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق زندگی بسر کرے۔ آپ کیوں یہ چاہتی ہیں۔ آپ کے اور دوسروں کے اصول اور معیار بالکل ایک سے ہوں؟" تیز لہجے میں ہرنش چندر نے کہا۔

"اور آپ کیوں یہ چاہتے ہیں کہ مجھے مجبور کریں کہ میں ایسے لوگوں سے تعلقات رکھوں جو میرے اصولوں سے متفق نہ ہوں۔ اس کے برعکس زندگی گزارتے ہوں؟" صفیہ نے بھی گرم ہو کر کہا۔

"میری سمجھ میں تمہارے یہ اصول نہیں آتے صفیہ بھابی کہ ذرا سا آدمی ان سے ادھر ادھر ہٹا اور آپ کی نظروں سے گر گیا۔ اصولوں میں بھی لچک ہونی چاہیئے۔"

"کیرکٹر کے معاملے میں میرے اصول بے لچک ہیں۔"

"جس میں لچک نہ ہو وہ چیز ٹوٹ جایا کرتی ہے۔"

"ممکن ہے۔ مگر اس سے پہلے تو میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ میرا ناز، میرا بھروسہ، میری محبت مجروح ہو چکی ہے۔ آپ بے چارے کیا جانیں کہ اس لڑکی کو میں کتنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی خاطر کیا کیا نہیں سہا، کیا کیا نہیں کیا — میں کوئی بدلہ نہیں چاہتی۔ احسان نہیں جتاتی — حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ مجھے اس سے محبت تھی اس لئے سب کچھ اس کیلئے

کرتی تھی۔ میں نے کیسی کیسی بدنامیاں اپنے پر اوڑھیں، اپنوں اور غیروں کی ملامت سہی مگر اس کے دل پر آنچ نہ آنے دی۔ میں نے تو جس سے زیادہ اسے چاہا ــــ اپنے پر دُکھ اٹھا کر، کٹھنائیاں جھیل کر اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ــــ اسے اس قابل بنانے کے لئے کہ دُنیا کہے کہ ہاں گیتا کیا سے کیا بن گئی۔ اور اس نے ــــ اور وہ ــــ" اور صفیہ یہ کہتے کہتے بے اختیار رو پڑیں۔

"مگر بھابی ــــ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ اس نے آخر ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے آپ اس سے اتنی بدگمان اتنی ناراض ہیں۔ وہ بمبئی کی نئی سوسائٹی سے تھوڑی سی متاثر ہوگئی، ذرا سیر تفریح کرنے لگی تو یہ کونسا جرم ہے؟ ہر نوجوان میں خود نمائی اور خود ستائی کے جراثیم ہوتے ہیں ــــ اور جب موقع ملے وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔"

"اپنی غیرت و خودداری کو تج کر؟ اپنی لاج بیچ کر؟" تلخی سے صفیہ نے پوچھا۔

"اب آپ نے تو طے کر لیا ہے کہ اس معصوم لڑکی سے بدگمان ہیں گی تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"معصوم؟ بدگمان!! خوب۔" طنز بھرے لہجے میں صفیہ کے منھ سے نکلا۔

"ہاں گیتا معصوم ہے، نردوش ہے، اور اس غم میں مری جا رہی ہے کہ آپ اس سے بدگمان ہوگئی ہیں۔ وہ جس پر اسے سب سے زیادہ وشواش تھا۔"

"اور مجھے جو اس پر بھروسہ تھا اس کا جنازہ نکالتے اسے لاج نہ آئی۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اسے کتنے مردوں سے عشق بازی کرتے دیکھا ہے۔" غصے میں وہ ایسے جملے کہہ گئیں جو کبھی حبیب میاں کے سامنے بھی نہ کہہ سکتی تھیں۔

"تو اس میں کونسا بڑا عیب تھا؟ خدا جانے آپ لوگ کس دُنیا میں رہتے

ہیں۔ یہ بمبئی ہے بھابی۔ سکندر پور یا کملا نگر نہیں۔ کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کر لینا کہ دُنیا کتنی بدل رہی ہے!"

"دُنیا کے بدلنے کے معنی یہ تو نہیں کہ غیرت و شرم، اخلاق اور سیرت سب کو خاک میں ملا دیا جائے؟"

"ارے کیا باتیں کرتی ہو۔ اس میں بے غیرتی کی کیا بات ہے۔ جب لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھیں گے، ساتھ اُٹھیں بیٹھیں گے، ملیں جلیں گے، تو قدرتی بات ہے کہ کسی کا کسی کی طرف میلان ضرور ہوگا۔ ایک دوسرے کی طرف کشش پیدا ہوگی۔ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ اسے آپ کیسے بدلیں گی؟"

"میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے فطری تقاضے پر" چیخ کر صفیہ نے کہا۔

"آپ کے لعنت کرنے سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ آپ لعنت بھیج رہی ہیں اس لئے کہ خود آپ کو ایسی صورت کبھی پیش نہیں آئی...."

مگر ان کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی صفیہ بگڑ چکی تھیں۔ "ہرش بھائی آپ نے مجھ سے اس قسم کی بات کہی تو میں بات نہیں کروں گی آپ سے۔"

"ارے ارے آپ تو بالکل نازک آبگینہ ہیں، بے بات چٹخنے پر تیار۔" مسکرا کر ہرش چندر نے کہا۔ "اچھا معاف کر دیجئے ــــ مگر ذرا دیر میری بات بھی تو سُن لیجئے ــــ آپ کیوں یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتیں بھابی کہ یہ دور ایک بحرانی دور ہے ــــ پرانی قدریں مٹ رہی ہیں ــــ نئی بن رہی ہیں ــــ مگر ابھی پوری طرح بن نہیں پائی ہیں۔ نئی نسل کے لئے یہ محال ہے کہ میرے اور آپ کے معیاروں کو اپنائے ــــ"

"مگر کیوں آخر؟ کچھ قدریں اٹل ہوتی ہیں، امر ہوتی ہیں جو کبھی نہیں بدلتیں۔" زور دے کر صفیہ نے کہا۔

ہرش چندر یوں ہنسے جیسے کوئی دانا بزرگ نادان بچے کی بات پر کھلکھلا پڑے۔

"ہائے ہائے یہ ذہنی کھلونے جو آپ جیسے معصوم بچے کھیلنے کیلئے بنا لیتے ہیں واقعی بڑا دکھ ہوتا ہوگا ان کے ٹوٹ جانے پر۔"

"آپ کو مذاق سوجھا ہے۔ آپ کیا جانیں میرے دل پر کیا بیت گئی۔"

ہرش چندر سنجیدگی سے بولے۔" بھابی یہ مذاق نہیں ہیں۔ اگر ہم لوگ سنجیدگی سے اس پر غور کریں تو یہ سمجھ جائیں گے کہ یہ زمانہ دوسرا ہے۔ کہنے کو ہم میں اور ہماری اولاد میں ایک نسل کا فرق ہے، مگر دنیا چند سال میں صدیوں کی چال چل گئی ہے۔ یہ ایٹم کا دور ہے، اسپوتنیک کا زمانہ ہے۔ یہ زمانے کی وہ نرم رو دھیمی دلکش چال نہیں جس کی دھمک انسان کو محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ یہ دوڑ بھاگ ہی کا نہیں اڑان ——— تیز ——— تیز تر اڑان کا زمانہ ہے۔ زمانہ کی چال سچ مچ محشر کی چال بن گئی ہے۔ دم دم میں ماحول بدلتا ہے، خیالات بدلتے ہیں، تصورات اور قدریں بدل رہی ہیں۔ آپ نے اور ہم نے جن اخلاقی اصولوں کے سائے میں اپنی جوانیاں بتائی ہیں، جن محفوظ چار دیواریوں میں زندگیاں کاٹی ہیں وہ ماحول اب خواب و خیال ہو گیا ہے۔ ہم اسی تنگ دائرے کو ساری کائنات سمجھے تھے۔ آج کا نوجوان جب زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کا میدان وسیع' بہت وسیع ہے۔ مگر ابھی اس کا دماغ ناپختہ اور ذہن ناتجربہ کار ہے۔ وہ اس سے ابھی پوری طرح آشنا نہیں ہو سکا۔ اس لئے اکثر وہ چندھیا جاتا ہے، ڈگمگا جاتا ہے ——— اس کی اس راہ میں کانٹے ہیں، پتھر ہیں، غار ہیں، درندے ہیں۔ اس کے لئے اس صحرائے حیات کو پار کرنا کتنا کٹھن ہوتا ہے یہ آپ نہیں سمجھ سکتیں۔"

"مضبوط سیرت والے اسے بھی کامیابی سے پار کر لیتے ہیں۔" صفیہ نے اسی یقین کے ساتھ کہا۔

"جی ہاں! ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

آپ لوگ جنھیں جذباتی طوفانوں سے سابقہ ہی نہیں پڑا ان مشکلوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اتنا تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ناگزیر صورتیں ہیں۔ جو نوجوان اس نئے ماحول میں رہیں گے، کارزارِ حیات کی کش مکش کا جنھیں سامنا کرنا ہوگا انھیں ایسی صورتیں پیش آ سکتی ہیں اور ہمیں انھیں گوارا کرنا ہوگا۔"

"میں بداخلاقی کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی۔"

"بداخلاقی! بداخلاقی!! آپ بداخلاقی کسے سمجھتی ہیں؟ کسی کو ذرا سا اپنے سے مختلف پاتے ہی اس پر بداخلاقی — یا صاف کہیے نا بدچلنی کا الزام لگا دینا — جانتی ہو بھابی خود کتنا بڑا اخلاقی جرم ہے...." ہریش چندر غصہ ور آدمی تھے اور بحث میں تو اور بھی جلدی بھڑک جاتے تھے۔ صفیہ سے کبھی کاہے کو کسی نے اس طرح باتیں کی تھیں۔ وہ حیرت و ناگواری سے انھیں دیکھتی رہ گئیں، مگر مروت کی وجہ سے غصے کا اظہار نہ کر پائیں۔

"بداخلاقی کی بھی ایک رہی!" وہ اسی طرح غصے میں کہے جا رہے تھے۔

"ایک نوعمر، ناتجربہ کار لڑکی آوارہ و بدمعاش لڑکوں سے اپنا دامنِ عصمت تار تار ہونے سے بچا لیتی ہے — یہ بداخلاقی ہے؟ ہر تحریص، ہر لالچ، ہر عیش و آرام کو ٹھکرا کر، اپنی جان پر کھیل کر اپنی عزت کا پالن کرتی ہے، یہ بداخلاقی ہے؟ عیش و ہوس کے سمندر کو پار کر کے بے داغ نکل آتی ہے اور بجائے

اس کی تعریف کرنے کے، اس کے اخلاق کی قسم کھانے کے اسے بدچلن کہتی ہیں؟ یہ کیسے اصول ہیں؟ کون سا فلسفہ ہے؟ کون سا اخلاق ہے.... اس نے بدمعاش نکی کو ایسا سبق دیا ہے کہ عمر بھر نہ بھولے گا اور کھنہ کو تو شرم کے مارے اس کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہو سکتی.... اور آپ۔"

اب اصل صورتِ حال صفیہ کی سمجھ میں آرہی تھی۔ رنج اور غصہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا اور دل کو عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اتنی جلدی اپنی ہار بھلا کون مان لیتا ہے۔ طنزیہ انداز میں بولیں۔

"تو آپ چاہتے ہیں کہ میں ان صاحبزادی کی خدمت میں حاضر ہو کر خراجِ تحسین و عقیدت پیش کروں اور اپنے قصور کی معافی مانگوں؟"

"نہیں — میں چاہتا ہوں آپ صرف ایک بار جا کر اسے گلے سے لگا لیجئے۔"

"میں جا کر اسے گلے سے لگا لوں؟ بہت مناسب۔ میں مہینہ بھر سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ پریشانی نے میری جان پر بنائے رکھی، مگر اسے یہ توفیق نہ ہوئی کہ مجھ سے ایک بار ملنے ہی کے لئے آجاتی۔ میاں اتنے سخت بیمار تھے۔ خدا نے اتنے بڑے خطرے سے انھیں بچایا — وہ جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر اس ناشکری کی جان بچائی تھی — مگر اس کا یہ جی نہ چاہا کہ آکر ان کو دیکھے ان سے ملے — وہ تو بقول آپ کے اس کٹھن راہ کو پار کرنے میں مبتلا تھی جس میں غار ہیں، درندے ہیں، سانپ ہیں، بچھو ہیں — نہیں۔ ہریش بھائی — میں اتنی عالی ظرف نہیں جس کے دل میں درد نہیں، محبت نہیں، وفا نہیں، معمولی مروت بھی نہیں — اس سے میرا کوئی ناتا نہیں —" صفیہ کی آواز میں بڑا دکھ تھا اور ہریش چندر

کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ عورت کا دل ہے جو بول رہا ہے۔ جس کی محبت کو ٹھکرایا جائے تو اسے بڑی کاری ضرب لگتی ہے۔

یالکونی کا دروازہ کھلا اور حبیب میاں اندر داخل ہوئے اور تمسخر اور طنز بھرے انداز میں بولے۔

"ہم سارے گھر میں تلاش کر آئے اور آپ دونوں کا پتہ نہ ملا۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہاں خلوت میں دیور بھاوج میں راز و نیاز ہو رہے ہیں۔" اور کھنکتا قہقہہ لگا کر وہ برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

صفیہ کے چہرے پر ایک دلکش تبسم ابھرا اور اتنی دیر کی ناگوار گفتگو نے چہرے پر جو کر ختگی پیدا کر دی تھی وہ آن کی آن میں غائب ہو گئی۔

"آؤ بھئی۔ مجھے تمھاری مدد ہی کی ضرورت تھی۔ اتنی دیر سے بھابی سے مغز کھپا رہا ہوں کہ گیتا کو معاف کر دیں مگر یہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ یار بڑی سخت دل بیوی ہے تیری۔" ہنس کر ہریش چندر نے کہا۔

"یہ اوپری خول ہے ہریش۔ اندر سے چھیلو گے تو نرم نرم گودا ہی پاؤ گے۔" انھوں نے ہنس کر صفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ اس دھوکے میں نہ رہیئے گا۔" صفیہ کو ان دونوں کی باتوں سے تمسخر کی بو آ رہی تھی۔

"ارے ہاں صفیہ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا تھا — وہ جو اسپتال میں میرا ریڈیالی جسبٹ تھا نا — ارے بھئی وہی لمبا سا خوبصورت ڈاکٹر من موہن — یہ اپنی گیتا کا منگیتر ہے ...."

"کون من موہن؟" صفیہ نے پوچھا۔

"گیتا کا منگیتر؟" ہریش چندر نے حیران ہو کر کہا۔ "تو کیا اس کی

منگنی ہو چکی ہے؟"

"جس نے میرے سب ایکسرے وغیرہ کئے تھے۔ یہاں وہ ایم۔ ایم کھنّہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"کھنّہ — کھنّہ؟ گیتا کا منگیتر؟" ایک ساتھ صفیہ اور ہریش کے منھ سے نکلا۔

"تو اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو خود کھنّہ کو بھی معلوم نہ تھا۔ ابھی حال ہی میں اسے بھی پتہ چلا ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی بھئی۔ بڑا ہونہار اور کارگزار نوجوان ہے۔ شریف اور صالح بھی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہُنھ شریف اور صالح!!" طنز سے صفیہ نے دہرایا۔

"تم کیا جانو اس کو؟" حبیب میاں نے ان کے انداز پر حیران ہو کر پوچھا۔

"حبیب تم نہیں جانتے وہ شریف و صالح نوجوان کن گنوں کا ہے۔" ہریش چندر نے کہا۔

"مگر — آخر — تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"اجی تم اپنی سوشل سروس کرو اور اسمبلی میں تقریریں جھاڑو۔ مُردم شناسی تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اس شریف نوجوان نے گیتا سے خوب پینگ بڑھائے۔ اسے دھوکے میں رکھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ اور شادی کا آفر کیا اور ادھر کوکو والا کی لڑکی لیلے سے — یعنی میرا مطلب ہے، بہت پہلے سے۔ ارے بھئی — سمجھتے کیوں نہیں بدھو۔ کہ — کہ — اس کے تعلقات تھے —" جھنجلا کر کسی نہ کسی طرح ہریش چندر نے جملہ پورا کیا۔ اگرچہ صفیہ کے لحاظ سے ناجائز کا لفظ وہ اپنے مُنھ سے

نہ نکال سکے۔

اور ابھی یہ لوگ اس شاک سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک بار پھر بالکونی کا دروازہ کھلا اور سب کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں۔

ململ کی سفید ساڑھی پہنے، سیدھی چوٹی کمر پہ بل کھاتی، دبلی پتلی ایک لڑکی دروازے میں کھڑی تھی۔ دراز سیاہ پلکوں کا سایہ زرد رخسار وں پر لرزرہا تھا اور پلکوں کی نوکوں پر شبنم کے قطرے کانپ رہے تھے۔

"ارے میری گیتا بیٹی!!" حبیب میاں نے اسی پیار، اسی خلوص، اسی شفقت بھرے لہجے میں کہا جس کی گیتا عادی تھی اور گیتا کا دل چاہا کہ زمین اگر پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے تو اس ندامت کے مقابلے میں بہتر ہے جو اس فرشتہ صفت آدمی کے سامنے اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔

"اخاہ۔ گیتا بی آئی ہیں؟" بڑی مشکل سے صفیہ اتنا کہہ سکیں۔ مگر لہجے میں نہ خلوص کا رس تھا نہ پیار کی جھنکار نہ اپنایت کی مٹھاس۔

گیتا کی پلکیں اُٹھیں اور دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے دیکھا کہ آواز جن جذبات سے خالی ہے۔ آنکھیں اور چہرہ ان کی غمازی کر رہے ہیں۔

اور وہ بیقرار ہو کر آگے بڑھی اور ان کی گود میں سر ڈال کر ہچکیاں لینے لگی۔ اس کا سر زور سے صفیہ نے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا اور پابوں پر ان کی آنکھوں کے موتیوں کی برکھا ہو رہی تھی۔

حبیب مسکرائے۔۔۔ مڑ کر ہریش چندر کو دیکھا اور بولے۔ "دیکھ لیا اس سخت دل عورت کو؟"

۱۳

حبیب میاں اور صفیہ بیگم سدھائے تو بہت سے لوگ انھیں اسٹیشن پہ پہنچوڑنے آئے تھے۔ انویم اور گیتا دونوں موجود تھے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کی طرف رخ نہیں کیا۔ گیتا صفیہ بیگم کے ساتھ ساتھ لگی رہی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں لہو کی بوٹیاں بن گئی تھیں۔ اور صفیہ بار بار اسے گلے لگا کر سمجھا رہی تھیں کہ آخر روکیوں رہی ہے؟ ایسا لگتا تھا کہ بیچ کا تلخ زمانہ بالکل بھلایا جاچکا ہے۔ گاڑی چلنے والی تھی کہ صفیہ مجمع میں سے ڈھونڈ کر انویم کے پاس گئیں اور بڑے پیار سے اسے گلے لگایا۔

"انّو ــــ تمھاری محبت اور خدمت کو کیسے بھولوں گی؟ مجھے اب یہ دکھ نہیں رہا کہ میرے کوئی جوان بیٹا نہیں۔" اور ان کے ساتھ ساتھ انویم کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔ کچھ دور کھڑی گیتا رشک اور ندامت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ ان دونوں کے محبت اور خلوص سے چمکتے چہروں کو دیکھتی رہی۔

امتحان سر پہ آچکا تھا، مگر تیاری خاک بھی نہ ہوئی تھی۔ انویم نے حبیب میاں کی خدمت میں کافی نقصان کر لیا تھا اور گیتا اپنی دلچسپیوں کی بدولت اپنا بہت سا قیمتی وقت گنوا چکی تھی۔ اب جو دونوں نے اپنے اپنے کام کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ اگر جان توڑ کوشش نہ کی گئی تو پاس ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ اور سب کچھ بھول جانے کی کوشش کر کے گیتا اور انویم

دونوں ہی پڑھائی میں جُٹ گئے۔

انوپم دن بھر فیلڈ ورک میں مصروف رہتا اور رات کو تین تین چار چار بجے تک پڑھنے میں محو۔ نیند آتی تو وہیں چٹائی پر لڑھک کر سو رہتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے شریمتی ہریش چندر کا، جنھیں خواہ مخواہ اس لاابالی نوجوان سے محبت ہوگئی تھی۔ رات کو ایک بار آکر وہ اسے چائے کی ایک پیالی پلا جاتیں اور ڈھائی، تین، چار جب بھی آنکھ کھلتی آکر اس کے کمرے کی روشنی بند کر کے دس پانچ باتیں سُنا جاتیں۔ "لڑکے تو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔ گاؤں میں ماں سُنے گی تو کیا کرے گی؟" ان کے کھُرے لہجے میں چھپی ہوئی مامتا کو کوئی اور سمجھ سکتا یا نہیں انوپم خوب محسوس کرتا تھا۔ صبح کو بھی وہ اسے ناشتہ کرا کے، نہلوا کر اور شیو کروا کر کالج بھیجتیں۔ ورنہ ان حضرت سے تو یہ بھی بعید نہ تھا کہ سکندر پور کی طرح یہاں بھی امتحان کے زمانے میں میلے کپڑوں، بکھرے بالوں اور بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ پہنچ جاتے اور وہاں ساتھیوں کی تضحیک کا نشانہ بنتے۔

اور اس طرح دن رات کام میں لگ کر انوپم سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا مگر ابھی تک پوری طرح کامیاب نہ ہوا تھا۔ دل میں ایک ایسی کھٹک تھی جیسے پھانس چبھ کر ٹوٹ جائے۔ لاکھ وہ پچھلے زمانے کی شیریں اور تلخ یادوں کو بھلاتا مگر جانے وہ ذہن کے کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھیں کہ ذرا سا موقع ملتے ہی پھر آموجود ہوتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کتاب کے حروف ناچتے ہوئے صفحے سے غائب ہو جاتے اور ایک کتابی چہرے کے نقوش اُبھر آتے۔ وہ مخموری سی غزالی آنکھوں اور شرمیلی مسکراہٹ کے سحر میں کھو جاتا۔ اور پھر اس کھوئی ہوئی جنت میں پہنچ جاتا جو صرف آٹھ دس ہفتے کے لئے اس کو

نصیب ہوئی تھی۔

مگر ایک دم ذہن کو جھٹکا سا لگتا۔ گیتا کی صورت لیلے کی سی بن جاتی۔ وہی ناز و انداز، وہی حسن و فیشن کی نمائش، وہی بیباک نظریں اور مصنوعی مسکراہٹ — نہیں نہیں — نہیں — اس کا دل چیخ اٹھتا۔ یہ گیتا نہیں یہ تو لیلے کا سایہ ہے۔ اس کا تابع مہمل — اس کی گیتا؟ وہ تو مر چکی۔ فضا میں غائب ہو گئی، اُفق کے اس پار کھو گئی۔۔۔

پھر گیتا اور لیلے کے کندھوں کے پیچھے دو لمبے تڑنگے شاندار سائے اُبھرتے — جن کے عفریت کے سے ڈراؤنے چہرے اور گھناؤنے قہقہے انوپم کو غصے سے بے قابو کرنے لگتے — ان کی آنکھوں میں تحقیر کی چنگاریاں، تمسخر کا زہر، نفرت کی لپٹیں اور ہوس کے بھڑکتے شعلے انوپم کو نرک میں پہنچا دیتے۔۔۔۔۔

اور جب وہ اپنے ہوش میں آتا تو دیکھتا کہ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہے۔ سر بھاری آنکھیں سرخ اور دل کی دھڑکن بے حد تیز۔ جیسے کوئی اپنے زبردست دشمن سے مقابلے کے بعد ہانپتا ہو۔ انوپم جانتا تھا کہ یہ دشمن اس کا نفس ہے جو اسے ستاتا رہتا ہے۔ اپنی ذلت اور اپنی پاک اور بے غرض محبت کی توہین اس کے دماغ میں برمے کی طرح سوراخ کرتی رہتی تھی۔ مگر یہ کیفیت کبھی کبھی راتوں کی تنہائی میں ہوتی جب اس کے کھنچے ہوئے اعصاب اور تھکا ہوا دماغ پڑھنے کے قابل نہ رہتے۔ ورنہ ویسے وہ اپنے علمی اور دماغی کاموں میں مصروف رہ کر ساری باتوں کو بھلائے رکھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جن کو دکھ، محرومی اور ناکامی، مقصد کی اور زیادہ لگن پیدا کرتی اور، اور زیادہ کام پر اُبھارتی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ میں گیتا اور انوپم اب بالکل دو اجنبیوں کی طرح رہتے
آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو گیتا کترا کر نکل جاتی یا انوپم نظریں جھکا کر دوسری
طرف مڑ جاتا۔ ان کے ساتھی سوچتے کہ آخر ان دونوں کو ہوا کیا ہے۔ وہ
اشارے کرتے فقرے کستے مگر ان پتھروں پر جونک نہ لگتی دیکھ کر وہ خود ہی
کھسیا جاتے۔ ایسی بھی کیا لڑائی ؟

ہاں گیتا اور لیلے کی لڑائی کا سوا دو ایک سہیلیوں کے کسی کو اندازہ
نہ ہوا۔ لیلے بیمار ہے اور اس لئے اس نے تعلیم چھوڑ دی ہے اور تبدیلِ
آب و ہوا کے لئے کہیں باہر چلی گئی ہے۔ یہ خبر کرسمس کی چھٹیوں کے بعد
کالج میں گشت کرنے لگی تھی۔ لوگوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اب لیلے کو گیتا سے
دلچسپی باقی نہیں رہی۔ امیر سہیلیاں بنانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ لڑکے
تو خیر ایک آدھ بار اس مسئلے پر بات کر کے بھول بھال گئے مگر لڑکیاں
اب بھی اس پر گیتا کا مذاق اُڑانے، پھبتیاں کسنے اور فقرے چست
کرنے سے نہ چوکتی تھیں، مگر گیتا ایسی بن گئی تھی جیسے بے حس پتھر ہو
جو کچھ جانتا اور سمجھتا ہی نہیں۔ اس نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ان سب
ناگوار باتوں کو سہارنا پڑے گا اور اپنی تعلیم کی خاطر وہ یہ سب جھیل رہی تھی۔
دن رات محنت کرتی۔ اگر فرسٹ کلاس نہیں تو سیکنڈ ڈویژن میں تو پاس
ہونا ہی ہے ورنہ وہ کہیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ کام کا بہانہ کر کے
اس نے ہر جگہ آنا جانا، ملنا جلنا، سیر تفریح سب کچھ چھوڑ دی تھی۔ بس
ایک ہریش چندر تھے جو ہفتے میں ایک آدھ بار آکر ضرور اس سے مل جاتے
اور اس کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے رہتے۔ وہ دیکھ رہے تھے
کہ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں جسم کی ہڈیاں نکل آئی ہیں اور

رنگ سفید ہو گیا ہے۔

گیتا اس وقت اسی ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی جب آدمی ہر کسی سے بدگمان اور بیزار ہو جاتا ہے۔ لیلےٰ، نکی، کھنہ اور ان کے حلقے کے لوگوں کا کیا ذکر اسے صفیہ بیگم، حبیب میاں اور ہریش چندر تک پر اعتماد نہ رہا تھا۔ دنیا سے بیزاری، لوگوں سے بدگمانی، اپنے پر رحم اور جو ہوا اُس کا پچھتاوا اس کو پیسے ڈالے رہا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے امتحان کی فکر کا کہ یہ کیفیت اس پر مستقل مسلط نہیں ہوئی تھی۔ وہ بار بار اپنے کو سمجھاتی کہ اچھے نمبروں میں امتحان کی کامیابی ہی اس وقت اس کا مقصدِ حیات ہے اور سب باتیں، سب لوگ بے حقیقت ہیں۔

سارے دکھوں اور غموں کا مرہم اس نے امتحان کی تیاری میں ڈھونڈ لیا تھا۔ کھنہ کی ریاکاری کی یاد بھی کبھی کبھار ہی آتی۔ کھنہ اور لیلےٰ کے "اینگیجمنٹ" کی خبر اسے مل چکی تھی اور یہ بھی وہ سن چکی تھی کہ وہ دونوں کشمیر گئے ہیں۔ لیلےٰ کی صحت کی بحالی کے بعد، جب وہ واپس آئیں گے تو شادی ہو جائے گی لیکن ان دونوں کے خیال کے ساتھ اسے رقابت یا جلن یا محبت کی ناکامی کی کسک کیوں محسوس نہیں ہوتی؟ یہ وہ نہیں جانتی۔ ہاں ایک بے بس غصے کی آگ ضرور اس کے سینے میں بھڑک اٹھتی ــــ وہ غصہ جو دوسرے سے زیادہ اپنے اوپر ہوتا ہے۔ وہ آگ جو دوسرے کو نہیں صرف اپنے دل کو جلاتی ہے۔

لیکن انوپم کی بے رخی اور بے اعتنائی کا ردیہ سب سے زیادہ اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ لیکن وہ چاہنے پر بھی اس پر غصہ نہ کر سکی۔ آخر کس بات پر غصہ کرے؟ کس بات کا اسے الزام دے؟ وہ جس نے اپنی دوستی کی توہین خاموشی سے برداشت کر لی۔ جس کے خلوص کو اس نے ٹھکرایا اور چپ چاپ

سامنے سے ہٹ گیا جس نے ایک لفظ ملامت کا نہیں کہا، ایک حرف شکایت
کا منھ سے نہیں نکالا۔ ایک نظر غصے یا نفرت کی اس پر نہیں ڈالی۔ آخر وہ
کس بات کا دوش دے سکتی ہے اُسے؟

"ہائے انویم! میں کتنی بدنصیب ہوں ——— میرے کرموں کی اس سے
بڑی سزا اور کیا ہوگی کہ میں نے تم جیسا دوست کھو دیا۔ تم میری کتنی عزت،
کتنی مدد، کتنا خیال کرتے تھے ——— سچ ہی کیوں نہ کہوں ——— کہ مجھ سے
تمھیں کتنی محبت تھی ——— کتنی پوتر ——— کتنی معصوم محبت، جس میں نفسانی آلائشیں
نہ تھیں۔ جذباتی شدت نہ تھی ——— بے باک نظریں نہ تھیں، مصنوعی تعریفیں
نہ تھیں ——— ہائے اس بے غرض، انمول محبت کو مجھ ابھاگن نے نہ پہچانا۔
اور مصنوعی انسانوں کی جھوٹی باتوں میں کھو گئی۔

"اور اب ——— اب تو وہ میری طرف دیکھتے بھی نہیں ——— کبھی میں
ان کی نظر میں کتنی اونچی تھی۔ اب اتنی گر گئی ہوں کہ ایک بات کرنے کے
قابل بھی نہیں سمجھتے۔ ہائے انویم تم نے کبھی پوچھا تو ہوتا ——— میری صفائی
تو سنی ہوتی ——— تم نے بُرا بھلا کہا ہوتا، طعن طنز کئے ہوتے ——— مگر یہ
بے رُخی ——— یہ بے پروائی ——— اس سے بڑھی تذلیل تم اور کیا کر سکتے ہو۔
تم دکھانا چاہتے ہو کہ تم مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے جس سے ایک بات
بھی کی جا سکے۔ جس کا ذرا سا خیال بھی ذہن میں آئے ——— آہ ——— کتنے
کٹھور ——— کتنے ظالم ——— کتنے بے درد ہو تم ———"

وہ دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا کر اپنے وجود کو بغیر بہائے آنسوؤں
میں ڈبو دیتی۔ آہ کب تک وہ غصے اور ندامت کی اس بھٹی میں سُلگتی
رہے گی؟ ناکردہ گناہوں کی یہ سزا کب تک اسے بھگتنی پڑے گی؟

اسے کون بتاتا کہ انسان کی شخصیت تجربوں ہی سے بنتی ہے۔ کون سمجھاتا کہ یہی پچھتاوے سیرت کے سونے کو کندن بناتے ہیں، یہی خودنگری مضبوط سیرت اور بلند اخلاق اور دلکش شخصیت کی ضامن بن سکتی ہے۔

۱۴

شادی کی تقریب کون سی ایسی انوکھی بات ہے جس پر ہر ایک اتنا خوش اور پرجوش نظر آنے لگتا ہے؟ یہ صدیق حسن کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چالیس کروڑ کی آبادی کے اس مہان دیس میں خیر سے نہ شادیوں کی کمی ہے نہ بال بچوں کی پیداوار کی۔ پھر آخر نئی شادی میں لوگوں کو نرالی مسرت کیوں ہوتی ہے۔ اور خالدہ کی شادی میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ خاندان ہی نہیں سارے گاؤں میں ہنگامہ ہے۔ جو ہے وہ چلا آرہا ہے مبارکباد دینے۔ اپنی خدمات پیش کرنے اور مفید مشورے عطا کرنے کے لئے۔ دور دور کے عزیزوں نے ابھی سے آنا شروع کر دیا تھا جن میں عورتوں اور بچوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان میں سے بہت سے رشتے دار ایسے تھے، جن سے خالدہ اور کلو تو کیا خود صدیق حسن اور سکینہ بھی کم ہی واقف تھے۔ صدیق حسن نے سوچا تھا کہ ہزار ایک روپے میں شادی ہو جائے گی۔ برتن، زیور اور بہت سا کپڑا تو گھر ہی سے نکل آیا تھا۔ بس اوپر کے خرچوں کے لئے اتنا بہت کافی ہے۔ مگر حال یہ تھا کہ ہزار سے زیادہ تو شادی سے پہلے ہی خرچ کر چکے تھے۔ اور ابھی سارا کام ہونا باقی تھا۔ بچارے نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے روپیہ لیا، ایک دو دوستوں سے قرض لیا اور اب زمین کا ایک ٹکڑا

بیچنے کی بات کر رہے تھے ۔ پھر بھی عزیزوں اور مہمانوں کا خیال تھا کہ وہ کنجوس ہیں ۔ دو ہی تو بیٹیاں ہیں ۔ ان کے بیاہ پر بھی جی کھول کر خرچ نہ کیا تو کیا ساتھ لے جائیں گے یہ ساری دولت ؟ اور صدیق حسن اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتے ۔ لوگوں کو اپنا حسن اور دوسرے کی دولت کتنی زیادہ نظر آتی ہے ۔

ادھر گاؤں کے لوگ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے ۔ صدیق میاں کے ہاں پہلے پہل بیاہ ہے ۔ پرانے زمیندار ٹھہرے ۔ جذباتی لگاؤ بھی ابھی تک باقی تھا ۔ پھر گزشتہ دو سال میں صدیق حسن نے گاؤں والوں کے ساتھ جو محبت ، یگانگت اور انصاف کا برتاؤ کیا تھا اس نے ان کی عزت بہت بڑھا دی تھی اور خیر خالدہ تو گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں میں ہمیشہ سے بہت ہر دلعزیز تھی ۔ اور رات کو بارہ ایک بجے تک گاؤں والیاں سہرے سہاگ گاتی رہتیں اور دن میں بھی کسی نہ کسی کام کے بہانے یہاں کا پھیرا لگا جاتیں ۔ ادھر اپنے زیوروں اور کپڑوں کی اس سے پہلے انھیں اتنی فکر نہ ہوئی تھی ۔ روز کسی نہ کسی گھر میں میاں یا ساس سسر سے جھگڑا چھڑ جاتا ۔ کسی کو نیا جوڑا چاہیے ، کسی کو "گلاس نی لون" یا "شیفون" کی ساڑھی یا دوپٹہ چاہیے ۔ زیور اجلوائے جا رہے تھے ، دوپٹوں پر جھوٹے سچے لچکے ٹانکے جا رہے تھے ۔ پھندنے دار چٹیاں اور بالوں میں لگانے کے رنگین پھولدار کلپ ، سستی سستی ہونٹوں کی سرخی اور ناخنوں کی لالی کی فرمائشیں بڑھتی جا رہی تھیں ۔ میاں چاہے قرض لے یا ادھار پر ایسا موقع روز روز تھوڑی آتا ہے ۔ شہر سے بارات آئے گی ، نئے نئے فیشن والیاں ہوں گی ۔ وہ بھی کیوں نہ سج بن کر جاویں ۔

سکینہ کو کاموں سے زیادہ مہمان داری نے بولا دیا تھا ۔ ان کو خالدہ

کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ زندگی میں انھیں کون سی خوشی کبھی دیکھنی نصیب
ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا زندگی بھر کے سارے ارمان اس شادی میں نکال
ڈالیں۔ جو بھی ان کا بچا کھچا زیور تھا اسے تڑوا کر نئے فیشن کے زیور بنوائے۔
اپنا کپڑا اور برتن سب بیچ کر نئے خریدے۔ "نوج یہ منحوس چیزیں میری
بچی برتے۔" کوئی منع کرتا کہ ایسا عمدہ سامان کوڑیوں کے مول بیچنے کی
جگہ ٹھیک کرا کے خالدہ کو دیدو تو وہ بگڑ کر یہ جواب دیتیں۔ مگر خوش انتظامی
اور سلیقے سے شادی کرنے کی حسرت پوری ہوتی نظر نہ آرہی تھی۔ دور پرے
کے جو عزیز جمع ہو چکے تھے انھوں نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ خیر خرچ اور
ان کی خاطر داریاں اور ناز برداریاں تو اٹھانی ہی تھیں۔ یہ تاوان تو ہر
لڑکی کی ماں بہن کو بھرنا ہی پڑتا ہے ــــ مگر وہاں تو خود سکینہ بیگم کی ذات مستقل
موضوعِ گفتگو بنی ہوئی تھی۔ پہلے شوہر سے طلاق، صدیق حسن سے نکاحِ ثانی،
سوتیلی لڑکیوں سے محبت کا ڈھونگ، ان کی ہر بات قابلِ اعتراض تھی۔ کوئی
ڈھکے چھپے باتوں باتوں میں سناتیں۔ کوئی منھ در منھ طعن طنز کرتیں۔ سکینہ بیگم
جیسی رکھ رکھاؤ والی عورت کے لئے یہ باتیں حد سے زیادہ تکلیف دہ اور
ناقابلِ برداشت تھیں مگر کرتیں کیا۔ گھر آئے مہمانوں کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی
تھیں۔ صدیق حسن نے کئی بار کہا۔ "تم دبتی کیوں ہو؟ منھ توڑ جواب دیا کرو۔"
مگر سکینہ ایسا نہ کر سکیں۔ ہاں ساجو ضرور ان کی سپر بن گئی تھی۔ یوں تو
خیر وہ مہینوں سے ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور ہر چیز میں اس کا مشورہ
شامل تھا مگر اس وقت تو وہ سکینہ بیگم کی پوری اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی، بلکہ
سکینہ سے زیادہ اس کا حکم گھر پر چل رہا تھا۔ جاہل اور پھکڑ قسم کی عورتوں کے
سکینہ پر یہ رکیک حملے وہ بھلا کیوں برداشت کرتی! سکینہ خاموشی سے منھ

دیکھ کر چپ ہو جاتیں مگر ساجو ایسا کٹتا ہوا جملہ کہتی کہ اعتراض کرنے والیاں اپنا سا منھ لیکر رہ جاتیں۔ ساجو کا گھر میں اتنا عمل دخل اور اس کی سکینہ اور خالدہ سے دوستی ان عالی نسب اونچے گھرانے کی خواتین کے لیئے ایک اور اہم موضوع گفتگو تھا۔ بھلا اس "نیچ ذات" "رذیل عورت" کے منھ وہ کیا لگیں۔

"اوئی بوا — پاؤں کی جوتی سر کو آئی ہے۔"

"اے ہے جیسی روح ویسے فرشتے — دوستی بھی کی تو کس سے؟"

"اوئی، اب کیا یہ کمینیاں ہمارے برابر بیٹھیں گی؟"

رسی جل گئی تھی، خاک نہ رہا تھا، نہ زمینیں نہ جائدادیں، نہ روپیہ نہ رعب وشان۔ مگر بل ابھی باقی تھے۔ بھلا ان عالی نسب سیدانیوں کی اور پرجا کی عورتوں کی کیا برابری؟ مگر ساجو کا رکھ رکھاؤ، اس کی گھر ہی میں نہیں اور گاؤں بھر میں عزت اور اثر دیکھ کر یہ معزز خواتین اندر ہی اندر گھٹ کر اور آپس میں برا بھلا کہہ کر ہی رہ جاتیں۔ ساجو کے منھ پر اسے کہنے کی کسی کی ہمت نہ تھی۔ ہاں سکینہ بیگم پر تان ٹوٹتی رہتی تھی۔

مگر خالدہ بانو اندر اور باہر کے ہنگاموں سے بے نیاز اپنے من کی دنیا میں ڈوبی رہتی۔ ساجو کام کرتے کرتے آتی اور اس سے چھیڑ چھاڑ کر جاتی۔ تارا اور لتا جو اپنی سسرالوں سے شادی میں شرکت کے لئے آئی ہوئی تھیں زیادہ وقت اسی کے پاس گزارتیں، طرح طرح سے اُسے چھیڑتیں، بناتیں، رشتے دار لڑکیاں جن میں سے اکثر کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا طرح طرح سے اس پر فقرے کستیں۔ اس سے پریم ومحبت کرنے کے طریقے پوچھتیں۔

"بہن ہمیں بھی تو بتا دو — کیسے شکار کیا جاتا ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہتیں۔ "دیکھنے میں تو بڑی بھولی لگتی ہو۔" اس لئے کہ اس "بھولی" کے

"عشق" کی جانے کیسی کیسی داستانیں انھوں نے سُنی تھیں۔ دیکھنے میں کیسی بے زبان اور شرمیلی لگتی ہے بیچاری۔ خدا بچائے ان پڑھی لکھی لڑکیوں سے۔ وہ آپس میں کھسر پُسر کرتیں۔ مگر خالدہ کسی ایک بات کا بھی جواب نہ دیتی تھی۔ شاید سنتی بھی نہ تھی۔

سکینہ بیگم اِدھر اُدھر سے کام کرتی آتیں اور اسے پیار کر جاتیں۔ بڑی اماں پاس بیٹھ کر اکثر پوپلے منھ سے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتیں۔ ابن میاں جب کھانا کھانے آتے پورے وقت بڑبڑاتے رہتے۔ "لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول بات ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ لڑکیاں کمبخت پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں؟ کیا خوب صاحب — اپنی لڑکی کسی اور کے حوالے کر دو — کیوں کر دو۔۔ وہ مردود آئے تو — صورت نہ دیکھوں گا اس کی —" اور ساتھ میں دو چار فصیح گالیاں۔ بڑی اماں کبھی سمجھاتیں، کبھی لتاڑتیں۔ "بالکل ہی سترے بہترے ہو گئے ہو ابن۔ لڑکی تو بادشاہوں نے بھی نہیں بٹھائی، تم کیا کھا کے بٹھاؤ گے۔" دوسری عورتیں منھ چھپا چھپا کر ان کی باتوں پر ہنستیں۔ مگر سکینہ جانتی تھیں کہ یہ خلن کی محبت اور جدائی کا احساس ہے جس نے انھیں آج کل اور زیادہ تند مزاج بنا دیا ہے۔ ادھر خلن جب باپ دادا کی آواز سنتی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں اس طرح جاری ہو جاتیں کہ ہاتھ میں کشیدہ یا سلائی کی جو بھی چیز ہوتی تر بتر ہو جاتی۔

شادی کیسے طے ہوئی؟ کس نے کی؟ یہ وہ نہیں جانتی۔ بس اس کے لئے اتنا کافی ہے کہ اب وہ انھیں دل بھر کر دیکھ سکے گی۔ ان کی خدمت کر سکے گی۔ ان کے پاس رہے گی۔

"مگر وہ خود؟ کیا وہ خوش ہیں؟ مجھے پسند کریں گے؟ میں اُن کے

معیار پر کیسے پوری اتروں گی؟ وہ گیتا دیوی جیسی علم وحسن کی دیوی کی پوجا کرتے تھے — بھلا کہاں وہ اور کہاں میں؟ وہ مجھے کیسے چاہیں گے؟" پانی کے بلبلوں کی طرح یہ وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے رہتے۔ مگر پھر خود ہی اپنے کو ڈھارس دیتی۔" وہ چاہیں یا نہ چاہیں — پر میں تو اپنی ساری محبت، ساری عقیدت ان کے قدموں پر نچھاور کرنے کا حق پالوں گی۔ میری سیوا، میرا پریم، میری پوجا کہاں تک ان کے پتھر دل کو نہ پگھلائے گی۔ سچی محبت تو فولاد کو موم کر دیتی ہے — وہ تو انسان ہیں آخر —" اور اعتماد سے بھرپور مسکراہٹ اس کے کمان جیسے ہونٹوں پر اُبھرتی اور آنکھوں میں پُراسرار سی چمک پیدا ہو جاتی۔

موتی بیگم کا آج کل عجیب حال تھا۔ اس تین سال میں اس نے خوب قدوقامت اور رنگ روغن نکال لیا تھا۔ اس کے لمبے چھریرے جسم میں نوخیز پودے کی سی لچک اور ادھ پکے پھل کا سا گداز پیدا ہو چلا تھا۔ سانولے رنگ میں صحت مند خون کی سرخی نے بڑی دلکشی پیدا کر دی تھی اور مزاج میں بچپن کے کھلنڈرے پن کی جگہ تھوڑی سی سنجیدگی پیدا ہو چلی تھی۔ ویسے بھی اس زمانے میں اس نے بہت ترقی کی تھی۔ اب وہ ہندی اور اردو فرفر پڑھتی۔ تاریخ، جغرافیہ اور حساب بھی خاصا سیکھ لیا تھا۔ انگریزی میں بھی شُد بُد ہو گئی تھی — وہ بے حد محنتی اور کافی ذہین تھی۔ اور خالدہ کے کہنے سننے سے صدیق حسن اس پر رضامند ہو گئے تھے کہ اگلے سال اُسے علی گڑھ یونیورسٹی کے گرلز اسکول میں داخل کرا دیں گے۔ اس خبر سے وہ بہت خوش تھی مگر بہن کی جدائی کا احساس اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ اتنا کہ خوبصورت ریشمی جوڑوں اور نئے زیوروں کی مسرت بھی اس کے نیچے دب گئی تھی۔ وہ جب خالدہ کے

پاس آتی تو اس کی کالی آنکھوں میں آنسو یوں جھلملاتے نظر آتے جیسے نرگس کی پتی پر اوس کے موتی ۔ وہ خالدہ کا زرد دوپٹہ اپنی انگلیوں پر لپیٹنے لگتی۔ اور خالدہ اپنے تخیل کی دُنیا سے واپس آجاتی ۔ اور سب بھول جاتی ۔ ندیم کی محبت، دل کی مرادیں بر آنے کی مسرت۔ کلیجے میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ درد جدائی کی تیز لہر دل کے پار ہو جاتی ۔ "کلو مجھ سے چھٹ گئی ـــ اور ابا ـــ اور امی ـــ اور گھر ـــ اور سب لوگ ـــ سب پرائے ہو جائیں گے ـــ" وہ بہن کو کھینچ کر کلیجے سے لگا لیتی اور دونوں بہنیں یوں ساون بھادوں کی سی جھڑی لگا دیتیں کہ کھڑا بیٹھا سب آبدیدہ ہو جاتے ۔

یہاں تو گھر پھونک تماشا دیکھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر ندیم اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ شادی انتہائی سادگی سے ہو۔ چند سو روپے اس نے کسی نہ کسی طرح پس انداز کئے تھے ۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ شادی کے بعد خالدہ کو لے کر مسوری یا نینی تال چلا جائے اور یہ رنگین اور بہترین دور ـــ جو ہر انسان کی زندگی میں صرف ایک بار آتا ہے ـــ کسی حسین و رومانی جگہ گزارے ۔ اس نے صدیق حسن کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ میں نہ کپڑا لاؤں گا نہ زیور نہ اور کچھ۔ صفیہ نے بہت سمجھایا کہ ارے چار جوڑے اور دو زیور تو بنوا لے سسرال میں منہ دکھانے کے قابل بھی رکھے گا یا نہیں مگر ندیم اپنی بات جما رہا۔ "وہ لوگ شادی مجھ سے کر رہے ہیں یا زیور اور کپڑے سے ـــ میں اصولاً اس سودے بازی کے خلاف ہوں آپا ۔ خود کچھ لینا چاہتا ہوں نہ لے جانا ۔" صفیہ خود ہی کچھ کرتیں مگر ایک تو جب سے وہ بمبئی سے واپس آئی تھیں پریشان رہتی تھیں۔ دوسرے ہاتھ بھی تنگ تھا۔ اس لئے بس ایک جوڑا خالدہ کے لئے

بنا سکیں۔ کملا نگر جانے کا بھی ان کا ارادہ نہ تھا مگر ندیم نے ضد کر کے رضامند کر ہی لیا۔ "آپ کے سوا میرا اور کون ہے؟ بھیا یہ سب آپ ہی کا کیا دھرا ہے۔ اب مجھے مصیبت میں پھنسا کر خود الگ ہو جانا چاہتی ہیں۔ اچھا نہ جائیے۔ میں بھی نہیں جاتا۔" مجبوراً صفیہ کو اس کی بات ماننی پڑی۔ رخصت کرا کے دلہن کو بھی اپنے گھر ہی لانا تھا۔ اس لئے کہ دو تین دن بعد ہی ندیم پہاڑ پہ چلا جانا چاہتا تھا۔

اور کتنی مایوسی ہوئی گاؤں والوں اور رشتہ داروں کو جب انھوں نے دیکھا کہ خلن کی بارات میں کل چھ آدمی آئے ہیں۔ ندیم اور اس کے بوڑھے والد، ندیم کے دو دوست، صفیہ بیگم اور ایک ان کا ملازم۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ نہ باجا نہ گاجا، نہ دھوم نہ دھڑکا۔ نہ بری نہ سہاگ پڑا، نہ زیور نہ جوڑے۔ شراتی جیسے بے تکلف دوستوں نے ندیم سے جھگڑنا شروع کر دیا کہ واہ بھیا یہ کیسی برات لائے ہو؟

ندیم ایک ہشیار۔ کہنے لگا، شراتی بھیا بارات تو یہیں سے سجے گی۔ میرا تم لوگوں کے سوا اور کون ہے جسے لاتا۔ لیجیے شراتی اور ندیم کے دوسرے گاؤں کے ساتھی فوراً دولھے والے بن گئے اور جب نکاح کے لیے دولھا سسرال جانے لگا تو گاؤں کے سو سے زائد مرد اور بچے بارات میں شامل تھے۔

عورتوں نے بری وغیرہ نہ آنے پہ بہت منھ جوڑے مگر سکینہ بیگم نے یہ کہہ کر سب کا منھ بند کر دیا کہ دولھا کی طرف سے ہزار روپیہ نقد آیا ہے کہ لڑکی اپنی پسند سے جو چاہے گی بنالے گی۔ یقین تو شاید ہی کسی کو آیا ہو مگر

خاموش ہونا پڑا۔

صفیہ بیگم آ تو گئی تھیں مگر جی حبیب میاں میں پڑا ہوا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے دیکھا کہ اگرچہ وہ سب سے خوش اخلاقی اور محبت سے ملیں مگر اب ان میں پہلے جیسی زندگی اور زندہ دلی نظر نہ آتی تھی۔ وہ لاکھ اپنی کیفیت کو چھپاتیں مگر چہرہ دلی جذبات کا آئینہ ہوتا ہے اور ان کا یہ آئینہ تو کچھ زیادہ ہی شفاف تھا۔

صبح بارات آئی تھی۔ رات کو نکاح ہوا اور اگلے دن رخصتی قرار پائی۔ ندیم کی طرف کی ساری کسر بھی صدیق حسن نے نکال دی تھی۔ گاؤں والوں نے ندیم کی بڑی خاطر مدارات کی۔ "ندیم بھیا" جو کل تک ان کے لیڈر اور ماسٹر تھے آج "جوائی" بن گئے۔ اس لطیفے پر خوب خوب قہقہے اڑے اور دیہاتی انداز کے مذاق کئے گئے اور ندیم ان سے لطف اٹھاتا رہا۔ مگر گھر کے اندر عورتوں نے اسے اتنا ستایا کہ وہ بوکھلا گیا۔ کئی بار غصے میں جھنجھنا کر باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا مگر ساجو نے سمجھا بجھا کر روکا۔ وہ یہاں اس کی بہن بن بیٹھی تھی اور اسے دوسری لڑکیوں کے حملے سے بچا رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی چپکے چپکے چھیڑتی بھی جاتی۔ "بھیا یہ نہ سمجھنا کہ سچ مچ ہی تمہاری بہن ہوں۔ ادھر ہوں۔ میں تو اپنی خلن کی بہن ہوں۔ سالی ہوں، تمہاری بڑی سالی — ذرا ان تو نڈیوں سے نپٹ لو، پھر تمہیں تگنی کا ناچ نہ نچایا تو......"

"ساجو بھابی آخر میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ یہ سب میری جان کی لاگو ہو رہی ہیں۔"

"تم ہماری لڑکی کو جو چھین کرلے جا رہے ہو۔" ساجو نے اٹھلا کر کہا۔

"ہوں — ذرا پھر تو کہنا — چھین کر — یا پھر —" ندیم نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا تو بس چپ رہو۔ نہیں تو میاں میں ان لڑکیوں میں چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں گی۔"

ندیم نے اس کے کان کے پاس منھ لا کر کہا۔ "اب کہاں چھوڑ کر جاسکتی ہو — تم نے کہا نا کہ تم میری سالی ہو — اور وہ کیا مثل ہے۔ سالی آدھی جورو —"

ساجو کا منھ لال ہو گیا۔ اس نے زور سے ایک دھمکا ندیم کی پیٹھ پر مارا۔ "بڑی زبان چل گئی ہے بھیا ابھی سے ۔ ۔ ۔ ۔" ندیم رو کتا رہ گیا اور وہ اپنے پھولے سانس کو سنبھالتی خالدہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ "اے ہے اگر انھیں پتہ چل جائے کہ بھیا نے میرا ہاتھ پکڑا تو — ویسے ہی بڑے بدگمان ہیں۔"

بداگی کا سماں کتنا دردناک ہوتا ہے یہ کوئی ان کے دل سے پوچھے جن کے گھر میں بیٹیاں ہیں۔ آج پتہ چل رہا تھا کہ خالدہ گھر اور گاؤں میں کتنی ہر دلعزیز تھی۔ موتی بیگم کا تو ذکر ہی کیا اس نے تو دو دن سے رو رو کر جل تھل بھر رکھے تھے۔ ساجو کی پھُلکی سی ناک اور موٹی موٹی آنکھیں سوج کر کپّا ہو رہی تھیں۔ سکینہ بہت ضبط کرتیں مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ صدیق حسن کا چہرہ ضبط کی کوشش میں بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ ابن میاں کل سے اپنے کمرے میں بند تھے جو بلانے جاتا زور کی ڈانٹ کھا کر واپس آتا۔ بڑی اماں پوتی کو گلے لگا کر ایسے بین کر رہی تھیں جیسے اس کے دشمنوں کا جنازہ ہی نکل رہا ہو۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنے مخصوص انداز میں لے اور سُر کے ساتھ رو رہی تھیں۔ ندیم سب کے بیچ

میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ یہ کیا قیامت ان سب نے مل کر برپا کر رکھی ہے۔ خالدہ کی حالت نیم بے ہوشی کی سی تھی۔ ماں کی یاد، باپ کی جدائی، کلو کی مفارقت، بڑی اماں، سکینہ امی اور ساجو کے جدا ہونے کا احساس اور پھر اپنا گھر، اپنا گاؤں — اپنی ساری سکھی سہیلیاں چھوڑنے کا غم، اتنے دکھ اور ایک جانِ ناتواں اور اس پر سب لوگوں کی یہ گریہ و زاری۔

صفیہ کچھ دیر تو برداشت کرتی رہیں آخر نہ رہا گیا۔ "آپ لوگ تو ظلن کو ادھ موا کر دیں گے۔ دیکھئے نا غریب کا کیا حال ہوا جا رہا ہے۔ بس بھئی بس خدا کے لئے اب رونا دھونا بند کرو اور بسم اللہ کر کے بچی کو رخصت کرو۔"

البتہ موتی بیگم کو دلاسا دیتے وقت خود ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اس لئے کہ وہ جانتی تھیں کہ بے ماں کی اس بچی کے لئے بہن کی جدائی کتنی کٹھن ہے۔

غرض آدھ گھنٹے تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔ آخر اسی طرح روتی دھوتی ظلن کو گود میں اٹھا کر حبیب میاں کی پردوں لگی کار میں بٹھا دیا گیا۔ ندیم کے والد اور دوستوں کے لئے ایک اور کار کا انتظام کیا گیا تھا۔ اندر ظلن کے پاس صفیہ بیٹھیں۔ باہر ڈرائیور کے برابر ندیم۔ صفیہ بیگم اور ندیم چاہتے تھے کہ موتی بیگم کو بھی دو چار دن کے لئے ساتھ لے جائیں تاکہ وہ بہل جائے، مگر وہاں تو ایسا غصہ چڑھا کہ بس نہ پوچھئے۔ ندیم سے تو دو دن سے بات ہی نہ کی تھی۔ صفیہ سے بھی روٹھ گئی۔ لاکھ سب نے کہا، باپ نے اصرار کیا۔ ظلن تک نے کہا۔ مگر ایسی ضد چڑھی کہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور اندر کوٹھری میں جا کر اوندھے منھ گر پڑی۔

کار دھیرے دھیرے روانہ ہوئی۔ اس کے ارد گرد گاؤں کے بچے اور مرد اور پیچھے پیچھے گھونگٹ کاڑھے بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ بہت سے

لوگ گاؤں کے ناکے تک ساتھ ساتھ آئے۔ پکی سڑک پر پہنچ کر صفیہ بیگم اور ندیم نے سر نکال کر الوداع کہا اور ذرا دیر میں موٹر تیز ہوگئی۔ لوگوں کے قدم دھیمے ہوتے گئے، سر جھک گئے، آنسو پونچھے جانے لگے۔ لوگ اس انداز سے گھر کی سمت جا رہے تھے جیسے ہارے ہوئے، مایوس اور دل شکستہ جواری۔

فاصلہ کافی تھا اور شام تک سکندر پور پہنچنا ضروری۔ موٹر تیز جا رہی تھی، دوپہر ڈھل چکی تھی۔ کھانے کا وقت آیا اور نکل گیا۔ ساتھ میں بھی بہت سا ناشتہ تھا، مگر صبح سب لوگ خوب پیٹ بھر کر مرغن ناشتہ کر چکے تھے۔ نہ ندیم کو کھانے کی خواہش تھی نہ صفیہ بیگم کو۔ خالدہ کا رونا ہی اب تک ختم نہ ہوا تھا۔ دو تین بار صفیہ نے تھرماس میں سے اسے ٹھنڈا پانی پلایا۔ آخر ایک بستی میں کار رکی گئی۔ ڈرائیور کو کھانا دیا کہ کھالے اور ندیم صفیہ اور خالدہ کے لئے چائے بنوا کر لے آیا۔ اب لاکھ صفیہ اصرار کر رہی ہیں مگر خالدہ گٹھری بنی بیٹھی رہی۔ آخر انھوں نے ندیم سے کہا۔ "تم ادھر چلے جاؤ تو شاید پی لے۔" ندیم کو بہت عجیب سا معلوم ہوا مگر آپا کا حکم ماننا پڑا اور جب واپس آیا تو چند گھونٹ پیالی میں سے کم تھے۔

صفیہ نے ندیم سے کہا۔ "تم اندر آجاؤ ندیم۔ میں باہر بیٹھوں گی۔ یہاں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

ندیم کچھ جھینپ سا گیا۔ "نہیں آپا آپ آرام سے اندر بیٹھی رہیے۔"

انھوں نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ "تو بس بنو نہیں۔ من چاہے منڈیا ہلائے۔"

صفیہ آگے جا بیٹھیں اور ڈرائیور کے آنے سے پہلے سامنے لگا آئینہ اونچا کر دیا۔

گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ ندیم بار بار مڑ کر خالدہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب بالکل ہی کونے میں دبک گئی تھی۔ اب تک وہ خالدہ کی ذراسی جھلک بھی نہ دیکھ پایا تھا۔ لگتا تھا، لال کپڑوں کی ایک گٹھری اس کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ ہاں کبھی کبھی ہلکی سی، دبی سی سسکی اس گٹھری میں زندگی کی چغلی کھاتی تھی۔

ندیم جھنجلایا جا رہا تھا۔ "آخر یہ رونا دھونا کب تک رہے گا۔ یہ لڑکیاں اس قدر اوور ایکٹنگ کیوں کرتی ہیں؟ جیسے بیچاریوں کو بیاہ کی کوئی خوشی ہی نہیں ہوتی۔ جیسے دولھا کوئی بھیڑیا ہو ــــ اُنھ ــــ یہ ہندوستانی ــــ دبو ــــ گھسو ــــ لڑکیاں۔" وہ غصّے میں کچھ دیر تک باہر کی طرف دیکھتا رہا۔ خالدہ اس سے بے نیاز رہ سکتی ہے تو وہ کون تڑپ رہا ہے۔ مگر۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس سرخ گٹھری کی کشش پھر اسے دھیرے دھیرے اپنی اُور کھینچ لیتی۔ ایک پراسرار سی خوشبو خالدہ کے کپڑوں سے نکل کر اس کے دماغ کو معطّر کر رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا مہندی لگا گدرایا ہوا ہاتھ سرخ کامدانی کے دوپٹے سے باہر نکلا نظر آ رہا تھا۔

ندیم نے دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس ہاتھ پر رکھ دیا ــــ ذرا سا ارتعاش گٹھری میں پیدا ہوا۔ صفیہ بیگم نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا تو ندیم نے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا۔

پھر کچھ دیر یونہی بے معنی نظروں سے کھڑکی کے باہر کا بے کیف نظارہ دیکھتے گزر گئی۔ "اُنھ۔ کتنا بور رنگ سفر ہے ــــ ایسا ہی پہاڑ کا سفر

گزرا تو بس ـــ بھلا اندر بیٹھنے سے حاصل کیا ہوا ؟ یہ خاتون تو ایسی بے نیاز بیٹھی ہیں جیسے یہ نہیں میں ان کے لئے بے قرار تھا ـ واہ رے ان لڑکیوں کے نخرے ......

اس نے خالدہ کی طرف نظریں پھیریں ـ خالدہ کا سر سیٹ کی پشت پر جا ٹکا تھا ـ باریک دوپٹے میں سے اس کی سوجی ہوئی بند آنکھیں اور ادھ کھلے ہونٹ نظر آ رہے تھے ـ اس کا چہرہ ندیم کو ایسا لگا جیسے شفق کے رنگین بادلوں میں سے پورن ماشی چندرمان جھانک رہا ہو ـ سانس کی دھیمی دھیمی آمد و شد سے اس کا سینہ گرتا اور ابھرتا نظر آ رہا تھا ـ کئی رات کی جاگی تھکی ہاری دلہن سو گئی تھی ـ

ندیم نے سامنے دیکھا ـ صفیہ بیگم سیٹ پر سر ٹکائے اونگھ گئی تھیں ـ ڈرائیور سامنے کی طرف ٹکٹکی لگائے تیزی سے موٹر چلا رہا تھا ـ ندیم خالدہ کے قریب کھسک آیا اور اپنا جلتا ہوا ہاتھ خالدہ کی پشت پر رکھ دیا ـ گھبرا کر خالدہ نے آنکھیں کھول دیں ـ نظریں ٹکرائیں ـ ایک کی نظروں میں اشتیاق تھا، ولولہ تھا، جوش تھا، طلب تھی ـ دوسری کی نظروں میں شرم تھی، گھبراہٹ تھی، محبت تھی، سپردگی تھی ـــ اور پھر ایک لمحہ بعد خالدہ کی نظریں جھک گئیں ـ لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ ابھری اور ایک ہاتھ آنکھوں پر آ گیا ـ

ندیم اور قریب کھسک آیا ـ

اب سیٹ کے اوپر، سرخ دوپٹے کے اندر دو ہاتھ، ایک سخت، گرم اور نم ـ دوسرا نرم سرد اور کپکپاتا ہوا ایک دوسرے کی گرفت میں تھے ـ آہستہ سے ندیم کا دوسرا ہاتھ خالدہ کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا ـ خالدہ کی گردن اور زیادہ جھک گئی ـ ندیم کی آنکھیں اور زیادہ شرابی ہو گئیں ـ

رات ہو چلی تھی اور کار پوری تیزی سے کملا نگر کی سمت دوڑی چلی جا رہی تھی۔

۱۵

"گیتا"۔۔۔ کوئی جواب نہیں۔

"گیتا"۔ آنکھیں کھولو۔۔۔ اچھا لو۔ یہ عرق تو پی لو" آنکھیں اسی طرح بند۔

"اچھا نہ پیو۔۔۔ نہ بولو۔۔۔" پل بھر کے لئے آنکھیں کھلیں، غور سے دیکھا۔۔۔ پھر بند کر لیں۔

"دیکھو ضد نہیں کرتے۔۔۔ اچھے بچے بات مان لیتے ہیں!" آنکھیں کھلیں۔ ماتھے پر دو بل ابھرے، اور منہ کھول دیا۔ مگر دو گھونٹ پی کر پھر ہونٹ بند کر لئے۔

"نہیں گیتا تمھیں یہ سارا عرق پینا پڑے گا"

"اوہوں۔۔۔ میرا جی نہیں چاہتا"

"اچھا نہ سہی۔ پھر میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں۔ چلا جاتا ہوں" اس مصنوعی خفگی کے ساتھ کہا گیا جو ضرورتاً وہ پیدا کر لیا کرتا تھا۔

گیتا نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ "نہیں نہیں انّو۔۔۔ جاؤ نہیں۔۔۔ لاؤ میں عرق پی لیتی ہوں"۔ انوپم نے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا جسے وہ ایک سانس میں پی گئی اور پھر بے سُدھ ہو کر تکیے پر سر ڈال دیا۔ ماتھے پر ننھے ننھے قطرے پسینے کے چمکنے لگے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ انوپم پریشان

ہو کر اسٹاف نرس کے پاس بھاگا۔ "سسٹر ذرا اپنی پیشنٹ کو دیکھنے آکر۔ شاید وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔"

"اوہ۔۔ نو۔۔ مسٹر نو۔۔ بے ہوش وے ہوش اب نہیں ہو گا۔ کمزوری ہے اور کوئی بات نہیں۔" اور وہ اطمینان سے گلاس میں دوا ناپتی رہی۔

"مگر سسٹر ابھی تک اتنی کمزوری کیوں ہے؟" فکر مند انویم نے پوچھ ہی لیا۔ اگرچہ جانتا تھا کہ سسٹر خاصی تیز مزاج ہے اور بے کار سوالوں پر الجھ جاتی ہے۔

"شکر کرو کہ اتنی سخت بیماری سے بچ گئی۔ کمزوری کا کیا ہے دس پندرہ دن میں جاتی رہے گی۔" نرس نے انگریزی میں جواب دیا۔ چہرے پر وہی شانت مسکراہٹ، آنکھوں میں مہربانی کی جھلک اور ہاتھوں میں مشین کی سی پھرتی۔ انویم عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنی کٹھن، کتنی دشوار زندگی ہے ان نرسوں کی بھی، مگر یہی خدمتِ خلق ہے!

وہ واپس آیا تو نوجوان مدراسی پستہ قد نرس اپنے سانولے دلکش چہرے پر ہمیشہ جمی رہنے والی مسکراہٹ کے ساتھ گیتا کے پاس کھڑی انجکشن تیار کر رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے گیتا کے پتلے بازو میں سوئی گھونپی، انویم کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوئے اور اس نے جلدی سے گردن پھیر لی۔ نرس ہنس پڑی۔ "مرد ہو کر اتنا بچ دل" پھر اس نے گیتا کو آرام سے لٹایا اور انویم کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "تم بیکار گھبراتا مسٹر۔۔ ہوش تو ہے۔ دیکھو آنکھیں کھولے ہنس رہا ہے۔ مگر بولنے یا اٹھنے مت دینا۔۔ شام کے ٹائم ڈاکٹر آئے گا تو پھر دیکھے گا۔۔ اور بی بی۔۔ تم بھی ضد نہیں کریگا۔" اور وہ دوسرے مریض کی طرف مڑ گئی۔۔ انویم نے کرسی گیتا کے بڈ کے پاس

کھسکالی اور چپ چاپ سہما ہوا بیٹھا رہا۔ کہیں کوئی بات ناگوار گزرے اور یہ نازک مزاج صاحبزادی پھر بے ہوش ہو جائیں۔

ایک گھنٹے تک گیتا آرام سے سوتی رہی اور انوپم اس کے پاس بیٹھا خیالات میں گم رہا۔

دوران امتحان میں بھی گیتا اور انوپم یونہی ایک دوسرے سے بے تعلق رہے۔ برابر سیٹیں تھیں۔ مگر کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھتا ہی نہ تھا۔ امتحان ختم ہونے کے بعد گیتا کی کئی دن تک انوپم کو کچھ خبر ہی نہ ملی۔ ندیم کا خط آیا تھا کہ اگلے ہفتے اس کی شادی ہے اور سخت اصرار تھا کہ انوپم ضرور آئے۔ ہریش چندر باہر گئے ہوئے تھے اس لئے انوپم ان کے انتظار میں ٹھیر گیا تھا۔ خیال تھا کہ ان سے مل کر روانہ ہوگا اور عین شادی کے دن کملا نگر پہنچ جائے گا۔

جانے سے دو دن پہلے انسٹی ٹیوٹ کی طرف گیا۔ خیال تھا کہ چلتے چلاتے کچھ لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ بار بار اندر سے کوئی ٹہوکے سے دے کر یہ کہتا چلو شاید گیتا کا بھی کچھ پتہ چلے۔ مگر انوپم اس خیال کو جھٹک کر پھینک دیتا۔ "مجھے کیا مطلب۔ کہیں رہے، کہیں جائے۔ مجھ سے واسطہ؟" مگر جب وہ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو چندرانی سے ملاقات ہو گئی۔ اس سندھی نوجوان سے انوپم کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ذرا دیر تک پرچوں کی، رزلٹ کی، چھٹیوں کے پروگرام کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ایک دم چونک کر جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو چندرانی نے کہا۔ "مس ورما کا اب کیا حال ہے؟"

"مس ورما کا؟ کیوں؟" حیران ہو کر انوپم نے اُلٹا اسی سے سوال کیا۔

"ارے! تمھیں معلوم نہیں۔ وہ بے چاری تو کئی دن سے ہاسپٹل میں ہے سخت بیمار ہے۔"

"ہاسپٹل میں ہے؟ سخت بیمار!!" ۔ اس پر دونوں جملے ہی بس انوپم دہرا سکا۔

"ہاں، آخری پیپر کرنے کے بعد جب وہ بورڈنگ واپس گئی تو لڑکھڑا رہی تھی۔ اگلے دن صبح پلنگ پر بے ہوش پڑی ہوئی ملی۔ اتھارٹیز نے ہاسپٹل میں داخل کر دیا۔ پرسوں میں دیکھنے گیا تھا ـــ بے چاری بالکل تنہا بے ہوش پڑی تھی۔ پور گرل ـــ" وہ کہے جا رہا تھا اور انوپم بدحواس کھڑا تھا۔ بمشکل اتنا پوچھ سکا۔ "کیا حالت ـــ بہت خطرناک ہے؟"

"نرس کہہ رہی تھی کہ برابر بے ہوش ہے۔ نروس بہت خراب ہیں کمزوری بھی بہت ہے۔ شاید بچ جائے۔" اور اس وقت حیدانی کو اپنی ایک دوست جاتی نظر آئی اور وہ "اکسکیوز می" کہتا ہوا ادھر لپک گیا۔

انوپم ایک ستون کے سہارے یوں کھڑا رہ گیا کہ دور سے دیکھنے والا سمجھتا کہ ستون سے ملا کر کوئی اسٹیچو نصب کر دیا گیا ہے۔

شام ہو چکی تھی جب انوپم اسپتال پہنچا۔ تین بڈ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑکی کے پاس بچھے ہوئے پلنگ پر گیتا بے سُدھ پڑی تھی۔ لمبے گھونگھریالے بالوں کی لٹیں زرد ملگجے تکیے پر بکھری ہوئی، ہلدی جیسے پیلے چہرے پر پلکیں اور کمانی دار بھویں اور گہری سیاہ نظر آ رہی تھیں۔ آنکھوں کے پپوٹے اُبھرے اور سوجے ہوئے، ہونٹ بے رنگ اور متورم۔ ایک

پہلا ہاتھ سینے پر دھرا۔ دوسرا پہلو میں پڑا۔ آہ یہ آرٹسٹک ہاتھ! اس کو اپنانے کے لئے انوپم کیا کچھ کرسکتا تھا، کیا کچھ کرنا چاہتا تھا.... انوپم کا سر چکرانے لگا اور اس نے وہیں پلنگ کی ریلنگ پر اپنا سر ٹکا دیا۔
کھٹ کھٹ کرتی، سفید لباس پہنے ایک سانولی چھوٹی سی نرس نے اس کا بازو دبوچا۔ "ایکسیوز"
انوپم نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ نرس کی آنکھوں میں رحم کی لہر نظر آئی۔
"آپ پیشینٹ کا کون ہے؟"
انوپم سوچتا رہ گیا کہ کیا بتائے؟ نہ دوست نہ رشتے دار، نہ محب نہ محبوب۔ وہ تو کچھ بھی نہیں اس کا۔
"آپ اس کا فرینڈ ہے؟ لور ہے، بھائی ہے کون ہے آخر؟" نرس نے دوبارہ ذرا تیز لہجے میں کہا۔
"کزن" بھائی سے یہ لفظ انوپم کو سوجھ گیا۔
"او۔ آئی سی۔ اتنے دن سے آپ کہاں تھا۔ پیشینٹ کا اتنا نازک حال تھا۔" نرس یہ کہتی ہوئی دوسرے مریض کی طرف مڑ گئی اور انوپم وہیں کھڑا رہ گیا۔
کزن کہنا بڑا کام آیا۔ جب اس نے گیتا کے پاس رہنے کی درخواست کی تو مریضہ کی نازک حالت کے پیش نظر منتظمین نے اسے دن رات رہنے کی اجازت دیدی۔ رات کو پلنگ کے برابر چٹائی ڈال کر وہ لیٹ جاتا اور دن میں کسی وقت بازار جاکر تھوڑا بہت کچھ کھا آتا۔ مدراسی نرس اس پر بہت مہربان ہوگئی تھی۔ دن میں ایک آدھ بار اپنے تھرماس میں سے اسے

چائے پلا دیتی اور گیتا کے لئے آئے پھلوں میں سے زبردستی اس کے منھ میں کچھ دانے ٹھونس دیتی۔ یوں بھی اس کی ڈاکٹروں، نرسوں اور جونیئر اسٹاف کے لوگوں سے دوستی ہوگئی تھی۔

تیسرے دن ہرشی چندر واپس آئے تو دوڑے ہوئے اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹروں سے ملے۔ اپنا اطمینان کیا اور روز شام کو بے حد مصروفیت کے باوجود گیتا کو دیکھنے کا وقت نکال لیتے۔ اس عرصے میں انھوں نے تھوڑے تھوڑے کرکے وہ سب حالات اور ساری باتیں انوپم کو سنا دیں جو ان کو معلوم ہوئی تھیں۔ وہ بدگمانیاں اور غلط فہمیاں جو انوپم کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھیں یہ سن کر دور ہوگئیں۔ اب پھر گیتا اس کی نظر میں ویسی ہی پاک اور معصوم دیوی تھی بلکہ گیتا کے کیریکٹر کا وہ کچھ اور زیادہ قائل ہوگیا۔

ہرشی چندر کی بیوی بھی کئی بار گیتا کو دیکھنے آئیں اور ہر دفعہ آبدیدہ واپس گئیں "بے چاری بے ماں کی بچی"۔

کالج کے کئی ساتھی لڑکے لڑکیاں بھی گیتا کو دیکھنے آتے تھے۔ ان کی آپس کی باتوں سے انوپم کو یہ بھی پتہ چلا کہ لیلے اور کھنہ دونوں بمبئی میں موجود ہیں۔ اور انوپم حیران تھا کہ لیلے، جو یوں گیتا پر فدا تھی، اتنی گہری دوستی، اتنی محبت کی دعویدار — جس کی بدولت گیتا نے اس کی دوستی کو ٹھکرایا — کیسے اس نے یوں آنکھیں پھیرلیں؟ گیتا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اور وہ اسے دیکھنے تک نہیں آئی؟ کھنہ کی بے اعتنائی اور بے وفائی تو وہ سمجھ سکتا تھا، مگر عورت ہوکر اتنی سخت دل اور زمانہ ساز!!

انویم کو گیتا کے پاس رہتے چھ تھا دن تھا، مگر وہ ابھی تک ویسی ہی بے ہوش تھی۔ انویم کھڑکی میں کھڑا اپنے خیالات میں محو خدا جانے کیا دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک بہت بڑی اور شاندار کار پر پڑی جو اسپتال کے اندر داخل ہو کر صدر دروازے پر رک گئی اور اس میں سے ایک لمبا تڑنگا وجیہہ نوجوان منھ میں پائپ دبائے تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

انویم چند لمحے بعد کھڑکی سے پلٹا تو اس نوجوان کو اپنے مقابل پایا۔ اس نے ایک اچٹتی نظر انویم پر ڈالی اور گیتا کے پلنگ کی پائینتی کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموش ٹکٹکی لگائے گیتا کے زرد چہرے کو تک رہا تھا۔ خود اس کے چہرے پر ایک تشنجی کیفیت تھی۔ جیسے کوئی کرب اس پر گزر رہا ہو۔ کئی نرسیں اس کے اردگرد آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور بڑے شوق سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ایک ملازم بھاگ کر ایک گدے دار کرسی اٹھا لایا مگر وہ بیٹھا نہیں، کچھ دور یونہی کھڑا رہا۔

انویم کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور نوجوان کو گھور رہا تھا۔ "آخر یہ ہے کون؟ صورت کچھ دیکھی دیکھی معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک وہ انویم کی طرف مڑا اور امریکن لہجے میں انگلش میں بولا۔ "تم مس ورما کے کون ہو؟" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ انویم نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور جھک کر گیتا کا تکیہ درست کرنے لگا۔ ایک نرس آگے بڑھی اور اپنی آواز میں شیرینیاں گھولتے ہوئے ادب سے بولی۔ "سر یہ پیشنٹ کا کزن ہے ۔ مسٹر انویم گپتا۔" اس نے تحقیر کے انداز سے انویم کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے اسٹاف نرس کی طرف مڑ گیا۔

"نرس دیکھو ـــ مریض کا علاج اچھی طرح ہونا چاہیئے ۔ ان کو

اسپیشل وارڈ میں رکھواور پرائیویٹ نرس دن اور رات کی مقرر کر دو۔ سب خرچ ہم ادا کریں گے۔" اس نے سسٹر کو انگلش میں ہدایات دیں۔

انوپم سمجھ گیا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ اب اس سے اور زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "مسٹر آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ' مگر مریضہ کو آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس کا علاج اور دیکھ بھال بہت اچھی طرح ہو رہی ہے۔ آپ اطمینان سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو حریفانہ نظروں سے گھورتے رہے پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ ایک مصنوعی اندازِ وقار پیدا کرتا ہوا وہ باہر جانے کے لئے مڑا — پھر پلٹ کر گیتا پر نظر ڈالی — ٹھٹکا — اور باہر نکل گیا کئی نرسیں اور اسپتال کے نوکر اس کے پیچھے پیچھے ادب سے چل رہے تھے۔

البتہ مدراسی نرس کمرے ہی میں رہ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد تیوری پر بل ڈال کر انوپم سے بولی۔ "تم اتنے بڑے آدمی سے کیسے بات کرتا؟ جانتا یہ کون ہے؟"

"ہوگا کوئی۔ مجھے کیا مطلب۔" تلخی سے انوپم نے جواب دیا۔

"مسٹر — یہ تمہاری کزن کا، میں سمجھتا — آئی مین — کلوز فرنڈ مالوم پڑتا ہے۔ یا اس کا لور۔"

طنزیہ مسکراہٹ نرس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انوپم کیوں جلا جا رہا ہے۔ انوپم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نرس پھر بولی۔ "جانتا ہے؟ یہ نوید جی جمشید جی کوکو والا ہے۔ بمبئی کے کروڑپتی سیٹھ کا بیٹا۔"

"میری بلا سے۔ وہ کروڑپتی کا بیٹا ہو یا لکھ پتی کا۔" بھڑک کر انوپم نے کہا اور آتشِ رقابت کے بھڑکتے شعلوں کو بجھانے کی کوشش میں

کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ اسپتال کے احاطے میں ٹہلتا رہا، وہاں سے سڑک پر آیا، پھر سامنے سے بس آتے دیکھی۔ بیٹھ گیا اور گھنٹہ بھر بعد ہریش چندر کے مکان میں اپنے پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔

شام تک وہ یونہی پڑا رہا۔ سب نے سوچا تھک گیا ہے آرام لینے آیا ہے شریمتی ہریش چندر نے لاکر چائے پلائی۔ سوجانے کی ہدایت کی اور تسلی تشفی دیکر چلی گئیں۔ مگر انوپم کباب سیخ کی طرح پہلو بدلتا رہا۔ یکایک چھ بجے وہ پلنگ سے اُٹھا اور سات بجتے بجتے پھر اسپتال میں گیتا کے بڈ کے برابر موجود تھا۔ وہ اب بھی ہر بات سے بے خبر اور بے سدھ بے خبری کی جنت میں کھوئی ہوئی تھی۔ مدراسی نرس جو اس کے پاس کھڑی تھی انوپم کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی کمر کو تھپتھپایا اور اطمینان سے باہر چلی گئی۔

اس واقعے کے اگلے دن ہی گیتا کو ہوش آگیا۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی سوجی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ چاروں طرف دیکھا۔ نرسوں کو دیکھ کر چہرے پر وحشت پیدا ہوئی۔ پھر انوپم پر جاکر نظریں ٹک گئیں۔ کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی، پھر سخت پریشانی اور وحشت چہرے سے برسنے لگی۔ گھبرا گھبرا کر ہاتھ پیر مارے۔ انوپم کھڑا ہوگیا۔ "شاید میرا یہاں ہونا اسے پسند نہیں" مگر نرس نے اشارے سے اسے بٹھا دیا۔ "گھبراؤ نہیں۔ ابھی پورا ہوش نہیں ہے۔ پہچان نہیں سکی" گیتا کی نظر نرس کی طرف پلٹی۔ چہرے پر ناگواری کے آثار تھے جیسے کہتی ہو کیوں نہ پہچانتی؟ نرس نے ایک انجکشن اس کے بازو میں لگایا اور بولی۔ "سوجاؤ بی بی۔ سوجاؤ" پھر انوپم سے کہا۔ "ابھی بات وات نہ کرنا۔ بہت کمزور ہے" نرس چلی گئی۔

گیتا کچھ دیر آنکھیں کھولے ادھر ادھر دیکھتی رہی، پھر دھیرے دھیرے دوا کا اثر ہونے لگا اور وہ سو گئی۔

شام کو وہ دوبارہ جاگی۔ انوپم کو دیکھ کر ذرا دیر کو گھبراہٹ سی ظاہر ہوئی پھر اطمینان کی لہر دوڑی چہرے پر۔ مگر بولی نہیں، آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر مسرت بھرے لہجے میں کہا اب خطرے کی بات نہیں، چند دن میں ٹھیک ہو جائے گی تو انوپم نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں اپنا سر عقیدت اس رحیم و کریم ایشور کے سامنے خم کر دیا جس نے اس کی دعائیں قبول کر لی تھیں۔

اگلے دن گیتا پوری طرح ہوش حواس میں تھی۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی لگائے انوپم کو دیکھتی رہی۔ انوپم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ کبھی مسکراتا کبھی نظریں جھکا لیتا، کبھی اس کو دیکھنے لگتا۔ گیتا کے چہرے پر خفیف سی سرخی جھلکی اور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ہونٹ کپکپائے۔ "تم — تم انو — پم — ہو نا — ؟"

"ہاں گیتا" خوشی سے انوپم کی آواز تھرا رہی تھی۔

"یقین نہیں آتا"

"نہیں گیتا — میں انوپم ہی ہوں" اس نے بچوں کی طرح یقین دلایا۔

"مگر تم — تم — تم مجھ سے خفا تھے نا؟" رک رک کر گیتا نے پوچھا۔

"نہیں نہیں گیتا۔ میں بھلا تم سے خفا ہو سکتا ہوں"

"نہیں تم خفا تھے — مگر اب تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔ کر دیا نا؟"

ایک دم گیتا کی آواز تیز ہو گئی، چہرہ سرخ ہو گیا — اور وہ پھر بیہوش تھی۔ نرسیں دوڑیں، ڈاکٹر آیا۔ دوائیں اور انجکشن دیے گئے۔ سب نے

انوپم کو الزام دیا کہ جانے اس نے کیا کیا، کیا کہا کہ پھر مریضہ بے ہوش ہو گئی۔ انوپم غریب چپ رہتا سب الزام سنتا رہا۔ کس سے کہے کہ اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا — ایک لفظ بولا تک نہیں۔

مگر شام تک گیتا کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ انوپم کو دیکھ کر مسکرائی اور کچھ دیر یونہی مسکراتے لبوں اور روتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی، پھر اپنا ہاتھ انوپم کی طرف بڑھا دیا۔

انوپم ایک عجیب کیفیت میں اس بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ جس ہاتھ کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی زندگی نچھاور کر سکتا تھا، جس ہاتھ کو پانے کی امید ختم ہو چکی تھی وہ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا اور وہ اسے تکے جا رہا تھا۔ گیتا کے چہرے پر دلی صدمے کی کیفیت نظر آئی، ہاتھ کانپا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ہاتھ ہٹا لے انوپم کے دونوں ہاتھوں نے بڑی ملائمیت سے اسے تھام لیا اور دونوں ایک دوسرے کو جانے کتنی دیر تک دیکھتے رہے۔ بہت سی باتیں جو شاید وہ کبھی بھی زبان سے نہ کہہ سکتے آنکھوں نے کہہ ڈالیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں لرزش تھی۔

گیتا کی صحت تیزی سے بحال ہونے لگی۔ گالوں کی سرخی، آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی شادابی، مزاج کی شگفتگی واپس آ گئی۔ اس کا جسم ہی نہیں ذہن اور روح بھی صحت یاب ہو گئی تھی۔ تکلیف دہ واقعات کے نقوش دھندلے پڑ گئے۔ محبت، خلوص، خدمت اور لگن کے رنگ گاڑھے ہو رہے تھے۔ وہ جس کا یہاں کوئی نہ تھا اس کو غیروں سے اتنی محبت ملی!! ڈاکٹروں کی توجہ، نرسوں کی خدمت، ہریش چاچا اور ماں جی کا خلوص،

دوستوں کا خیال، کس کس کا شکریہ ادا کرے ؟ اور پھر انوپم کی ۔ انوپم کی محبت و خدمت کو وہ کیا نام دے ؟ کیا نام دے سکتی ہے ؟ وہ دل جو تلخی اور بیزاری، مایوسی اور نامرادی کا آماجگاہ بن چکا تھا ۔ اس میں اب پھر خلوص اور پریم کا ڈیرا تھا، جس میں امید و آرزو کے ننھے دیئے جگمگانے لگے تھے ۔

اس تھوڑے عرصے ہی میں اس نے اسپتال کے سارے اسٹاف کو موہ لیا تھا ۔ نرسیں اپنی فرصت کا وقت اس کے پاس ہنسی مذاق میں گزار دیتیں ۔ دائیاں اور آیائیں اپنے جھگڑے اور پریشانیاں اس سے بیان کرتیں ۔ ڈاکٹر اس سے شعر و ادب کی باتیں کرتے اور ہریش چندر اسے چھیڑتے رہتے ۔ "میری بیٹی نے یہاں بھی اپنے اتنے عاشق پیدا کر لیے ؟"

جیسے ہی گیتا کی طبیعت سنبھلی ڈاکٹر نے انوپم سے کہا کہ اب اسے دن رات رہنے کی ضرورت نہیں ۔ ملنے کے وقت آجایا کرے ۔ انوپم نے بہت چاہا کہ ابھی اسے کچھ دن اور رہنے دیا جائے ۔ مگر کامیاب نہ ہوا ۔ گیتا نے ڈاکٹر سے اصرار کیا ۔ "ڈاکٹر صاحب ان کی وجہ سے میرا جی لگا رہتا ہے ۔" تو بڈھے ڈاکٹر نے ہنس کر اس کا ہاتھ تھپکا ۔ "نہیں بیٹی یہ اصول کے خلاف ہے ۔ تمہارا جی بہلانے کو ہم سب جو ہیں ۔" پھر آنکھوں میں شرارت بھر کر گیتا کی طرف جھکا ۔ "گھبراتی کیوں ہو، روز شام کو یہ تمہارے پاس آیا کریں گے ۔ اور ساتھ رہنے کو تو ساری عمر پڑی ہے ۔"

انوپم نے حیرانی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو شوخی سے مسکرا رہا تھا ۔ انوپم جھینپ گیا ۔ گیتا پر ایک چور نظر ڈالی تو دیکھا اس کی پلکیں رخساروں پر کانپ رہی ہیں اور ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ چہرے پر کچھ ایسا حجاب ہے جو انوپم نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ۔

ڈیڑھ مہینے بعد گیتا ہسپتال سے گھر واپس آئی۔ وہ فوراً سکندر پور جانا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے ابھی دس پندرہ دن اور آرام کرنے کی تاکید کی تھی۔
انوپم بھی سکندر پور جانے کے لئے بے چین تھا۔ وہاں سے دو خط بھی آ چکے تھے کہ حبیب میاں کی طبیعت خراب ہے۔ لیکن گیتا روک رہی تھی کہ ایک ہفتہ اور رک جائے تو دونوں ساتھ ساتھ ہی چلیں گے۔
گیتا کو اسپتال سے آئے تیسرا دن تھا کہ صدیق حسن کا تار ہرلیش چندر کے نام آیا۔ "حبیب میاں کی حالت قابلِ اطمینان نہیں۔ وہ آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔"
اسی روز رات کی گاڑی سے گیتا، انوپم اور ہرلیش چندر سکندر پور روانہ ہو گئے۔ انوپم کی پریشانی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ہرلیش چندر بالکل خاموش تھے۔ ہونٹ مضبوطی سے بند اور آنکھیں فضا میں جمی ہوئی۔ اور گیتا رستے بھر روتی رہی۔ آنسو کسی طرح تھمتے ہی نہ تھے۔

۱۶

دس بارہ دن صفیہ بیگم کو سخت مصروفیت رہی۔ آخر جب ندیم اور خالدہ پہاڑ پر سدھار گئے تب جا کر انھیں فرصت ملی۔ حبیب میاں نے ان کی مصروفیت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ سارے بکھرے کاموں کو سمیٹنے لگے۔ کئی دن سکندر پور سے باہر رہے اور باہر کے مرکزوں کو دیکھا بھالا، پھر خود سکندر پور کے رات کے اسکولوں اور تعلیمی مرکزوں کی دیکھ بھال اور نئی

تشکیل کا نقشہ بنانے میں جُٹ گئے۔ وکالت کا کام تو تقریباً سال بھر سے برائے نام ہو رہا تھا۔ اسمبلی کے زمانے میں البتہ وہاں مصروف رہنا پڑتا تھا، مگر آجکل گرمی میں وہ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے مدتوں سے جو کام ٹل رہے تھے ان سب کو نبٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پچھلے کئی مہینے سے صفیہ کی غیر معمولی سخت گیری انھیں زیادہ کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ اور پڑے ہوئے کاموں کا بوجھ انھیں دبائے دے رہا تھا۔ اس وقت موقع خوب مل گیا۔ صحت وحت کے خیال کو پسِ پشت ڈال وہ دن رات ان کاموں میں لگے رہے۔ ایک بار صفیہ نے کہا بھی "خدا کے لئے میری مشغولیت کا اتنا فائدہ نہ اٹھاؤ۔۔ میں دیکھ رہی ہوں تم بالکل آرام نہیں کرتے۔" انھوں نے ہنس کر جواب دیا۔ "پہلے اپنی دلچسپیوں سے نبٹ لو پھر مجھ غریب کا حال پوچھنا ۔

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

صفیہ کے دل پر ان کا یہ مذاقیہ جملہ تیر کی طرح لگا۔ وہ کیا جانیں یہ سگے بڑے کی دلچسپیاں آج کل انھیں کتنی ناگوار ہیں، مگر کریں کیا؟ مروت کا بھلا ہو کہ جو نہیں چاہتیں، وہ بھی کرنا پڑ رہا ہے۔

ندیم اور خالدہ کے کشمیر جانے کے دو تین دن بعد نرجس اور سلیم مسوری اپنی خالہ کے پاس روانہ ہو گئے۔ اور پھر دو دن صفیہ کو ٹھیک ٹھاک کرنے اور بکھرا سامان سمیٹنے میں لگ گئے۔

پیر کا دن تھا۔ سب جھگڑوں سے نبٹ کر صفیہ نہا دھو کر بال سکھا رہی تھیں۔ ان کے سیاہ کھچڑا سے بالوں میں اب جگہ جگہ چاندی کے تار چمکنے لگے تھے مگر بالوں کا گھن اور لمبائی جوں کی توں تھی۔

حبیب میاں اندر آئے، بیوی کو دیکھا اور مسکرائے۔ "بی زلیخا کیا ہوا ہے ؟" وہ جب صفیہ کو چھیڑنا چاہتے "بی زلیخا" کہا کرتے تھے۔ صفیہ کھسیا کر ہنسنے لگیں۔ وہ اپنے سن سے دیکھنے میں بہت کم لگتی تھیں۔ اکثر تو لوگ انھیں اور رتن کو بڑی چھوٹی بہنیں سمجھ لیتے تھے، جبکہ حبیب میاں کے سر اور داڑھی کے بال چالیس سے پہلے ہی سفید ہو گئے تھے اور اب پچاس کے سن میں تو سفید بھک ہو چکے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد صفیہ نے حبیب میاں کو آرام کرنے کیلئے لٹا دیا، اور ملازم سے کہدیا کہ جو بھی آئے کہدینا کہ میاں نہیں ہیں، آج وہ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

اس دن اور رات تو حبیب میاں نے مکمل آرام کیا۔ مگر اب جو اگلے دن اُٹھ کر کام کرنا چاہا تو جیسے اعضاء نے جواب دیدیا۔ "جانے صفیہ مجھے کیا ہوا جا رہا ہے۔ اُٹھتے ہی نہیں بنتا۔" انھوں نے تو معمولی لہجے میں کہا مگر صفیہ بہت گھبرا گئیں۔ ڈاکٹر رمضان جو حبیب میاں کے خاص معالج اور دوست تھے چھٹی پر باہر گئے ہوئے تھے۔ فون کیا تو معلوم ہوا کہ آج ہی آئے ہیں۔ صفیہ نے اصرار سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کسی طرح وقت نکال کر ابھی آجائیے۔ وہ بہت نڈھال لگ رہے ہیں اور کھانسی بھی بہت آرہی ہے، سانس بھی رات سے پھول رہا ہے۔ کہیں خدانخواستہ دمے کا حملہ نہ ہو۔"

ڈاکٹر رمضان آئے۔ گھنٹہ بھر دیکھا بھالا۔ بار بار کہتے۔ "حبیب میاں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں آپ نے ذرا بھی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ اور کیوں بیگم صاحب آپ نے بھی ان کی پرواہ نہیں کی ؟ خیر اب کل صبح

اکسرے ہوگا۔ اور دیکھئے بیگم صاحب یہ نہ پلنگ سے اُٹھیں اور نہ کوئی کام کریں ۔"

یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے اور صفیہ حبیب میاں کو بُرا بھلا کہتی اور اپنے کو کوستی رہیں۔" بالکل بچے بن جاتے ہو۔ اگر میں نہ ہوں گی تو — تو آخر کون تمھاری دیکھ بھال کرے گا۔ ذرا صحت کا خیال نہیں۔ مجھ کمبخت کو یہ خبر ہوتی کہ یہ حال کر لو گے تو کہیں بھی نہ جاتی ۔" حبیب میاں ہنس کر کبھی کوئی فقرہ کس دیتے، کبھی خاموش ہو کر آنکھیں بند کر لیتے۔ انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم میں سکت ہی نہ رہی ہو۔

اگلے دن اکسرے اور خون وغیرہ کا معائنہ ہوا۔ تیسرے دن پھر ڈاکٹر رمضان گھر پر آئے اور کہا۔" میں کچھ اور ڈاکٹروں کو بھی مشورے میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ بہتر تو یہ تھا کہ آپ بمبئی چلے جاتے ۔"

حبیب میاں نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور ڈاکٹر رمضان سے کہا۔ صفیہ کے سامنے یہ بات منھ سے بھی نہ نکالنا ورنہ وہ میری جان کو آجائے گی۔ خدا ہر جگہ ہے اور صحت، موت، زندگی سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ آپ یہاں جس کو جی چاہے دکھائیں، مگر بمبئی جانے کے لئے نہ میرے پاس پیسہ ہے نہ میرے جسم میں سکت باقی ہے۔

ڈاکٹر رمضان خاموش ہو گئے مگر اتنا کہا " بہر حال آپ کو میری ہدایتوں پر سو فیصدی عمل کرنا ہوگا ۔"

حبیب میاں نے جواب دیا۔" دوست کے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔ آپ جو کہیں سر تسلیم خم ہے، مگر خدارا صفیہ کو پریشان نہ کیجئے گا ۔"

ڈاکٹر صاحب جانے لگے تو صفیہ جو حبیب میاں کے لئے سوپ بنا رہی

تھیں، باورچی خانے سے لپکتی ہوئی آئیں۔ برسوں سے ایک سوال بار بار ان کی زبان کی نوک تک آکر رہ جاتا۔ جانے ڈاکٹر کیا جواب دے! بناوٹی شگفتگی کی نقاب کے پیچھے فکرمندی کا گہرا سایہ جو ڈاکٹر کے چہرے پر نظر آرہا تھا وہ صفیہ کی باریک بیں نظر سے چھپا نہ رہ سکا۔ "ڈاکٹر صاحب ذرا سنئے گا۔"

ڈاکٹر صاحب جاتے جاتے رک گئے۔

"آپ کو قسم ہے ڈاکٹر صاحب۔ مجھ سے چھپائیے نہیں۔ ٹھیک ٹھیک حال بتا دیجئے۔ ان کو نصیب دشمناں کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"دیکھئے بیگم صاحب" ڈاکٹر رمضان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مرض میرے خیال میں سیریس ہے — مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا — ہر مرض کا علاج کیا جا سکتا ہے — شفا دینے والا خدا ہے۔ ہم لوگ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے وہ انشاء اللہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ آپ خدا پر بھروسہ رکھئے۔"

ڈاکٹر رمضان گھبرا گھبرا کر بات چھپانے کی کوشش میں جو نہیں کہنا چاہتے تھے وہ بھی کہہ گئے۔ اور پھر اس خوف سے کہ منھ سے کچھ اور نہ نکل جائے جلدی سے باہر چلے گئے۔ "میں کل صبح ڈاکٹر موہن داس کو لے کر آؤں گا۔"

صفیہ وہیں ڈیوڑھی کی چوکھٹ پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ "سیریس مرض" کا لفظ ان کے دل میں جاکر چبھ گیا تھا۔ ان کے وہ سارے اندیشے اور وسوسے جنھیں انھوں نے سب کے یقین دلانے پر بڑی مشکل سے دبایا تھا سب تازہ ہو گئے۔ یہ "سیریس مرض" کیا ہو سکتا ہے؟ یہ صفیہ جانتی تھیں "خدا نہ کرے — خدا نہ کرے۔ کہیں ان کے دشمن — کہیں۔ کینسر کا شکار تو نہیں؟"

دل میں شعلے بھڑک رہے تھے، دماغ میں طوفان اُٹھ رہا تھا، ہاتھ پاؤں پتے کی طرح کانپ رہے تھے، آنکھیں جل رہی تھیں کھڑا نہ رہا گیا وہیں دہلیز پر بیٹھ گئیں۔

گھر میں اتفاق سے سوائے انا بوا اور ملازم کے اور کوئی نہ تھا۔ نرجس اور سلیم مسوری تھے۔ ندیم اور خالدہ کشمیر جا چکے تھے۔ مرکزوں میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ کوئی گھر میں اتنا بھی نہ تھا جس سے وہ دل کی بات کہتیں، یا جو اُن کو سمجھاتا۔

اندر سے حبیب میاں کی آواز آئی۔ "صفیہ کہاں ہو — یہاں آؤ۔" صفیہ کو ہوش آ گیا۔ ان پر کچھ ہی بیت جائے، مگر میاں پر اپنی پریشانی ہرگز ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیں گی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر وہ کیا سوچیں گے ان کے سوا یہاں اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔ اب تو انھیں خود کو بھی سنبھالنا ہے اور میاں کو بھی — وہ اپنی پریشانی ظاہر کر کے میاں کو اور پریشان نہیں کریں گی۔ اور پھر "خدا تو ہے، وہی میرا سہارا، میرا والی۔ وہی میرے وارث کو شفا دے گا۔ ڈاکٹر؟ اُنھ — ان کا کیا ہے، گھڑی میں مایوس گھڑی میں بااُمید۔ سچا بھروسہ تو اسی کا ہے۔ شافی مطلق تو وہ ہے۔ خاک کی چٹکی میں شفا دینے والا۔ مُردوں میں جان ڈالنے والا۔ آہ۔ میں بھی ایمان کی کتنی کمزور ہوں — وہ ان کا اور میرا دونوں کا مالک ہے۔ نہیں صفیہ۔ نہیں۔ یہ وسوسے۔ یہ گھبراہٹ دل سے دور کر دو۔ یہی وقت تو ہے ایمان کی پختگی کے امتحان کا۔ یہی وقت تو ہے طبیعت کی مضبوطی دکھانے کا۔ صفیہ — صفیہ تم اپنا دل فولاد کا بنا لو۔ آنکھیں پتھر کی کر لو۔ میاں کو ذرا سا بھی تمھاری پریشانی کا اندازہ نہ ہو۔ ان کا علاج، تیمارداری، دلداری سب تم ہی

کو کرنی ہے۔ ساری ذمہ داری تم پر ہے۔ صرف تم پر۔ یہ تمھاری سیرت کی
پختگی، اعصاب کی مضبوطی، ایمان کی جانچ اور محبت کی پرکھ کا وقت ہے
صفیہ ۔۔۔۔۔ بد

وہ اس طرح اپنے کو سمجھا رہی تھیں جیسے کسی اور کو سمجھایا جاتا ہے۔
اور چند منٹ بعد جب وہ حبیب میاں کے پاس گئیں تو ان کے لبوں پر اپنی
مخصوص مسکراہٹ موجود تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ صفیہ کہیں بیٹھی رو رہی ہونگی
اور جب آئیں گی تو ان کو سمجھانے بجھانے کا بار ان پر پڑے گا جس کی وہ اپنے
میں سکت نہ پاتے تھے۔ کسی کو جھوٹی تسلی دینا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔
آج ڈاکٹر کی باتوں سے انھیں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب انھیں سفر کی
تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔ دل کی کچھ عجیب حالت تھی۔ مگر صفیہ کا مطمئن
چہرہ اور مسکراتے لب دیکھ کر انھیں بڑا سکون ہوا۔ شاید ڈاکٹر نے انھیں
اطمینان دلا دیا ہے۔

صفیہ ان کے پلنگ کے برابر کرسی پر بیٹھ گئیں اور اپنا ہاتھ حبیب میاں
کی ہتھیلی پر رکھ دیا جس کو انھوں نے اس وقت خلافِ عادت بڑی محبت و
گرمجوشی سے دبایا۔ اپنی بے انتہا مصروفیتوں کی وجہ سے انھیں بیوی کی طرف
توجہ دینے کا کبھی وقت ہی نہ ملتا تھا، جوانی کے ولولہ انگیز دور میں وہ قومی
تحریک اور دیش کی آزادی کی محبت میں ڈوبے رہے۔ اور صفیہ اس رومانی
زندگی کے محض خواب ہی دیکھتی رہیں جن کا ذکر انھوں نے ناولوں اور غزلوں
میں پڑھا۔ سہیلیوں سے سُنا اور جس کو تصورات میں پالا پوسا تھا ـــ اور
حبیب میاں کا خیال تھا کہ گہری اور سچی محبت اظہار کے ہلکے پن کو برداشت
نہیں کر سکتی۔ اور اب تو وہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں کی محبت اظہارِ جذبات

کی حدیں مدت ہوئی پار کر چکی ہے۔ جہاں اتنی گہری دوستی، ایسا اٹل اعتماد اتنی بے پایاں محبت ہو وہاں منھ سے کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

صفیہ کی طبیعت کا بھی انھیں اندازہ تھا کہ وہ خود کتنی شرمیلی اور اس معاملے میں سنجیدہ مزاج ہے۔ کھلا ہوا مذاق بھی ان کی نفاستِ طبع پر بار گزرتا ہے۔ اتنی گہری محبت کے باوجود، خلوت کی تنہائیوں میں بھی انھوں نے کبھی اظہارِ محبت نہیں کیا۔ ہاں چہرہ اور آنکھیں ضرور غمازی کر جاتی تھیں۔ حبیب میاں کو اطمینان تھا کہ اس معاملے میں بھی وہ دونوں ایک ہی سی طبیعت اور خیالات رکھتے ہیں۔

مگر حبیب میاں مرد تھے، سنجیدہ مزاج، پختہ عمر کے مصروف مرد، وہ کیا جانتے تھے کہ عورت کتنی ہی سنجیدہ اور باحیا ہو، لاکھ شرمائے —— لاکھ بے نیازی دکھلائے، لیکن اپنے محبوب شوہر سے محبت کے بول سننے کے لئے اس کی روح ہمیشہ بیقرار رہتی ہے۔ اس کے منھ سے نکلے محبت اور پیار کے بول اس کے لئے انمول جواہرات سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ عورت سمجھتی ہے کہ اس کی محبت کی لطافت اظہار کی تاب نہیں لا سکتی، مگر مرد کی محبت جب تک الفاظ کی شرمندہ نہ ہو مکمل نہیں ہوتی۔

صفیہ بہت کچھ میاں کا مزاج پہچانتی تھیں، ان کی محبت پر پورا بھروسہ بھی تھا۔ مگر آخر عورت تھیں۔ ساری دنیا سے ان کی خصوصیت اور محبت دنیا بھر کے کاموں میں مصروفیت اور انہماک اور خود صفیہ سے بے نیازی ان کی طبعِ نازک پر کبھی کبھی بڑی گراں گزرتی۔ مگر خودداری نے کبھی منھ سے یہ کہنے نہ دیا کہ تمھیں میری پروا کیوں نہیں؟ مگر اس وقت حبیب میاں کے ہاتھ کا دباؤ، آنکھوں اور چہرے کی غیر معمولی چمک۔ گویا ہر چیز سے محبت

کی برکھا ہو رہی تھی۔ صفیہ بیقرار ہو گئیں اور جذبات کی شدت کو چھپانے کے لئے جھک کر اپنے ہونٹ حبیب میاں کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے.....

چند منٹ حبیب میاں ٹکٹکی لگائے بیوی کے سر کو دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے صفیہ کا سر اٹھایا، اپنے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھاما۔ اور دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ کتنی دیر — یہ وہ نہیں بتا سکتے۔ پھر اتنی نرمی، اتنے پیار، اتنے دکھ بھرے احساس کے ساتھ انھوں نے صفیہ کے لرزتے ہونٹوں کا بوسہ لیا جس کا تجربہ انھیں اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ پھر ذرا سا مسکرائے اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

کون سی طاقت تھی، جس نے اس وقت صفیہ کو سنبھالے رکھا؟ ان کے دل پر اس وقت کیا بیت گئی یہ صرف وہ جانتی تھیں یا ان کا خدا۔

۱۷

کئی ڈاکٹروں نے ڈاکٹر رمضان کے ساتھ آکر معائنہ کیا، ایک بڑا ڈاکٹر دہلی سے بلایا گیا۔ پھر سارا بورڈ بیٹھا۔ نئے سرے سے سارے معائنے ہوئے تشخیص وہی ہوئی جس کا اندیشہ تھا، پھیپھڑے میں کینسر تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اس اسٹیج پر پہنچ چکا تھا جہاں ہر چارہ گری بیکار ثابت ہوتی ہے مرض کی نوعیت اور کیفیت نہ صفیہ کو بتائی گئی تھی نہ حبیب میاں کو مگر دونوں اصلیت پا چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے سب حبیب میاں کے دوست اور قدردان تھے اور

جان توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کم سے کم کچھ دن زندگی کے اور بڑھ جائیں اور مرض کی شدید تکلیف میں کمی کر سکیں۔ اسپتال جانے پر نہ حبیب میاں راضی ہوئے نہ صفیہ تیار تھیں۔ گھر پر ہی دن اور رات کی نرسوں کا انتظام کر دیا گیا تھا اور جو بہتر سے بہتر تیمار داری اور دیکھ بھال ہو سکتی ہے وہ ہو رہی تھی۔ مگر مریض کو آرام و سکون نہ مل سکتا تھا۔ اس لئے کہ دن بھر حبیب میاں کے لاتعداد شناساؤں، دوستوں اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے نرسوں کو بھی ہدایت کر رکھی تھی، صفیہ کو بھی تاکید تھی، لکھ کر بھی لگا دیا تھا کہ لوگ ملنے نہیں آ سکتے۔ مگر حبیب میاں کے حکم کے سامنے سب مجبور ہو جاتے۔ وہ مُصر تھے کہ خواہ ایک منٹ کے لئے ملوں مگر ملوں گا ضرور۔ لوگ اتنی تکلیف اُٹھا کر، اپنا کام چھوڑ کر، وقت خرچ کر کے ان کو دیکھنے آئیں اور وہ بڑے آدمیوں کی طرح ملنے سے انکار کر دیں یہ ان کے اصول اور مزاج کے خلاف بات تھی۔ ایک ایک دو دو منٹ کر کے کئی گھنٹے ملنے ملانے میں گزر جاتے۔ صفیہ کی پریشانی پر وہ یہ کہہ کر ان کو تسلی دیتے "ان لوگوں کے آنے سے میرا دل بہل جاتا ہے۔ وقت کٹ جاتا ہے"

حبیب میاں کی ہر دلعزیزی کا اندازہ تو تھوڑا بہت سب کو تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اتنے بہت سے لوگ ان کے مداح و عقیدت مند ہیں۔ حال یہ تھا کہ صبح سویرے سے رات گئے تک پرسانِ حال کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ پڑوسی پر پڑوسی، سوشل ورکرز کا گروہ، اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم اور استاد و استانیاں، رات کے اسکولوں اور تعلیمی مرکزوں میں پڑھنے والے بڈھے اور ادھیڑ عمر کے مرد اور عورت، دفتروں

کے کلرک، منشی اور چپراسی، عدالت کے افسر اور ماتحت لوگ، پھر گھریلو ملازم، بہشتی، دھوبی، بہتیرے بڑے بڑے سیاسی لیڈر، حکامِ شہر اور اسمبلی ممبر، کوئی طبقہ نہ تھا جس کے لئے انھوں نے کچھ نہ کچھ کام نہ کیا ہو یا ان سے تعلقات ہوں اور ان سب ہی کا جی چاہتا تھا کہ حبیب میاں کے لئے کیا کر ڈالیں اور کچھ بس میں نہیں تو کیا خالی مزاج پرسی بھی نہ کریں۔ یہ سوچنے کی زحمت ہمارے دیش کے ہمدرد کب گوارا کرتے ہیں کہ ایک جانِ ناتواں کس طرح پرسانِ حال کو جھیل سکے گی۔ ادھر خاندان میں جس نے ان کی بیماری کا حال سنا دوڑا آیا۔ نرجس اور سلیم تو خالہ خالو کے ساتھ آٹھ دن بعد ہی آگئے تھے حبیب میاں کے چچا حافظ محبوب جو یہاں رہتے تھے اور چچا زاد بھائی احمد علی، ان کی بیوی اور بچے بھی آگئے تھے۔ اور کئی دور دور سے عزیز آئے ہوئے تھے ندیم اور خالدہ کشمیر سے سیدھے سکندرآباد آئے اور احمد آباد جانے کا ارادہ ملتوی کر کے فی الحال یہیں تھے۔ صدیق حسن نے سنا تو وہ اور سکینہ بھی آن پہنچے۔ اور سا جو بھی ان کے ساتھ بچوں اور گھر سب کو چھوڑ چھاڑ چلی آئی۔

اب اس سخت پریشانی کے عالم میں اتنے بہت سے مستقل مہمانوں اور ہر وقت کے پرسانِ حال کی خاطر داری اور مہمان داری کا بوجھ بھی آپڑا تھا۔ صفیہ دو چار دن خاموش دیکھتی رہیں۔ پھر انھوں نے نرجس اور اپنی بہن ذکیہ کو بٹھا کر کہا "بی بی مجھے تو تم بالکل معذور سمجھ لو۔ میں اب ہوئی نہ ہوئی برابر ہوں، تم سے جو ہو سکے کر دو!" بس وہ تھیں اور حبیب میاں کا کمرہ۔ دن بھر پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں کہنے کو رات اور دن کی الگ الگ نرسیں موجود تھیں، مگر نہ حبیب میاں ان سے کام لیتے نہ صفیہ کرنے دیتیں بس دوا دینا، ٹمپریچر لینا، نبض دیکھنا ان کا کام تھا۔ باقی سب کام اکیلی

صفیہ کرتیں۔ رات میں جب بالکل شل ہو جاتیں تو وہیں، پلنگ کے برابر چٹائی ڈال کر وہ ایک گھنٹے کے لئے لیٹ رہتیں۔ گھر بار، خاندان، بچے، ملنا جلنا سب وہ ترک کر چکی تھیں۔ درد اور تکان کی بہت شدت ہوتی تو چپکے سے اسپرین کی تین چار گولیاں کھا آتیں۔ روز کی بیمار نازک مزاج صفیہ ایسا لگتا کہ پتھر کی بن گئی ہیں۔ جنھیں نہ کوئی بیماری اب ستاتی ہے نہ تکان ہوتی ہے۔ شروع میں حبیب میاں نے کئی بار اصرار کیا کہ وہ رات کو دوسرے کمرے میں سویا کریں اور دن کو بھی آرام لیا کریں۔ مگر صفیہ کی حالت دیکھ کر مجبوراً انھیں خاموش ہونا پڑا۔ شاید ان سے دور رہ کر ان کا حال اور خراب ہو جائے گا۔ گھر میں لوگ حبیب میاں کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے بھی کم پریشان نہ تھے مگر کس کی مجال تھی کہ اس مسئلے پر ان سے بحث کر سکے۔ انھوں نے بہن سے بیٹی سے، خالدہ سبھی سے یہ کہدیا تھا کہ میری زندگی چاہتی ہو اور میری کوئی مدد کرنی چاہتی ہو تو وہ صرف یہ کہ مجھے کسی اور جھگڑے میں نہ گھسیٹو۔

ادھر نرجس پر جیسے ایک دم مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ الھڑ، بے فکر، بے پروا لڑکی جسے نہ گھر کی کبھی کوئی فکر ہوئی نہ اور کسی چیز کی۔ اس وقت سارا بوجھ اس پر آپڑا تھا۔ باپ کی شدید بیماری، اور باپ بھی کیسا باپ، جس پر ایک دنیا جان دیتی، سارا قصبہ فخر کرتا تھا۔ ماں کی یہ حالت، مہمانوں کی کثرت خرچ کی زیادتی! ایک مصیبت تھی جس کو جھیلے! یوں خالہ، چچی، خالدہ، ساجو، سکینہ بیگم سبھی اس کی مدد کے لئے دل و جان سے حاضر رہتیں، مگر ظاہر ہے کہ ساری ذمہ داری کا بوجھ تو اس کے کندھوں پر تھا۔ اور سب تو وہ جیسے تیسے جھیل رہی تھی، مگر خرچ کے لئے کیا کرتی؟ لاچار ہو کر ماں سے کہنا ہی پڑتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جو تھوڑا بہت روپیہ بنک میں تھا وہ تو ایک ہفتے ہی

میں خرچ ہو گیا تھا۔ موٹر سب لوگوں کے آنے سے پہلے ہی صفیہ بیگم ڈاکٹر رمضان کی معرفت بکوا چکی تھیں۔ پرانی کار تھی، مشکل سے چار ہزار روپے مل سکے۔ اس کے بعد ان کے بچے کھچے زیور پر نوبت آئی اور جو روپیہ اس سے ملا وہ انھوں نے اپنی بہن کو دے دیا کہ یہ دوا علاج کے لئے الگ رکھو۔ مگر وہ بھی تیزی سے خرچ ہو رہا تھا اور اب نرجس کی عقل حیران تھی کہ کرے تو کیا۔ حبیب میاں کی مالی حالت کا دراصل کسی کو اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ان لوگوں میں سے تھے جو فقیری میں شاہی کرتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی فیاض طبیعت، اپنوں اور غیروں کی دستگیری، ہر ضرورت مند کی مدد کرنا، ہر موقع پر دوسروں کے لئے خرچ کرنا ایسی باتیں تھیں جس کی وجہ سے لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس بہت روپیہ ہے، بھلا جو دوسروں پر اتنا خرچ کرتا ہے اس کے پاس خود بہت کچھ ہوتا ہے، لوگوں کا یہ عام نظریہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت کم و بیش سبھی جانتے ہیں کہ بہت کچھ انھیں کے پاس ہوتا ہے جو کسی کے لئے خرچ نہیں کرتے۔ پھر بھی بعض لوگوں کو اندازہ تھا کہ حبیب میاں پیسے والے نہیں اور خرچ جو بے تحاشہ ہو رہا تھا وہ بھی دیکھ رہے تھے۔ حافظ محبوب نے، صدیق حسن نے اور ان کے دو ساتھی وکلاء نے صفیہ بیگم کو روپے کی پیش کش کی مگر انھوں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ ذکیہ اور ان کے شوہر نے کئی بار ضد کی کہ آپ کسی سے نہ لیں مگر ہم سے قرض ہی سہی لے لیجئے اور پریشانی نہ اٹھائیے۔ صفیہ نے بھرائی آواز میں کہا۔ "ابھی تو ہے جب ایسی ہی ضرورت پڑ جائے گی تو پھر تم سے لینا ہی پڑے گا۔" لیکن ابھی کیا ہے؟ یہ نرجس کے سوا کوئی اور نہ جانتا تھا۔

ندیم کے کشمیر سے آنے کے بعد صفیہ بیگم نے چپکے سے اس کی معرفت

رہنے کا مکان گروی رکھوا دیا۔ اب لے دے کر یہی ایک سرمایہ ان کے پاس باقی رہ گیا تھا۔ یہ مکان بھی حبیب میاں اور صفیہ بیگم کے حصّے کی زمین کملا نگر میں فروخت کر کے بنوایا گیا تھا۔ صفیہ بیگم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے پاس اس کے بعد سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہ رہے گا۔ عاقبت اندیشی ان کے مزاج میں نہ تھی اور حبیب میاں کی صحت کے لئے تو مکان کی کیا حقیقت اپنی جان تک وہ قربان کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

اور جب یہ روپیہ انھوں نے بہن کے پاس رکھوایا تو عزیزوں میں چپکے چپکے خوب باتیں ہوئیں۔ "صفیہ بیگم خاصی دور اندیش نکلیں۔ چپکے چپکے ہی اتنا روپیہ جمع کر رکھا تھا، مگر بھئی بڑے دل والی عورت ہے۔ اپنا اور بچوں کا ذرا خیال نہیں۔ میاں کی بیماری پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہی ہے۔ مگر ــــ غالباً ابھی دس بیس ہزار روپیہ تو اور ہوگا ان کے پاس۔" وہ لوگ کیا جانتے تھے کہ اس کے بعد ان کے پاس بس اللہ کا نام رہ جاتا ہے۔

حبیب میاں کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے بگڑتی گئی۔ تکلیف کی شدت بڑھ رہی تھی۔ پیٹ میں سانس بالکل نہ سماتا تھا۔ دو ہفتے سے آرام سے لیٹ نہ سکے تھے۔ بہت سے تکیوں کے سہارے نیم دراز رہتے یا آگے کی طرف جھکے بیٹھے رہتے۔ ہر آٹھویں دسویں دن پھیپھڑے میں سے پانی نکالا جاتا تھا اور اف کتنا تکلیف دہ عمل ہوتا تھا۔ مگر کیا مجال کہ حبیب میاں کے ابرو پر بل آجائے وہ ہنس ہنس کر ڈاکٹر پر فقرے کستے رہتے اور ڈاکٹر رمضان سوچتے رہ جاتے کہ کس دل گردے کا انسان ہے یہ؟ صفیہ پاس کھڑی ان کا ہاتھ ہاتھ میں لئے یہ سب دیکھتی رہتیں۔ جو سوئی حبیب میاں

کی پسلیوں میں گھونپی جاتی اس کی نوک ان کے دل میں چبھی ہوتی ۔۔ مگر لاکھ ڈاکٹروں کے اصرار پر بھی وہ وہاں سے ہٹتی نہ تھیں ۔ تکلیف کی شدت کم کرنے کے لئے حبیب میاں کو مارفیا یا پیتھیڈین وغیرہ دینی بہت ضروری تھی ۔ مگر حبیب میاں اس کے لئے تیار نہ ہوتے تھے کہ انھیں نشہ آور چیزیں دیکر بے ہوش رکھا جائے ۔ "مُردے کی طرح بے حس پڑا رہ کر زندہ رہنے سے فائدہ ؟ ڈاکٹر صاحب میں ہوش وحواس میں، ہنستا بولتا جانا چاہتا ہوں ۔ اس طرح گھسیٹ لینے سے آپ کو تسلی ہوتی ہو ۔ مجھے نہیں ۔"

"مگر حبیب میاں اس سے تکلیف میں کمی ہوتی ہے ۔" ڈاکٹر رمضان نے سمجھایا ۔

"میں جہاں تک جھیل سکتا ہوں جھیل لوں گا ۔ میرے مالک کا وعدہ ہے کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا ۔۔ جب تکلیف صبر و برداشت کی حدود کو پار کر جائے گی تو وہ آپ اس کو دور کر دے گا ۔"

ان کی برداشت کی یہ غیر معمولی قوت ڈاکٹروں کو حیرت میں ڈالے ہوئے تھی ۔ جس مرض میں انھوں نے لوگوں کو مچھلی کی طرح تڑپتے دیکھا تھا خودکشی کی کوشش کرتے پایا تھا ۔۔ ہاتھ جوڑتے پایا تھا کہ ڈاکٹر ہمیں بے ہوش کر دو ہم سے یہ سب نہیں جھیلا جاتا ۔ اس حالت میں حبیب میاں کہتے تھے کہ میں ہوش وحواس میں رہنا ، ہنستے بولتے وقت گزارنا چاہتا ہوں ، اور وہ واقعی ہنستے بولتے تھے ۔ آنے والوں سے ان کے دکھ درد کی باتیں کرتے ، ان کی دلچسپیوں کا حال سنتے ، اب بھی ان کو مشورے دیتے ، ان کے مسئلے کا حل بتاتے تھے ۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات پر

اب بھی گفتگو کرتے۔ سیاسی بحثیں رک رک کر سہی، اب بھی کر لیتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے "نہیں بھئی، حبیب میاں اچھے ہوجائیں گے، ان میں بڑی زندگی ہے۔ وہ نہیں مر سکتے۔ جھیل جائیں گے یہ بیماری بھی۔ بھلا ان کی صورت مرنے والے کی ہے؟ ڈاکٹر بکتے ہیں کہ مرض لاعلاج ہے......"

مگر جاننے والے جانتے تھے کہ یہ سکون، یہ خوش مزاجی، یہ اطمینان قلب ان کی طبیعت کا خاصہ اور ایمان کا کرشمہ ہے۔ یہ روح کی طمانیت ہے ورنہ جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر صورتِ حال کی نزاکت کا پورا پورا احساس کر رہے۔ ڈاکٹر رمضان مکسچر میں ملا کر تھوڑی تھوڑی مسکن دوائیں انھیں دیتے ضرور تھے۔ مگر ان سے بس انیس بیس کا فرق درد کی شدت میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں سے زیادہ ہر وقت پاس رہنے والے عزیزوں اور دوستوں کو پریشانی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی دماغی قوتیں پہلے جیسی سہی مگر جسمانی طاقت رفتہ رفتہ جواب دے رہی تھی۔

سب سے بری حالت نرجس کی تھی، دن رات روتی مگر باپ کے پاس جانے کے خیال سے کانپنے لگتی۔ اس لئے کہ ان کی صورت دیکھتے ہی وہ بالکل بے قابو ہو جاتی تھی اور کوئی نہ کوئی زبردستی اسے ہٹا کر لے جاتا تھا ــــــ حبیب میاں کے چہرے پہ اس وقت ایک حزیں مسکراہٹ آتی اور آنکھیں بھر جاتیں۔ کنکھیوں سے وہ صفیہ کی طرف دیکھتے جو ویسی ہی بُت بنی بیٹھی نظر آتیں۔ کیا ہو گیا ہے صفیہ کو؟ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ نرجس جوان ہے، نئی زندگی کی رنگینیاں باپ کو بھلانے میں مدد دیں گی۔ سلیم بچہ ہے کسی نہ کسی طرح بہل جائے گا۔ مگر صفیہ؟ اس کا کیا حال ہوگا؟ یہ عورت

جو پرانے زمانے کی ستی عورتوں والا دل لے کر پیدا ہوئی ہے۔ کیسے زندگی بتائے گی۔ پریم کی یہ دیوانی کیا کرے گی؟ وہ صفیہ کی صورت دیکھتے اور سوچتے رہتے۔ انھیں یہ فکر نہ تھی کہ بیوی بچوں کا ان کے بعد کیسے گزارہ ہوگا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ جو کچھ اساسہ، روپیہ، زیور، موٹر اور گھر تھا وہ سب صفیہ ختم کر چکی ہیں، پھر نہ جائداد ہے، نہ بینک میں روپیہ، انھوں نے تو زندگی کا بیمہ تک کبھی نہیں کرایا۔ مگر نہ زندگی بھر انھوں نے کبھی خرچ کی فکر کی تھی نہ اب انھیں یہ فکر تھی کہ ان کے بعد کیا ہوگا۔ اب بھی یہ سب ذمہ داریاں صفیہ کے سر تھیں۔ تب بھی وہی سنبھال لیں گی —— مگر ——

مگر —— خود انھیں کون سنبھالے گا؟

اکثر یہ سوچتے سوچتے وہ صفیہ کا ہاتھ، جو اکثر ان کے ماتھے پر رکھا رہتا تھا، بے ارادے دباتے اور نظریں صفیہ کے چہرے پہ گاڑ دیتے۔ اور صفیہ مسکراتے لبوں سے ان کی طرف دیکھتی رہتیں جیسے ان کے دل کی بات سمجھ رہی ہوں۔ آنکھوں میں جو جوت نظر آتی وہ پریم کی ہوتی۔ آنسوؤں کی دمک نہیں۔

کیسے وہ اتنا ضبط کر رہی ہیں؟ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا —— خود صفیہ بھی نہیں۔

۱۸

جمعہ کا دن تھا۔ کل سے حبیب میاں سخت بے چین تھے۔ بار بار ایک دل خراش آہ ان کے منہ سے نکل جاتی۔ کئی بار ڈاکٹر آئے۔ سکون

کے لئے کئی انجکشن دئے۔ متعدد دوائیں دی جا رہی تھیں، مگر ان کے چہروں
کی سنجیدگی گہری ہوتی گئی۔ صفیہ یوں تو پہلے بھی ہر وقت وہیں رہتی تھیں مگر
آج تو جمعرات کی دوپہر سے جمعہ کی شام ہو چکی تھی، مگر وہ ان کی پٹی سے
سرکی تک نہ تھیں۔ بس یکساں ٹکٹکی لگائے حبیب میاں کے چہرے کو دیکھ رہی
تھیں جو پچھلے دو دن میں کافی سوج گیا تھا۔ اب چند گھنٹوں سے وہ ذرا
سکون سے لیٹے تھے۔ کبھی کبھی بیچ میں آنکھیں کھول کر ذرا سا مسکرا کر صفیہ کو
دیکھتے، گویا اطمینان دلا رہے ہوں۔ مگر پھر فوراً ہی آنکھیں بند کر لیتے۔

سورج ابھی غروب نہ ہوا تھا۔ باہر ڈوبتے سورج کی کرنوں کا گلابی پن
ابھی موجود تھا۔ مگر اندر کمرے میں شام کا دھندلکا چھاتا جا رہا تھا۔ کھلی
کھڑکی سے رات کے تاریک سائے چپکے چپکے، غیر محسوس طور پر کمرے میں
داخل ہو رہے تھے۔ ہر چیز پر ایک پراسرار سی خاموشی مسلط تھی۔

نرس کونے میں پڑی آرام کرسی پر ایک کتاب لئے بیٹھی تھی مگر بار بار
اس کی نظریں مریض کی طرف اٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی وہ پنجوں کے بل بے آواز
چلتی ہوئی آتی، نبض پر انگلیاں رکھتی اور پھر خاموشی سے جا کر کرسی پر ٹک
جاتی۔ حبیب میاں گاؤ تکیے کے سہارے کچھ لیٹے، کچھ بیٹھے غافل سے تھے۔

دبے پاؤں کچھ لوگ کمرے میں داخل ہوئے، سب سے آگے انجم،
اس کے پیچھے گیتا اور سب سے پیچھے ہرش چندر۔ حبیب میاں کے چہرے
پہ نظر پڑتے ہی جو جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

چند منٹ یونہی گزر گئے۔ یکایک حبیب میاں چونک پڑے۔ آنکھیں
کھولیں ۔۔۔ کچھ دیر غور سے دروازے کی طرف دیکھتے رہے ۔۔۔ پھر
بڑے صاف، پرسکون، دلکش لہجے میں بولے: "کون میری گیتا بیٹی؟

آگئی! — بڑی دبلی ہو رہی ہے — ہاں ہاں بیمار ہو گئی تھی — مگر وہاں کیوں کھڑی ہے — میرے پاس آؤ — آؤ انوپم آؤ — تم بھی آ گئے بہت اچھا ہوا ملاقات ہو گئی — شاباش — میرا شیر فرسٹ ڈویژن لایا ہے ....“

انوپم دبے پاؤں آگے بڑھا اور حبیب میاں کی پائنتی جا کھڑا ہوا۔ اسے اپنی مضبوط طبیعت اور سخت دلی کا بڑا دعویٰ تھا مگر اس وقت وہ کس طرح اپنے کو روک رہا تھا۔ اس لئے روک رہا تھا کہ حبیب میاں سے لپٹ کر چیخ چیخ کر نہ رو پڑے۔ آہ، وہ ان کی کوئی خدمت بھی نہ کر سکا۔

گیتا کو لگ رہا تھا کہ زمین کے اندر سے کسی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ حبیب میاں کے دوبارہ بلانے پر وہ تقریباً گھسٹ کر آگے بڑھی۔ اور اپنا سر اُن کی پٹی پر جھکا دیا۔ جس پر انھوں نے بڑے پیار سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ آہ وہ سُبک خوبصورت ہاتھ جو اس وقت ورم سے ڈبل روٹی کی طرح پھولا ہوا تھا۔

ہریش چندر اب تک پردے کی آڑ میں کھڑے تھے۔ بڑے ضابط آدمی تھے۔ مگر اس وقت صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ چاہتے تھے کہ چپکے سے کمرے سے باہر نکل جائیں۔ مگر حبیب میاں کی نظر ان پر پڑ چکی تھی۔ کمرے کی تاریکی اور بڑھ گئی تھی، اس لئے وہ پہچان نہ سکے کہ کون کھڑا ہے۔

”وہ کون ہے صفیہ؟“

صفیہ نے اشارے سے کہا، کوئی نہیں۔

”نہیں، کوئی ہے۔ سسٹر روشنی کرو۔ آہ — ہریش — تم؟“ جیسے تیسے ہریش چندر نے اپنے کو سنبھالا — آگے بڑھے اور

اپنے دوست کا ہاتھ تھام لیا۔ حبیب میاں مسکرائے۔ آہ کتنی حزیں مسکراہٹ!!

"نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے!"

ہریش چندر نے بولنا چاہا مگر کوئی چیز حلق میں آکر پھنس گئی۔

"خیر آتو گئے — بڑے وقت پہ پہنچے پھر بھی۔ میں تمہارا ہی منتظر تھا۔"

گلا صاف کرکے کسی نہ کسی طرح ہریش چندر نے کہا۔

"واہ حبیب تم جیسا آدمی اور یوں مایوسی کی باتیں کرے۔ تم انشاء اللہ بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں — مجھے تو تم امید سے کہیں زیادہ اچھے معلوم ہوئے۔"

"پریشان؟ میں؟" مسکرا کر حبیب میاں نے کہا۔ "نہیں یار۔ اپنا الزام مجھ پر نہ لگاؤ۔ میں تو ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں ؎

دو روز حذر کردنِ از مرگ روا نیست

روزے کہ قضا آمد و روزے کہ قضا نیست

محبوبِ حقیقی کے قاصد کا خوش دلی اور خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرنا چاہیے ہریش۔ ہائے اقبال نے کیا بات کہی ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

ایسی موت خدا مجھے بھی نصیب کرے۔"

وہ چپ ہو گئے اور ہریش چندر نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ارے تم سب بچے اتنے پریشان کیوں کھڑے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔" انھوں نے ذرا دیر بعد کہا۔

گیتا اور انجم قریب پڑی تپائیوں پر ٹک گئے ، مگر لاکھ بولنا چاہا ، کامیاب نہ ہوئے ۔ حبیب میاں نے نرس کی طرف دیکھا ۔

" سسٹر ذرا مجھے آرام سے بٹھا دو ۔ ہاں ۔ اس طرح ۔ اب مجھے سکون محسوس ہو رہا ہے ۔ "

یہ کہہ کر ہریش چندر سے مخاطب ہوئے " کہو بھائی کیا حال ہے تمہارے بمبئی کا ؟ " دو تین منٹ ان سے باتیں کرتے رہے ۔ پھر صفیہ سے بولے ۔ " صفیہ آج تو میں بالکل اچھا ہوں ۔ کئی دن سے بچوں کو نہیں دیکھا ــــ نرجس ، سلیم ــــ خالدہ ، ندیم یہ سب کہاں ہیں ؟ بلاؤ نا انھیں ۔ "

صفیہ نے نرس کی طرف دیکھا ، وہ باہر چلی گئی ۔

" اور حافظ چچا ، احمد میاں ، عطیہ ، ذکیہ سب کو بلا لو ۔ وہ بیچاریاں تو یہاں آتی ہی نہیں ہیں ۔ " وہ ایک ایک کا نام لیتے رہے ۔ اور سب لوگ آہستہ آہستہ کمرے میں آتے رہے ۔ نرس بار بار صفیہ کی طرف دیکھتی ۔ مگر وہ اسی طرح خاموش بیٹھی تھیں ۔

نرجس پچھلے چھتیس گھنٹے میں رو رو کر نیم جاں ہو چکی تھی ۔ اس کی حالت دیکھ کر حبیب میاں نے کہا ۔ " نرجس بیٹا ۔ یہ کیا حال بنایا ہے تم نے ۔ آؤ ادھر میرے پاس ۔ " وہ کانپتی ہوئی آگے بڑھی اور باپ کے سینے پر سر جھکا دیا ۔ انھوں نے جب اپنا ہاتھ اس کی پشت پر رکھا تو وہ کانپ رہا تھا ۔ " بیٹی حوصلہ کرو ــــ صبر ــــ صبر ــــ اپنی ماں کا خیال رکھو ۔ اپنا غم دوسروں کے غم میں ڈبو دینے ۔ اور اس کی رضا پر راضی رہنے ہی سے سکون ملتا ہے آدمی کو ۔ "

سلیم ماں کے پہلو سہما ہوا کھڑا تھا ۔ اس پچھلے ڈیڑھ ماہ میں اس کی

حالت کسی بے ماں باپ کے بچے کی سی تھی۔ باپ اتنا بیمار اور ماں دنیا جہان سے بے خبر۔ گھر کا ہر فرد اس کی دلجوئی کرتا مگر اسے تو ایسی چپ لگی تھی کہ نہ منھ سے بولتا نہ سر سے کھیلتا۔ ذرا دیر تک حبیب میاں اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا اور جب وہ آکر ان کی پٹی پر بیٹھ گیا تو اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ "کیوں یار خفا ہو گیا ہم سے؟ ہمارے پاس آتے ہی نہیں؟ کہو تمھاری پتنگ بازی کا کیا حال ہے۔ کتنے کنکوے کاٹے؟" انھیں یاد تھا کہ سلیم کو پتنگ اڑانے کا شوق ہے۔ اور صفیہ اسے منع کرتی رہتی ہیں۔ چند لمحے تک وہ سلیم کا سر سینے سے لگائے رہے۔ چہرے پر درد و غم کی وہ کیفیت تھی جو بیان نہیں کی جا سکتی۔ اتنے دن میں پہلی بار لوگوں نے دیکھا کہ سلیم سسک سسک کر رو رہا ہے۔

صفیہ نے ہاتھ بڑھا کر سلیم کو ان کے پہلو سے اٹھایا۔ اس کا آنسوؤں بھرا منھ چوما اور پھر بہن کو اشارہ کیا وہ نرجس اور سلیم دونوں کو کمرے سے باہر لے گئیں۔

حبیب میاں ہریش چندر سے مخاطب ہوئے۔ "ہریش، سلیم خدا کے بعد تمھارے حوالے ہے..."

نرس گھبرا رہی تھی۔ "ڈاکٹر کیوں نہیں آچکتا؟" دو بار فون کر چکی تھی۔ اب جلدی سے ایک انجکشن تیار کر لائی۔

حبیب میاں نے کہا۔ "صفیہ ذرا یہ سب تکیے تو ہٹا دو۔ میں آرام سے لیٹوں گا۔"

ہریش چندر اور صدیق حسن نے جلدی سے سب تکیے ہٹائے اور حبیب میاں کو آرام سے سیدھا لٹا دیا۔ صفیہ کی نظروں سے اضطراب

ٹپک رہا تھا۔ مہینہ بھر سے زیادہ ہو چکا تھا وہ دو منٹ بھی اتنے آرام و سکون سے نہ لیٹ سکے تھے ۔ کیا واقعی ان کی طبیعت سنبھل رہی ہے ؟

ذرا دیر تک وہ آنکھیں بند کئے لیٹے رہے ۔ کچھ لوگوں کو نرس نے ہٹا دیا تھا۔ کچھ موجود تھے ۔ کمرے میں عجیب پراسرار سی خاموشی مسلط تھی ہلکے نیلے رنگ کی دھیمی روشنی نے لوگوں کے چہروں کو اور زیادہ پراسرار بنا دیا تھا۔

حبیب میاں نے پھر آنکھیں کھولیں ۔" چچا میاں" حافظ محبوب آگے بڑھے ۔" چچا میاں آخری خدمت آپ انجام دیں گے ۔" آہستہ سے انھوں نے کہا۔ اور پھر نظریں صفیہ پر جا کر جم گئیں ۔ دونوں کی نظریں جیسے بندھ گئی تھیں ۔ آہستہ آہستہ ان کے لب پھڑکے ۔

" صفیہ ۔ خدا حافظ ۔ وہی تمھیں صبر کی قوت دے گا جو میرا ۔۔ تمھارا، سب کا والی و وارث ہے ۔ تمھیں اسی کو سونپا ۔۔ اور سب کو ۔۔۔ سب کو ۔۔ صبر ۔۔"

اسی وقت ڈاکٹر رمضان اور ایک اور ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوئے مگر دروازے ہی پر ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے ......

حبیب میاں کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ نگاہیں خلا میں کھوئی ہوئی تھیں ۔۔ جیسے کسی انجانی، ان دیکھی ہستی کو دیکھ رہی ہوں ۔۔ آنکھوں میں عجیب و غریب چمک تھی اور چہرے کے گرد ایک انوکھی سی روپہلی، نورانی کرنوں کا ہالہ سا پھیل گیا تھا۔ نرس انجکشن ہاتھ میں لئے آگے بڑھی اور پھر مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ گئی ۔۔ ڈاکٹر قریب آئے ۔۔ جھکے ۔۔ نبض پر ہاتھ رکھا ۔۔ اور پھر سر جھکا کر رہ گئے .....

حبیب میاں کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکے۔ پتلیاں پھریں، لب ہلے۔" اللہ۔ اللہ۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ"

حافظ محبوب لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے اور سرہانے کھڑے ہو کر دل دوز، دل سوز لہجے میں سورۂ یاسین کی تلاوت شروع کر دی۔

بند آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے ادھر ادھر ڈھلک گئے۔ بے رنگ ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پیدا ہوئی ــــ اور وہیں جم کر رہ گئی۔

منکا ڈھلک گیا۔ روح ملائے اعلیٰ کی سمت پرواز کر گئی۔

ایک ساتھ کئی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں۔ باہر کے سب لوگ بھی اندر دوڑ پڑے۔ گریہ و ماتم کا وہ طوفان برپا ہوا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔

جب تک حافظ محبوب یاسین شریف پڑھتے رہے صفیہ اسی طرح حبیب میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھی رہیں جیسے انھیں اس حادثے کا علم ہی نہیں۔ آس پاس جو قیامت برپا ہے اس کا احساس ہی نہ ہو۔

مگر جیسے ہی حافظ محبوب نے تلاوت ختم کی اور ایک دلدوز آہ کے ساتھ اپنا سر بھتیجے کی پٹی پر مار کر رونا شروع کیا صفیہ چونک پڑیں ادھر ادھر دیکھا۔ کرسی سے اٹھیں ــــ پھر جھکیں۔ حبیب میاں کی نم، سرد پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا، پیچھے ہٹیں، میاں کا ایک پیر چادر سے باہر نکل آیا تھا۔ جھک کر اسے بوسہ دیا۔ پھر سیدھی کھڑی ہوئیں۔ دروازے کی طرف مڑیں، لڑکھڑائیں۔ دونوں ہاتھوں سے زور سے دل کو پکڑا...

ڈاکٹر اور نرس دوڑے کہ گرتی ہوئی صفیہ کو تھام لیں۔ مگر ان کے پہنچنے سے قبل دھماکا ہوا۔ صفیہ زمین پر گر چکی تھیں۔ گیتا اور نرگس تڑپ کر

ان سے جا لپٹی!

مگر — آہ!! یہ کیا؟ یہ کیا ہوا!!

صفیہ کا جسم حبیب میاں کے جسم سے زیادہ سرد، سخت اور بے حس تھا۔ بڑی ضدی تھیں صفیہ، وہی کیا جو ہمیشہ کرتی آئی تھیں۔ اس بار بھی حبیب میاں کا ساتھ نہ چھوڑا۔ زبردستی ہم سفر بن گئیں۔

۱۹

زندگی اور موت۔ موت اور زندگی!

یہ قدرت کا کیا قانون ہے؟

دانہ پھوٹتا ہے، بالی بن کر لہلہاتا ہے، لاکھوں زندگیوں کو دامن میں سمیٹے۔ اور۔ چورا چورا ہو کر زمین کی غذا بن جاتا ہے۔ کیوں؟

بیج جھجکتے ہوئے زمین سے سر اٹھاتا ہے، سورج کی گرم روشنی، ماہتاب کی خنک چاندنی کی گود میں پلتا ہے — شبنم کا رس پی پی کر نسیم کی گود میں جھول جھول کر پروان چڑھتا ہے۔ تناور درخت بن کر بھولے بھٹکوں کو اپنے سائے میں پناہ دیتا ہے — اور پھر — چوبِ خشک بن جاتا ہے! مگر کیوں؟

کلی شاخ کے بطن میں پلتی ہے، کونپل بن کر جھانکتی ہے، غنچہ بن کر مسکراتی ہے، پھول کے بھیس میں کھلکھلا پڑتی ہے۔ باغ کو زیب و زینت بخشتی ہے، فضا کو معطر کرتی ہے۔ اور۔ پھر پتی پتی ہو کر بکھر جاتی ہے۔ اتنی ناپائدار زندگی لیکر پیدا ہی کیوں ہوئی تھی؟

اور انسان! قدرت کا یہ شاہکار - فطرت کی یہ محبوب مخلوق - اس کی زندگی بھی اسی طرح پنپتی ہے، اُبھرتی ہے، پھیلتی ہے، پھیل کر عالم پر چھاجاتی ہے - اور پھر کمہلا جاتی ہے - خاک میں مل کر خاک ہو جاتی ہے -

اور کبھی کبھی اس مشتِ خاک کی زندگی اتنی بھرپور، ایسی مکمل، اتنی دلکش، اتنی حسین ہوتی ہے کہ قدرت خود جھوم اُٹھتی ہے - ان نادرِ روزگار ہستیوں کی ذات دنیا کے لئے کتنی انمول، کتنی پیاری ہوتی ہے یہ صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جنھیں ان کی قربت کی دولت میسّر رہی ہو، جنھوں نے ان سے کسبِ فیض کیا ہو - جنھوں نے ان کو چاہا ہو یا جن کو انھوں نے چاہا ہو -

اور آہ — ایسی ہستیوں کی موت؟ کتنی سخت — کتنی اذیت ناک، کتنی روح فرسا ہوتی ہے؟

حبیب میاں اور صفیہ بیگم کی وفات ایک ایسا ہی روح فرسا سانحہ تھی - ابھی خاندان کو، دوستوں کو، قوم کو، بستی کو، دیش کو ان کی بہت ضرورت تھی - ابھی تو ان کی تابناک زندگی کا سورج اُبھرنا ہی شروع ہوا تھا - جوانی کا دور ختم کرکے پختہ عمر میں ابھی تو قدم رکھا تھا - پچاس اور بیالیس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے - ابھی تو وہ بہت دن تک اپنے دیس کی خدمت کر سکتے تھے — اتنی قلیل مدت میں انھوں نے کتنا کام کیا - اور زندہ رہتے تو کیا کچھ نہ کر سکتے تھے -

مگر ان کی یہ مختصر زندگی جواب بھی تھی ان سوالوں کا — انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ کیسے محبوب و ہر دلعزیز بن سکتا ہے؟ کیسے اس کی ذات سے ہزاروں کو فیض پہنچ سکتا ہے - کیسے لوگوں کی زندگی شمعِ راہ بنتی ہے؟

اس سانحے کا حال جو سنتا "ہائے یہ کیا ہوا" کہہ کر دل تھام لیتا۔ ان کی ہر دلعزیزی شہر سے نکل دور دور پھیل چکی تھی۔ اس خبر نے ہزاروں، لاکھوں دلوں کو ہلا دیا۔

پھر جب غیروں کا یہ حال تھا تو اپنوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ واقعات اتنے اچانک اور صدمے اتنے روح فرسا تھے کہ کسی طرح سہارے نہ جاتے تھے۔ نرجس اور سلیم کی جتنی ابتر حالت تھی گیتا اور انویم کی اس سے کم نہ تھی۔ ندیم اور خالدہ کو کسی طرح قرار نہ آرہا تھا۔ ساجد الگ تڑپ رہی تھی، سکینہ بیگم الگ رو رہی تھیں۔ بہن، بھاوج اور نند الگ تڑپ رہی تھیں۔ حافظ محبوب کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور سفید داڑھی آنسوؤں سے تر بتر تھی۔ نرجس بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں کی کوششوں سے ہوش آتا۔ اور پھر ایک ہائے کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو جاتی۔ نوعمر سلیم مبہوت بنا دونوں میتوں کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ کبھی ایک کو دیکھتا، کبھی دوسری کو۔ چہرے پر ایسی وحشت آنکھوں میں ایسا کرب تھا کہ ڈاکٹر رمضان دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہو رہے تھے۔ کیسے بچے کو وہاں سے ہٹائیں؟ اُدھر خالدہ کے بین دلوں کو ہلائے دے رہے تھے۔ اِدھر گیتا نے جو صفیہ بیگم کی پٹی پر سر رکھا تو کسی طرح اُٹھا ہی نہیں رہی تھی۔ انویم اور ندیم غم کے مجسمے لگ رہے تھے۔ انویم کو یہ غم تھا کہ وہ پہلے سے نہ آیا۔ کچھ تو میاں کی خدمت کرتا، آپا کا ہاتھ بٹاتا۔ شاید ان پر اتنا سخت بار نہ پڑتا۔ شاید وہ بچ جاتیں.... مگر ــ میاں کے بعد وہ زندہ کیسے رہتیں؟ رہتیں تو زندہ درگور ہو جاتیں... کسی عارف کا یہ قول بار بار اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ "محبت جس کی جھلک مرد کی زندگی میں کبھی کبھی ملتی ہے، عورت کی زندگی کی مکمل تاریخ ہے..."

ہرلیش چندر سر جھکائے حبیب میاں کے پلنگ کے برابر زمین پر بیٹھے تھے کبھی نظریں دوست کی میت کی طرف اٹھتیں جو قوم کا سچا خادم، دیش کا سچا عاشق اور انسانیت کا سچا پرستار، ایک مثالی نمونہ تھا۔ کبھی اس عاشق صادق بیوی کی میت کی طرف دیکھنے لگتے جو پروانہ وار شمع کے گل ہوتے ہی اس پر نثار ہوگئی۔ ہندی عورت کا مکمل روپ! ستی کی زندہ تصویر۔ پریم کی جیتی جاگتی مورتی۔ ان کا دل اور سر عقیدت و احترام سے ان دونوں کی روحوں کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں خشک تھیں، دل رو رہا تھا، مگر دماغ کی گہرائیوں میں فخر و ناز کا جذبہ بھی موجود تھا۔ مبارک ہے وہ دیش جس میں اب بھی ایسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں!!

مجمع پل پل میں بڑھتا جا رہا تھا۔ گھر، باہر، گلی سڑک کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی تھی۔

مگر ایمان کی قوت اور عقیدے کی مضبوطی، صرف یہی ایک چیز ہے جو سخت سے سخت وقت میں آدمی کو سنبھالتی اور سہارا دیتی ہے۔ حافظ محبوب جن کا صدمہ سب سے زیادہ سخت تھا کہ اس ضعیفی میں بیٹے سے زیادہ سعادت مند بھتیجے اور لاڈلی بھانجی کی لاشیں سامنے پڑی تھیں اور وہ زندہ بیٹھے تھے۔ جی چاہتا تھا یہیں سر پھوڑ کر جان دیدیں ــ مگر نہیں ــ خدا کی مشیت میں کیا چارہ ہے؟ اس کی رضا میں کون دخل دے سکتا ہے؟ مسلمان کا فرض تو یہ ہے کہ ہر حال میں دل کی ساری گہرائیوں سے اس بات کا اعتراف کرے کہ "ہم اسی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں (انا للہ و انا الیہ راجعون) عقیدے نے یاد دلایا کہ مسافرانِ عدم کی آخری خدمت جلد سے جلد انجام دینی چاہیئے ..... انھوں نے جیسے تیسے اپنے کو سنبھالا

صدیق حسن اور احمد علی کو سمجھایا اور تینوں اپنے محبوب مسافروں کی آخری منزل کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

اگلے دن صبح نو بجے جب وطن کے ان جانثاروں کی سواریاں آخری منزل کی سمت روانہ ہوئیں تو رخصت کرنے کے لیے سارا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ ان میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی، عیسائی بھی اور سکھ بھی، غریب بھی امیر بھی۔ اتنا بڑا مجمع سکندرپور نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آگے آگے اسکولوں کے نوعمر طالب علم اور اسکاؤٹ اپنے اپنے جھنڈے لیے مارچ کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے حبیب میاں اور صفیہ بیگم کی سواریاں تھیں، گہواروں پر قومی جھنڈے پڑے تھے اور لاتعداد پھولوں اور ہاروں سے میتیں ڈھکی ہوئی تھیں۔ گہواروں کے پایوں میں لمبے لمبے بانس باندھ دئے گئے تھے کہ جوش و عقیدت سے بے چین لوگ کندھا دینے سے محروم نہ رہ جائیں مردوں کے جمِ غفیر کے پیچھے ہزاروں امیر غریب، بڈھی جوان عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ کچھ بڑھیاں بین کر رہی تھیں۔ لڑکیاں سسک رہی تھیں بہت سے بچوں نے سلیم کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا اور اس کے ساتھ خود بھی سسکیاں لے رہے تھے۔

قبرستان پہنچتے پہنچتے مجمع اتنا بڑھ گیا کہ دور دور تک تل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں سروں جائے۔ کلمے کی آواز آہستہ آہستہ آتی رہتی اور پھر کوئی جوشیلا نوجوان حبیب میاں کی جے کا نعرہ لگا دیتا اور کتنے زندھے ہوئے گلے اس آواز کو دہراتے "حبیب میاں زندہ باد — صفیہ بیگم زندہ باد" اور نعرہ لگاتے لگاتے آوازیں ٹوٹ جاتیں۔

کتنا شاندار جلوس تھا۔ کتنا شور و ہنگامہ برپا تھا۔ کتنے نعرے اور جے کارے لگ رہے تھے اور حبیب میاں خاموش تھے۔ کچھ بھی تو نہ کہا۔ ذرا بھی تو منع نہ کیا۔ نمود و نمائش سے بیزار، جلسے اور جلوسوں سے گھبرانے والے، نعروں کو ناپسند کرنے والے، عہدے اور اعزازوں کو ٹھکرانے والے کو آج دنیا دل کھول کر خراجِ عقیدت پیش کر رہی تھی اور وہ بیگانہ، بے خبر، خاموش لیٹے تھے۔ جنھوں نے ساری زندگی خدمتِ خلق کے ریگستان میں کاٹ دی، سماج سیوا کے خارزار کو عمر بھر اپنے خونِ جگر سے سینچا، ہر بدنامی، ہر کٹھنائی، ہر پریشانی کو خاموشی سے جھیلا ــــ کسی بھی غرض کے لئے کسی صاحبِ اقتدار کے سامنے سر جھکایا یا ہاتھ پھیلایا اور نہ ذرائع کی کمی کی وجہ سے کسی کام کو روکا یا بند کیا۔ آج لوگ حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کتنے محبوب تھے! ہزاروں آنکھوں میں سچے غم کے اشک، ہزاروں زبانوں پر سچی تعریف اور دلوں میں عقیدت کے جذبات مچل رہے تھے۔ کتنی تابناک اور مکمل زندگی!! اور کتنی حسین شاندار موت!!

ایسی ہی موت پر تو زندگیاں نثار کی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ہستیاں تو مر کر بھی زندہ رہتی ہیں، جن کا نام باقی رہتا ہے، کام باقی رہتا ہے۔

اور صفیہ تو آج ہر عورت کے لئے ایک مثالی ہستی بن گئی تھیں۔ ہر سہاگن کے دل میں امنگ اٹھ رہی تھی کہ ایسی ہی موت اسے بھی نصیب ہو۔ اور ہر مرد کے دل میں حیرت تھی، عقیدت تھی۔

سب سے پہلے گیتا نے اپنے کو سنبھالا۔ آنکھیں بس میں نہ تھیں، برستی رہیں، دل قابو میں نہ تھا تڑپتا رہا، مگر دماغ کا حکم تھا پاؤں پر چلنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے خالدہ کو سمجھایا کہ اس وقت ہمارا فرض ہے کہ ہم سلیم اور نرجس کو سنبھالیں۔ ایشور نہ کرے کہ ان کو کچھ ہو جائے۔ ساجو تو پہلے ہی سے ان دونوں کی دیکھ بھالی میں لگی ہوئی تھی۔ اب خالدہ اور گیتا نے اپنے مقدور بھر دونوں کو بہلانے کی کوشش کی۔ مگر ان کے خود اپنے دل میں غم اور درد جدائی میں اتنے بیقرار تھے کہ دوسرے کو کیا تسکین دیتیں۔

سکینہ بیگم نے ساجو کی مدد سے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس لئے کہ صفیہ کی بہن ذکیہ اور بھاوج عطیہ خود اس قابل نہ تھیں کہ کچھ کرتیں۔

پرسہ دینے والوں کا ایک سلسلہ تھا جو کسی طرح ختم نہ ہونے میں آتا تھا۔ باہر مرد تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے، مگر اندر عورتیں جم کر بیٹھتیں اور اپنی باتوں سے ماتم داروں کو کچھ اور زیادہ بیقرار کرتیں۔ بہت سے سکندر پور سے باہر سے موٹروں اور ریل سے تعزیت کے لئے آرہے تھے۔ لیکن آنیوالوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پرسا دیں تو کسے؟ کون ماتم دار ہے کون مہمان۔ یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ جس کو دیکھو ایک سے ایک کا ابتر حال۔

رات ہی کو ریڈیو پر اور اگلے دن اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی۔ اور پھر جو تاروں کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا ہی چلا گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تار گھر کا چپراسی دس پانچ تار لے کر آتا اور روتا ہوا واپس جاتا۔ کئی سو تار ایک دن میں آچکے تھے، صدر حکومت کا، وزیر اعظم کا، چیف منسٹر کا تار، پارلیمنٹ کے ممبروں اور مختلف اداروں کے ناظموں کے تاروں کے علاوہ صفیہ اور حبیب میاں کے دور افتادہ دوستوں اور عزیزوں کے سیکڑوں تار آرہے تھے۔ پھر اس سے بھی زیادہ خط اور تار ان گمنام اور انجان عقیدت مندوں اور احسان شناسوں کے تھے جنھوں نے کبھی

نہ کبھی کسی نہ کسی طرح ان سے فیض اُٹھایا، روشنی پائی یا سخاوت ومحبت کی دولت سے سیراب ہوئے تھے۔ کچھ رسمی تار بھی تھے، کچھ مختصر تھے کچھ طویل تھے۔ مگر زیادہ تر میں سچے جذبات غم کا اظہار تھا۔ بعض تار کیا تھے پورے پورے خط تھے درد والم سے بھرے ہوئے۔ الفاظ نہ تھے آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔

انیم اور گیتا ان سب تاروں کو وصول کرتے اور احتیاط سے رکھتے جاتے۔ اگلے دن سے تعزیتی خطوط بھی آنے شروع ہو گئے تھے۔ گیتا نے کسی نہ کسی طرح نرجس اور سلیم کا ذہن اس طرف منتقل کیا۔ خاص خاص تار اور خط لاکر ان دونوں کو سُناتی۔ پھر موقع پاکر سمجھاتی دیکھو ہمارے آپا اور میاں کتنے اچھے تھے۔ کتنے ہر دلعزیز۔ ہمارے غم میں کتنے بہت سے لوگ شریک ہیں۔ ایسے انسان جن کا غم اتنے دلوں میں ہو کتنا بڑا ہوگا؟ ہمارے لئے کیا یہ فخر کی بات نہیں کہ ہم ان کے —— ان کے نام لیوا ہیں۔

پھر تھے دن نرجس اس قابل ہوئی کہ کچھ خط یا تار خود پڑھ سکے سلیم نے بھی جو بہن سے پل بھر کو بھی جدا نہ ہوتا تھا ان کو پڑھنا یا جو سمجھ میں نہ آسکے ان کو سننا شروع کر دیا۔ دونوں بہن بھائی پڑھتے جاتے، روتے جاتے۔ پھر جو تار یا خط آتا اسے بھی پڑھتے، پھر روتے۔ رونے میں اتنی لذت، ایسا سکون، درد کا کچھ ایسا مرہم چھپا ہوا تھا کہ کسی طرح جی نہ بھرتا تھا۔

اور اس حیلے سے کسی نہ کسی طرح ان نوجوانوں نے اس جان لیوا غم کو سہارنے اور وقت کاٹنے کی صورت نکال لی۔ مگر دل کا جو حال تھا اس کا جاننے والا صرف خدا تھا۔ ہر ایک اپنی جگہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جو تعلق مجھے ان دونوں سے تھا ایسا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ نہیں بھر سکتا۔ جو صدمہ مجھے ہے اتنا کسی اور کو نہیں۔

اور یہ محض خود پسندی اور انانیت نہ تھی۔ صفیہ اور حبیب میاں کی اتھاہ محبت کی وسعت کا کرشمہ تھا۔

چوتھے دن سے مجمع چھٹنے لگا اور صرف قریبی دوست اور عزیز رہ گئے ان میں سے کوئی بھی جانے کا ارادہ کرتا تو نرجس اور سلیم اور بھی برا حال کر لیتے رو رو کر۔ اور اب ہر کوئی اس فکر میں تھا کہ کیا کیا جائے۔ ہریش چندر سلیم کو بمبئی لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے لئے جگہ اور ماحول بدلنا اشد ضروری تھا ورنہ اس کے ذہن پر بہت برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مگر نرجس اس کی جدائی کے خیال ہی سے بیقرار ہو جاتی تھی۔ مگر ہریش چندر کے سمجھانے سے یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ سلیم کی صحت اور تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہریش چاچا کے پاس رہے۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ حافظ دادا اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار نہ کریں۔

ہریش چندر کے کام کا بہت ہرج ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ انھیں آئے ہو چکا تھا۔ آخر جب نرجس رضامند ہو گئی تو وہ سلیم کو لے کر بمبئی چلے گئے اور نرجس سے اصرار کر گئے کہ وہ بھی کچھ عرصے بعد ان کے پاس چند دن کیلئے آ جائے۔ صدیق حسن، سکینہ اور رسا جو بھی کملا نگر چلے گئے۔ البتہ حافظ محبوب احمد علی اور ان کی بیوی اور نرجس کی خالہ ابھی تک موجود تھیں۔ انوپم، گیتا خالدہ اور ندیم تو تھے ہی اور سخت پریشان کہ نرجس کو کس پر چھوڑیں اور کہاں چھوڑیں؟

خود نرجس دن رات اسی فکر میں گھلی جا رہی تھی۔ ماں باپ کا صدمہ ایک طرف اور اپنے مستقبل کی فکر دوسری طرف اسے کھائے جا رہی تھی۔

کیا ہوگا؟ وہ کیا کرے؟ باپ سدھار گئے، ماں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور دونوں اسے تنہا اس دُنیا میں چھوڑ گئے۔ کوئی بڑا بھائی بہن نہیں۔ کوئی سگا چچا یا پھوپی نہیں۔ جائیداد نہیں، روپیہ نہیں ۔۔ گھر تک نہیں اب تو۔ وہ کہاں جائے گی؟ کیا ان لوگوں کی دست نگر بن کر رہے گی جو کل تک اس کے باپ کے رہینِ منت تھے؟ مانا کہ ندیم اور انوریم، خالدہ اور گیتا نے سگے بہن بھائی کی محبت کی بھول بھلا دی ہے۔ لیکن غیر پھر غیر ہیں۔ اور اپنے؟ ہنھ! ان اپنوں سے تو یہ غیر میرے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ بڑے میاں اور ان کا بیٹا بہو؟ ان لوگوں سے اسے خدا جانے کیوں بدگمانی ہی نہیں بغض لِلّٰہی تھا۔ خالہ کو البتہ وہ بہت چاہتی تھی اور وہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مگر خالو اس قدر قدامت پسند اور تنگ نظر تھے کہ ان کے ساتھ رہنے کا خیال ہی نرجس کے لئے سوہانِ روح تھا۔

اپنی حالت پر اسے اور زیادہ رحم آجاتا۔ خود رحمی کے اس جذبے نے اسے ہسٹریا میں مبتلا کر دیا۔ دن میں دو تین بار اسے دورہ پڑجاتا تھا۔ اور لوگ اور زیادہ اس فکر میں الجھ جاتے کہ اس لڑکی کا کیا کیا جائے!

حافظ محبوب اور احمد علی کہتے تھے کہ اس کی شادی جلد سے جلد کر دی جائے۔ احمد علی کا بڑا لڑکا مسعود انجینئرنگ میں پڑھ رہا تھا اور بقول حافظ جی کے جوڑی خدا نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ لیکن نرجس یہ نام بھی سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ خالہ جانتی تھیں کہ اس خاندان میں نرجس ہرگز شادی نہ کرے گی۔ وہ بھانجی کی نازک مزاجی، حساس اور خود دار طبیعت سے بھی واقف تھیں اور خود رائی اور آزادی پسندی سے بھی۔ اس لئے یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ بھی خوش نہ رہ سکے گی۔ اور وہ بے چاری بھی

دن رات اسی فکر میں مبتلا تھیں کہ کریں تو کیا۔ نہ بھابی کو چھوڑتے بنتا تھا نہ وہ ان کے ساتھ جانے پر راضی تھی ادھر ان کے میاں کے خط پر خط آرہے تھے کہ وہاں کیا کر رہی ہو اب، آتی کیوں نہیں!

G. G.

۳۰

وقت سب سے بڑا امرہم ہے۔ کاری سے کاری گھاؤ کو مندمل کر دیتا ہے۔ زمانہ جیسے جیسے گزرتا ہے درد و غم کی ٹیسیں ہلکی پڑتی جاتی ہیں۔ سوگوار بھی غم کا پہلا ہلہ گزر جانے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ وہ کتنا ہی روئیں پیٹیں، اپنے کو تباہ کریں مگر جانے والا واپس نہیں آتا ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

کس کی یہ مراد بر آئی ہے؟ کس کا کھویا ہوا پیارا واپس ملا ہے۔ بقول شخصے صبر کیا جبر ہے، نہ کریں گے تو کریں گے کیا؟ پھر قدرت نے انسان کے دل میں زندگی سے پیار کچھ اس شدت سے رکھا ہے کہ وہ بڑے سے بڑا صدمہ، سخت سے سخت تکلیف جھیل جاتا ہے اور زندگی کی ڈور ہاتھ سے نہیں چھوڑتا زندہ رہنے کی خواہش ہر حال میں دل میں چھپی رہتی ہے۔ اگرچہ شاذ و نادر ایسی ہستیاں بھی نظر آجاتی ہیں جو کسی ناکامی کے صدمے یا پیارے کی جدائی کو برداشت نہیں کر پاتیں اور زندگی کی ڈور کو ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہیں، زندہ رہنے کی تمنا ان کے دل سے نکل جاتی ہے۔ اور پھر وہ زندہ رہ بھی نہیں سکتیں۔ لیکن ان چند مستثنیات کو چھوڑ کر، عام طور پر یہ خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ انسان کسی نہ

ان کے مستقبل کی فکر ہر ایک کو ہے اور ہونی چاہیئے۔ لیکن وہ بدنصیب جب
کو وہ دونوں بچوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ جس کے مستقبل کی انھیں نرجس
سے زیادہ فکر تھی۔ اور جس کا ان کے بعد ___ دنیا میں کوئی نہیں ___ کوئی
بھی نہیں وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ یہ سوچنے کی زحمت کوئی کیوں کرتا؟
اب تو خود گیتا ہی کو سوچنا ہے کہ آئندہ وہ کیا کرے گی؟

کچھ دن تک ندیم گیتا سے رکا رکا اور جھینپا جھینپا سا رہا۔ لیکن جب
اس نے دیکھا کہ گیتا پر پچھلی باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں نظر آتا، بلکہ وہ
کھلے دل سے ملتی تو خود بھی رفتہ رفتہ نارمل حالت پر واپس آگیا۔ خالدہ کے
رشتے سے ندیم اس کا چھوٹا بہنوئی ہے۔ اور وہ اس کو "بھیا" کہے گی۔ یہ
بات ندیم پر گیتا نے واضح کر دی تھی۔ دونوں میں اکثر باتیں ہوتی رہتیں۔ کبھی
نرجس اور سلیم کے مسئلے پر، کبھی خالدہ کی اور اس کی لڑائی چکانے پر، اور اکثر
محبوب ترین موضوع یعنی "میاں" اور "آپا" پر۔ اس کے برعکس انوپم بہت
کم گھر میں آتا۔ اور آتا بھی تو دونوں میں بات چیت برائے نام ہی ہوتی۔
ان سانحوں کا جتنا گہرا اثر گیتا اور انوپم پر تھا اتنا کسی اور پر نہ تھا۔ دونوں
اس ذکر کو ایک دوسرے کے سامنے چھیڑنے سے بچتے تھے، اور اس ذکر
کے سوا کوئی دوسرا ذکر کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دوسرے لوگ رو پیٹ کر
دل کی بھڑاس نکال رہے تھے اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ سنجیدگی سے یہ
سوچ رہے تھے کہ کیسے اپنے محسنوں کے کام اور یاد کو باقی رکھیں؟

چہلم پر پھر بہت سے لوگ شرکت کے لئے آئے، لکھنؤ کے ایک بڑے

عالم نے چہلم کی مجلس پڑھی۔ رات کو فاتحہ ہوئی اور پچاس غریبوں کو کھانا کھلایا گیا اور اگلے دن شام تک سب لوگ واپس چلے گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ پرسوں نرجس کو علی گڑھ جانا تھا اور کل نرجس کی خالہ اور ان کے ساتھ صفیہ بیگم کی چاہنے والی بڑھی بدنصیب اتا بوا جانے والی تھیں۔ وہ ان کے مرنے کے بعد سے عجیب بہکی بہکی سی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ خود روتیں سب کو رلاتیں اور پھر اس طرح باتیں کرتیں جیسے صفیہ بیگم ان کے سامنے بیٹھی ہوں۔ بالکل ننھے بے ماں کے بچے کی سی حالت ہوگئی تھی غریب کی۔

گیتا اور خالدہ پلنگ پر بیٹھی نرجس کے کپڑے درست کر رہی تھیں اور نرجس اپنی خالہ کے ساتھ اندر کمرے میں تھی۔ باہر سے ندیم آکر برابر کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"خلن ہم بھی پرسوں روانہ ہو جائیں گے احمد آباد۔"

کیوں؟ پہلے کملا نگر نہیں جائیں گے؟ ابھی تو چھٹی کے دس دن باقی ہیں؟ التجا آمیز لہجے میں خالدہ نے پوچھا۔

"ہنھ، تمھیں تو کملا نگر کا کلمہ رہتا ہے ہر وقت۔ کیا دھرا ہے وہاں۔"

بیزار سا ہو کر ندیم نے جواب دیا۔

"آپ کے لئے نہ ہو۔ میرے تو سب پیارے وہیں ہیں۔" روٹھی ہو کر خالدہ نے کہا۔

"سب پیارے؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر اور آنکھیں چار کر کے پھر تو کہنا!"

شرارت سے مسکرا کر ندیم نے بیوی کی طرف دیکھا۔ خالدہ نے شرما کر گردن جھکالی۔ کتنے بڑے ہیں دیدی کے سامنے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اس نے سوچا۔

گیتا نے دیکھا کہ یہاں میاں بیوی میں چہلیں شروع ہوگئی ہیں، تو وہاں سے جانے کے لئے اُٹھی۔

"ارے ارے کہاں۔ کہاں چلیں ملانی جی۔ بیٹھو بھئی، اب کچھ نہ کہوں گا" ندیم نے گیتا کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ اور گیتا مسکرا کر پھر بیٹھ گئی۔

"تم کب جا رہی ہو گیتا؟" ندیم کئی دن سے یہ بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔

"پتہ نہیں۔"

"تم بھی پرسوں ہی بمبئی روانہ ہو جاؤ۔ تمھارا کالج تو شاید کھل بھی گیا ہو۔"

"مگر میں تو بمبئی جا ہی نہیں رہی ہوں۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں جا رہی ہو؟"

"میں اب پڑھنا نہیں چاہتی۔ پڑھ سکتی بھی نہیں۔"

"پاگل ہوئی ہو؟ سال بھر کی محنت برباد کرنا چاہتی ہو۔ اوہ۔ اب سمجھا۔ خرچ کی تم اتنی فکر کیوں کرتی ہو گیتا۔ ہریش صاحب ضرور کچھ انتظام کرا دیں گے — پھر — آخر — میں بھی تو ہوں — جتنی بھی ضرورت ہو مجھ سے لے سکتی ہو....."

"نہیں بھیا — یہ بات ...."

"گیتا تم کچھ خیال نہ کرو — خالدہ بڑی کنجوس مہاجن ہے۔ ایک ایک پیسہ مع سود کے واپس لے لے گی۔"

یہ پیش کش جس خلوص اور محبت سے کی گئی تھی اس کا گیتا کے دل پر بہت اثر ہوا۔

"بھیا۔ میں آپ کی محبت اور خیال کا شکریہ ادا کر کے اس کی توہین نہیں کرنا چاہتی۔ آپ دونوں کے سوا میرا اب اور ہے بھی کون"؟ بھر آئی

آواز میں گیتا نے کہا۔

"اے واہ دیدی — بچارے انو بھیّا نے کیا قصور کیا ہے؟" خالدہ نے مسکرا کر آنکھیں مٹکا کر کہا۔ گیتا نے بات سُنی ان سُنی کر دی۔

"تو پھر تم پرسوں بمبئی روانہ ہو جاؤ۔ کرائے کے لئے میں ....." مگر ندیم کی بات گیتا نے کاٹ دی۔

"مگر میں نے طے کر لیا ہے ندیم بھائی میں اب بمبئی نہ جاؤں گی۔"

"کیوں اپنا مستقبل تباہ کرنا چاہتی ہو۔ وہاں سے ایم۔ اے کے بعد تمھیں اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ آئندہ کے لئے بھی ترقی کے بڑے امکانات ہوں گے اور اب۔ اب تو سو سوا سو کی بھی نہیں ملے گی۔"

"میں اچھی نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔" فیصلہ کن لہجے میں گیتا نے کہا۔

"تو — یعنی — آخر — میرا مطلب ہے، کیا بہت جلد نئی زندگی میں ....." ندیم نے مسکرا کر کہا۔ مگر گیتا نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں بھیا۔ اب ایک نئی زندگی شروع کروں گی۔ میاں کی کتنی خواہش تھی کہ میں کملا نگر میں رہ کر وہاں عورتوں میں تعلیمِ بالغان کا اور سماج سدھار کا کام کرتی رہوں۔ مگر مجھ بدبخت کو ایسے حالات پیش آئے کہ یہ آرزو ان کی پوری نہ کر سکی۔ اور وہاں سے چلی آئی — اب میں نے طے کیا ہے کہ میں باقی زندگی کملا نگر میں ہی گزاروں گی۔ اور جو کچھ میرے بس میں ہے اس کی سیوا کروں گی۔"

ندیم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا تم دونوں یہ بات آپس میں طے کر چکے تھے؟"

"کون دونوں ؟" اسی حیرت سے گیتا نے پوچھا۔

"تم اور انوپم اور کون "۔

" انوپم ؟ وہ تو یقیناً بمبئی جانے والے ہیں ۔ ان کی فرسٹ کلاس آئی ہے ۔ اسکالرشپ بھی ملتا ہے گا ضرور "۔

" مگر وہ احمق بھی یہی کہہ رہا ہے جو آپ عقلِ کُل فرما رہی ہیں "۔

"یعنی ؟"

"یعنی کہ اسے ڈگری کی ضرورت نہیں ۔ بڑی نوکری نہیں چاہیئے ، عہدہ اور دولت کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا ـــ وہ کملا نگر یا سکندر پور میں رہ کر میاں کے کام کو جاری رکھے گا ـــ وہ صفیہ بیگم اور حبیب میاں کی زندگیوں کو اپنا معیار بنانا اور ان کی یاد کو باقی رکھنا چاہتا ہے ... کہ ساری زندگی خدمتِ خلق کے لئے وقت کرنا چاہتا ہے ـــ اور خدا جانے کیا کیا بکتا ہے ـــ تم لوگ ٹھہرے آدرش وادی ـــ ہم جیسے معمولی آدمی تو تم لوگوں کی باتیں پوری طرح سمجھ بھی نہیں پاتے "۔ کچھ طنز سے ندیم نے کہا ۔

گیتا مبہوت بنی ندیم کی باتیں سنتی رہی ۔ انوپم نے بھی وہی طے کیا جو خود اس نے ؟ اتنی ہمخیالی ؟ ایسی ہم رنگی ـــ ایک بات بھی اس سلسلے میں ہم دونوں میں نہیں ہوئی ۔ مگر دونوں نے ایک ہی فیصلہ کیا ۔

" ہم سے چھپاتی ہیں دیدی ۔ ضرور پہلے سے ان میں اور انو بھیا میں بات طے ہو چکی تھی "۔ خالدہ نے ہنس کر کہا ۔

" تیری جان کی قسم خلن ـــ مجھے تو ان کے ارادے کی ذرا بھی خبر نہ تھی ۔ مجھے تو خود حیرت ہے کہ انھوں نے بھی وہی سوچا جو میں نے "۔

" ہاں بھئی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے نا ۔ جو تم نے سوچا ـــ اس نے

یہ جاننا کہ گویا یہ بھی اس کے دل میں ہے!" ندیم آج گیتا کو پریشان کرنے پر تلا ہوا تھا۔

گیتا تیوری پر بل ڈال کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ تیز تیز انوپم گھر میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں ایک لمبا سا زرد لفافہ لئے ہوئے۔

"گیتا — نرجس — ندیم — لو — یہ دیکھو — مبارک ہو" جوش میں انوپم کی آواز کافی اونچی ہو گئی تھی۔ اندر سے نرجس اور اس کی خالہ بھی نکل آئیں۔

"کیا ہے کیا؟" ندیم نے پوچھا۔

"اتنے خوش کس بات پر ہیں؟" گیتا نے سوال کیا۔

"میری زندگی میں خوشی کی بات ہی کون سی رہ گئی ہے" اداس لہجے میں نرجس بولی۔

"خوشی کی بات کیسے نہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لئے کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ہماری آپا اور میاں کی اتنی بڑی یادگار قائم کی جائے۔" انوپم کو اتنے جوش میں کسی نے کم دیکھا تھا۔ وہ خاموش اور کم آمیز قسم کا آدمی تھا اور اپنے جذبات مسرت و غم دونوں پر قابو رکھنے والا۔ مگر اس وقت معلوم ہوتا تھا پوری بوتل لنڈھا کر آیا ہے۔ "ارے بات تو بتاؤ پہلے کیا ہے" اشتیاق سے گیتا نے کہا۔

"نہیں قابلیت تو بگھاریں پہلے۔" الجھ کر ندیم نے کہا۔

"حکومتِ ہند نے طے کیا ہے کہ حبیب میاں اور صفیہ بیگم کے وطن کو ایک مثالی قصبہ بنایا جائے گا۔ اس کے لئے کئی لاکھ کی اسکیم بنائی جا رہی ہے۔ وہاں ہوادار روشن مکان بنیں گے۔ سڑکیں بنیں گی، عورتوں اور بچوں

کے پارک ہوں گے، ورزش گھر، اور اکھاڑے بنوائے جائیں گے۔ نل، بجلی
اور آبپاشی کے لئے ٹیوب ویل لگیں گے۔ کوآپریٹیو سوسائٹیاں بنیں گی۔
گھریلو دستکاریوں کے مرکز قائم ہوں گے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے
پرائمری اسکولوں اور ساتھ ہی ہائی اسکول بنانے کی اسکیم بھی ہے۔ بچوں کے
لئے بال واڑی ہوگی۔ تعلیم بالغان کا مرکز کھلے گا۔ ہسپتال، ڈاکخانہ، اسٹیشن
سبھی کچھ تو بنوانے کی تجویز ہے۔ اسٹیشن کا نام حبیب پورا ہوگا، اسپتال کا
صفیہ ہاسپٹل اور نرسری کا صفیہ بالواڑی۔ لو۔ تم۔ تم خود پڑھ لو نا۔"
انوپم نے خط ندیم کے ہاتھ میں دیا مگر اس سے گیتا نے چھین لیا اور بیقراری
سے نظر ڈالنے لگی۔ پھر زجیس، ندیم سب نے پڑھا اور خالدہ اور ذکیہ کو
پڑھ کر سُنایا۔ سب کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو اور چہروں پر فخر و ناز کا
گلابی رنگ تھا۔

ندیم نے کچھ بیزاری اور حسبِ عادت شکی انداز میں کہا: "ہاں۔ جب
کچھ ہو جائے تب کی بات ہے۔ مجھے تو اندیشہ یہ ہے کہ لاکھوں کی اسکیم
منظور ہوگی۔ خرچ بھی ہوگا۔ کھانے والے کھائیں گے۔ مگر اصلی تعمیری
کام کچھ بھی نہ ہوگا۔ کرنے والے کچھ کریں گے نہیں۔"

"ہاں بیشک اگر کرنے والوں کو اپنا کیریر، اپنا مستقبل زیادہ پیارا
ہوگا، اچھی نوکری، عہدہ اور دولت کے پیچھے دوڑیں گے، اپنا آرام،
اپنا فائدہ دیکھیں گے تو بے شک کچھ نہ ہوگا۔" تیز لہجے میں گیتا نے ندیم سے کہا۔

"تمہارا مطلب اس سے کیا ہے؟" اس سے بھی تیز لہجے میں ندیم
نے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے ندیم صاحب" بجائے گیتا کے انوپم نے جواب دیا: "کہ

کیا آپا اور میاں کا حق حکومت کو ادا کرنا چاہیے اور خود ہم لوگوں پر ان کا کوئی حق نہیں؟ ہمارا فرض حکومت پر تنقید کرنے اور ان پر چند آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہیں؟ انھوں نے ہمیں خاک سے پاک کیا۔ ہمیں دنیا میں رہنے کا گر سکھایا، ہمیں سیوا اور پریم کا سبق دیا، کچھ کرنے کی لگن دی۔ کیا اب ہمارا یہ آدرش نہیں ہونا چاہیے کہ ان کی یادگار کو سچ مچ ایک مثالی نمونہ بنا کر دکھائیں؟ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری کیا حکومت سے زیادہ خود ہم پر نہیں؟ کیا میاں اور آپا کا گاؤں خود ہمارا وطن، ہمارا گھر نہیں بن سکتا۔۔۔۔" اتنے جوش میں تقریر کرتے اس سے پہلے انوپم کو کم دیکھا گیا تھا۔

"ہاں وہی ہمارا وطن ہے۔ کملا نگر جواب جیب، پیدا ہو گا ایک آدرش بستی بنے گی۔ ان کے نام کے شایانِ شان۔ جو سبق ہم نے اپنے محسنوں سے پڑھا تھا۔ آج اس کے امتحان کا وقت آگیا ہے انوپم! اور میں تو یہ فیصلہ بہت دن پہلے ہی کر چکی تھی کہ میری زندگی کملا نگر کی خدمت میں گزرے گی۔" گیتا نے صداقت و خلوص میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"اور آپ کا یہ خادم و پرستار بھی مہینہ بھر سے یہی سوچے بیٹھا تھا۔" مسرت سے کھِل کر انوپم کہہ بیٹھا۔

"اور اب یہ بھی یہی کریں گے انو بھیا۔ وہ منھ سے نہ کہیں مگر انھیں بھی چچا جان اور چچی جان سے ایسی ہی محبت ہے جیسی آپ لوگوں کو۔ اور ــــ" خالدہ نے پیار بھری نظروں سے میاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اس میں اپنے دیس کی محبت کا جذبہ اور لگن بھی آپ سے کم نہیں۔ بس بات یہ ہے کہ آدمی ہے عالی ظرف اور گہرا ـــ منھ سے کہتا

کم ہے۔ کر کے زیادہ دکھاتا ہے۔" ندیم نے اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز انداز میں انوپم کا منھ چڑاتے ہوئے کہا۔ اور انوپم نے بے اختیار اس کو لپٹا لیا۔

"ارے ارے۔ گیتا دیدی۔ بھئی۔ تمھیں کیوں بُرا لگ رہا ہے۔ توبہ ۔ توبہ۔ ہاں تو خلن بٹیا ___ اپنا بھی بوریا بستر بندھ جائے۔ احمد آباد کے لیے نہیں ___ حبیب پورا کے لئے ___" ندیم نے کہا تو خلن بگڑ گئی۔" پھر آپ نے مجھے ___ یہ کہا ___"

"ارے اتنے برسوں سے بٹیا کہتے آرہے ہیں۔ چھوٹتے چھوٹتے عادت چھوٹے گی۔"

نرجس اتنی متاثر تھی کہ کچھ دیر بول ہی نہ سکی۔ ان لوگوں کو امّی اور میاں سے کتنی گہری عقیدت۔ کتنی سچی محبت ہے اس کا پورا اندازہ اسے اس وقت ہوا۔

"میں آپ لوگوں جتنا ایثار تو نہیں کر سکوں گی۔" کچھ دیر بعد نرجس نے کہا۔" اس لئے کہ ایم۔ اے تو ضرور کروں گی ___ امّی کی تمنّا تھی کہ میں اردو میں ایم اے کروں ___ پھر میں بھی گیتا اور خلن تم لوگوں کے پاس آکر تم سے کچھ سیکھوں گی ___ حبیب پورا کی خدمت سے بڑھ کر عزت، مسرت اور سکون مجھے دنیا میں کہاں نصیب ہوگا؟" اور نرجس کی آواز یہ کہتے کہتے سسکیوں میں ڈوب گئی۔ گیتا نے ایک باہنہ اس کے گلے میں ڈال دی۔ اپنا چہرہ اس کے چہرے سے ملا دیا۔ اور دونوں کے آنسو ایک ہی دھارے میں بہنے لگے۔

۲۱

کملا نگر نے جب یہ خبر سنی کہ حبیب میاں کی یادگار میں اس کی ترقی اور بہبود کی اسکیم منظور ہوئی ہے اور اس کے پرانے سپوت پھر آرہے ہیں تو غم و خوشی کے ملے جلے آنسوؤں سے لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ بعض ایسے خود غرض لوگ بھی ضرور تھے جو سمجھتے تھے کہ ان کے مفاد کو ممکن ہے اس نئی اسکیم سے نقصان پہنچے اور انھوں نے لوگوں کو بھڑکانے کی کوشش بھی کی، مگر کملا نگر والوں میں پچھلے تین سال میں اتنا شعور پیدا ہوچکا تھا کہ وہ اپنا برا بھلا پہچاننے اور دوست دشمن میں تمیز کرنے لگے تھے۔

جس دن انوپم، گیتا، ندیم اور خالدہ کملا نگر پہنچے تو کالو گنج کے اسٹیشن پر جو کملا نگر سے تقریباً پانچ میل دور تھا۔ سو کے قریب آدمیوں کا مجمع ان کے استقبال کے لئے جمع تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔ خاصی ایک میلے کی سی گہما گہمی لگ رہی تھی۔ شبراتی اور سابو، چودھری نرائن اور نا تھولال، جمن اور رامو، بھولا اور رمضان، موتی بیگم، سکینہ بیگم، سعیدن اور صدیق میاں اور یہی نہیں ابن میاں تک آئے تھے، جو سب سے آگے کھڑے اپنی خلن بٹیا اور گیتا بٹیا کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ٹھاکر سندر سنگھ جو سب سے زیادہ متاثر اور بے چین تھے وہ سب سے آخر میں آئے اور سب سے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ غمگین پریشان اور پشیمان۔ حبیب میاں کی صورت رہ رہ کر ان کی آنکھوں میں پھر جاتی اور بار بار انھیں اپنے کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں پونچھنی

پڑتی تھیں۔

جیسے ہی ٹرین کالوگنج کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی، پُرجوش نوجوانوں نے حبیب میاں کے جے کارے پکارنے شروع کر دئے۔ اور ان لوگوں کے اُترتے ہی گاؤں کے بہت سے بچوں نے گھیرے میں لے کر ان کے گلے میں گیندے کے ہار ڈالنے اور پھولوں کی بارش کرنی شروع کر دی۔ ابن میاں نے بڑھ کر گیتا اور ظلن کو گلے سے لپٹا لیا اور خوشی کے جوش میں یہ بھی دھیان نہ رہا کہ ظلن برقعہ اوڑھے نہیں ہے۔

"حبیب میاں کی جے" "صفیہ بٹیا کی جے" "کملا نگر زندہ باد" اور "حبیب پور زندہ باد"۔ "پنڈت نہرو کی جے" کے ساتھ ساتھ بعض بچے بچیوں نے "گیتا دیدی کی جے" اور انویم بھیا اور ندیم بھیا کی جے کے نعرے بھی لگانے شروع کر دئے تھے۔ مگر بار بار لوگوں کی آواز شدتِ جذبات میں گھٹ جاتی اور اپنے محبوب محسن کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی جس کا فیض مرنے کے بعد بھی جاری تھا۔

سب سے آخر میں آہستہ آہستہ ٹھاکر سندر سنگھ آگے بڑھے۔ ندیم اور انویم سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر ایک لمحے تک گیتا کی طرف تاکتے رہے۔ گیتا جس کا دل پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا اپنے آنسو نہ روک سکی۔ جانے ماموں اس سے بولیں گے بھی یا نہیں۔ جیسے ہی وہ پاس آئے وہ ان کے قدم چھونے کو جھکی۔ مگر انھوں نے اسے جلدی سے روک کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ اور گیتا کا سر ان کے آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

حکومت کی اسکیم منظور ہوتے ہوتے ہو گی اور پھر منظوری کے بعد اس کی

کارروائی شروع ہونے اور روپیہ ملنے میں خدا جانے کتنی دیر لگے گی۔ مگر ان لوگوں کو اس کی پروا نہ تھی۔ انھوں نے آتے ہی کام شروع کر دیا۔ پہلے سے زیادہ جوش، لگن اور ولولے کے ساتھ۔ گیتا نے لڑکیوں کا اسکول شروع کر دیا۔ خالدہ نے نرسری کی داغ بیل ڈال دی۔ عورتوں کا تعلیم بالغان کا مرکز ساجو پہلے ہی سے چلا رہی تھی اب اسے اور ترقی دی گئی۔ شبراتی کواپریٹیو سوسائٹی کا پہلے ہی سے سرگرم کارکن تھا۔ اب اس کو بھی ترقی دیدی گئی۔ ندیم اپنے لڑکوں کے اسکول کی حالت سدھانے میں جٹ گیا۔ اور انویم نے سماج سدھار کے بکھرے کاموں کو سمیٹنے اور ان میں نئی زندگی پیدا کرنے کی انتھک کوشش شروع کر دی۔ اب گاؤں والوں کا تعاون اور مدد پہلے سے کہیں زیادہ مل رہی تھی۔ اور صدیق حسن جو پنشن لے چکے تھے اور ٹھاکر سندر سنگھ اب ہر کام ہر چیز میں ان لوگوں کے شریک، مددگار اور مشیر تھے۔

چند مہینے کے اندر ہی اندر اسکیم کی منظوری آگئی۔ اور ندیم، انویم، گیتا، خالدہ اور ساجو کی باقاعدہ تقرری کی منظوری تھی۔ ندیم لڑکوں کے "حبیب ہائی اسکول" کا ہیڈ ماسٹر، انویم سماجی کاموں کی پوری اسکیم کا انچارج گیتا "صفیہ گرلز اسکول" کی ہیڈ مسٹرس اور خالدہ "حبیب نرسری" کی انچارج مقرر ہوئی۔ تعلیم بالغان کا زنانہ مرکز جس کا نام "صفیہ سنٹر" رکھا گیا تھا اس کا کام ساجو بیگم کے سپرد رہا۔ اور شبراتی بدستور انجمن امداد باہمی کا نگراں رہا۔ اور بھی کئی نوجوان کارکن، استاد اور استانیاں زیادہ تر وہی مقرر کی گئیں، جو صفیہ اور حبیب میاں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ انویم کی مسلسل کوشش سے یہ ہوا کہ زیادہ تر سکندر پور ہی کے کام کرنے والے کملا نگر بھیجے گئے۔ اور اس کی وجہ سے ان لوگوں کے کاموں میں بڑی

آسانی پیدا ہو گئی۔ ٹھاکر سندر سنگھ گاؤں کے پردھان اب بھی تھے، اور صدیق حسن سرپنچ بنائے گئے۔

کاغذی کارروائیوں، تنخواہوں کی وصولی اور دوسرے کاموں کے شروع کرنے میں یقیناً دیر ہو رہی تھی۔ مگر یہ مخلص اور ان تھک محب وطن نوجوان ان سب باتوں کی زیادہ پروا نہ کرتے تھے۔ انھیں تو کملا نگر کو حبیب نگر بنانے کی دُھن سوار تھی۔ ایک ایسی بستی جو اُن کے نام کے شایانِ شان ہو، جو ان کے کاموں کو، ان کے مقاصد کو، ان کے سیوا اور پریم کو، ان کی دیش کی محبت کو زندہ رکھ سکے۔ اور وہ اسے بنانے، سنوارنے، سدھارنے میں تن من دھن سے لگے ہوئے تھے۔

"حبیب ہائی اسکول" سے متصل ایک چھوٹا سا دو کمروں کا نیم پختہ مکان ندیم کو مل گیا تھا۔ اسکول کی عمارت کے ساتھ استادوں کے لئے کوارٹر بننے کی اسکیم بھی تھی اور امید تھی کہ سال ڈیڑھ سال میں وہ بن جائیں گے۔ مگر ندیم اتنا انتظار نہ کر سکتا تھا۔ وہ بڑبڑاتا، خفا ہوتا، انویم سے بحثتا کہ کام جلدی کیوں نہیں ہوتا۔ مگر انویم اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا۔ "بھیا تم ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو۔ اور ہماری اس جمہوری حکومت میں کوئی کام اتنی پھرتی سے ہونا ممکن نہیں۔ . . صبر کرو۔ گھر بھی بن جائیں گے ایسی گھبراہٹ کیا ہے؟"

مگر ندیم کو گھبراہٹ یہ تھی کہ وہ سسرال میں رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ اسکول سے قریب چودھری نرائن سنگھ کی پرانی بیٹھک کو ان کی اجازت سے اس نے درست کرا کے اپنے لئے "کوٹھی" تیار کر لی تھی اور مع خالدہ کے

اس میں آگیا تھا۔ وہ بڑے مزے میں کہتا۔ "نہیں بھئی میں اس معاملے میں بہت قدامت پسند ہوں۔ ساس کے گھر جنوائی کتا باہر تولے پاؤ رتی کی کہاوت ہے۔ سو فیصدی سچ۔" لاکھ صدیق حسن اور سکینہ بیگم نے روکا مگر وہ نہ مانا۔ اور اب اس چھوٹے سے کچے گھر کو خلن نے اپنے حسنِ انتظام سے چار چاند لگا دئے تھے۔ اس کے سلیقے اور محنت اور پیار و محبت کے پھولوں سے سجی یہ جھونپڑی رشکِ ارم نظر آتی تھی۔ ندیم کو یہاں وہ آرام، وہ سکون، وہ مسرت حاصل تھی جو کسی لکھ پتی کو اپنے محل میں بھی نصیب نہ ہوگی۔ بعض وقت وہ حیران ہو کر سوچتا۔ اگر خالدہ سے اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو ـــ اس کا کیا انجام ہوتا؟ انوپم اور ندیم میں اب وہ پرانی چشمک نہ رہی تھی، گہرے برادرانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ خالدہ تو خیر پہلے ہی سے انو بھیا کی عقیدت مند تھی۔ اور اب اس میں اور بھی زیادتی پیدا ہو چکی تھی۔ ندیم کے گھر سے تھوڑی دور پر انوپم ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ لیکن جتنا خالدہ اور ندیم کا گھر صاف ستھرا سجا بنا تھا اتنا ہی انوپم کا کمرہ بدسلیقگی اور بے ڈھنگے پن کا شاندار نمونہ کہا جا سکتا تھا۔ پاؤں دھرتے ہی وہاں دم اُلٹنے لگتا۔ جب بھی خالدہ وہاں جاتی یا سا جو ادھر نکل آتی تو اس کمرے کو صاف کر کے اور چیزیں ترتیب سے رکھ کر جاتیں۔ مگر اگلے دن پھر وہی حال ہو جاتا۔

گیتا اب بھی ماموں کے ساتھ رہتی تھی جو اس پر پھر پہلے ہی کی طرح محبت کی برکھا کرتے رہتے تھے۔ ہر وقت، ہر سانس میں گیتا کی آواز منہ سے نکلتی۔ ان کی بیوی کا رویہ بھی اب گیتا سے بدل گیا تھا۔ خاصی خصوصیت اور محبت کرتیں۔ مگر مزاج سے لاچار تھیں جو تھا ہی کڑوا۔ اور پھر میاں بیوی

کے خراب تعلقات نے اس میں اور بھی زیادہ تلخی پیدا کر دی تھی۔ گیتا اکثر شام کو ساجو یا خلن کے ہاں چلی جایا کرتی۔ اور خلن کے گھر کی مسرت اور سکون دیکھ کر دل میں ایک عجیب سی کسک لے کر واپس آتی۔

شبراتی نے اس زمانے میں اپنے گھر کی مرمت وغیرہ کروا کر ایک چھوٹے سے کمرے کا اضافہ کرا لیا تھا۔ اب علاوہ اپنی کھیتی کے ان دونوں کی اپنی آمدنی بھی تھی۔ پچاس روپے ساجو کو ملتے تھے اور تیس روپے کا الاؤنس شبراتی کے کاموں کا مقرر ہوا تھا۔ ان دونوں کی کوشش یہ تھی کہ پہلے گھر کی حالت درست کریں اور پھر زیادہ توجہ بچوں کی تعلیم پر دی جائے۔ سعیدن کا چند مہینے ہوئے نکاح ہو گیا تھا۔ اور شبراتی نے کوشش کر کے اس کے میاں کو یہاں بلا کر کچھ کام دلوا دیا تھا۔ وہ اب بالغوں کے سنٹر میں باقاعدہ پڑھنے جاتا تھا اور سعیدن کے دل میں "جاہل گنوار" میاں کا جو خوف تھا وہ نکل چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔

۲۲

گیتا دوپہر کو روزانہ ایک گھنٹہ ساجو کے مرکز میں گزارتی تھی۔ ساجو کو بھی پڑھاتی اور چند اور لڑکیوں کو جو انگریزی یا ہندی میں خاصی ترقی کر چکی تھیں۔ ویسے بھی دنیا کی خبریں، زمانے کی رفتار، نئی نئی تحریکوں اور اسکیموں سے عورتوں کو روشناس کراتی رہتی تھی۔

ایک دن گیتا واپس جانے لگی تو ساجو بھی اس کے ساتھ ساتھ کچھ دُور تک آئی۔

اور پھر ایک دم بولی ۔"گیتا بی۔ کب تک ایسی کٹھور بنی رہوگی؟"

"کیا مطلب؟" گیتا نے حیران ہو کر کہا۔" میں نے کیا کیا؟"

"اب تو بیچارے بھیا کے حال پر رحم کھاؤ۔" ساجو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"جانے تم کیا کہہ رہی ہو" گیتا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"آخر کب تک یہ جوگ لئے رہوگی، گیتا بی۔ اب تو میرا جی ڈھولک بجانے کو چاہتا ہے۔"

گیتا سمجھی تو مگر بات ٹال دی۔" اب کے جو میلہ ہوگا سالانہ تو خوب گا بجا لینا۔"

"نہیں گیتا بی۔ میلے میں نہیں اپنی بھیا کے بیاہ میں۔" آنکھیں مٹکا کر ساجو نے کہا۔ اور گیتا نے نظریں چرالیں۔"اُنھ" مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب مایوسی کی سی کیفیت تھی۔ وہ گھر جانے کے لئے آگے بڑھی۔

"تمھیں میری جان کی قسم گیتا بی۔ ذرا دیر رکو۔ ایمان سے سچ سچ بتاؤ آخر کب تک تم اور انویم بھیا۔ یوں ایک دوسرے سے الگ الگ رہو گے۔ میں کہوں ہوں کہ اب یہ شبھ کاج ہوتا کیوں نہیں؟"

گیتا نے ساجو کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔" ساجو دیدی۔ ایسی بات بھول کر بھی کسی کے سامنے منھ سے نہ نکالنا۔"

"مگر کیوں؟" حیرت سے ساجو نے پوچھا۔ وہ بمبئی کی ساری باتیں خود گیتا سے سُن چکی تھی اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گیتا ضرور انویم کو چاہتی ہے۔ رہے انویم۔ تو اسے یقین تھا کہ وہ گیتا پر جان دیتا ہے۔ بھلا گیتا پر کون جان نہ دے گا؟

"میں ۔ میں ۔ ان کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی ۔ ساجو دیدی"
ہچکچاتے ہوئے گیتا نے کہا ۔ ساجو جملے کا مطلب الٹا سمجھی ۔ "ایمان سے ؟
تم انھیں نہیں چاہتیں ؟ میری جان کی قسم ؟ تو پھر کیسے چاہتی ہو ؟"
"میرے چاہنے نہ چاہنے کا سوال نہیں ساجو دیدی ۔ سوال یہ ہے ۔
اب کیا میں اتنی چھچھوری ۔ ایسی گئی گزری ہوں کہ ۔ کہ ۔ کہ ۔" اور جملہ یونہی
ادھورا چھوڑ کر گیتا لپکتی ہوئی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی ۔ ساجو نے دیکھا
کہ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا ہے ۔

آج چھٹی کا دن تھا ۔ پرسوں ہی یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اب کے
اتوار کے دن پک نک ہو گی ۔ دریا میں جو بڑی سی ناؤ باربرداری کے لئے
پڑی رہتی ہے اس پر بیٹھ کر سب دریا کی سیر کریں گے اور اس پار جا کر
پورا دن گزاریں گے اور چھٹی منائیں گے ۔
خالدہ نے ندیم کو منھ اندھیرے اٹھا بیٹھایا ۔ ساتھ لیجانے کے
لئے کھانا پکانے کا سامان رات ہی سے ٹوکری میں سب رکھ لیا گیا تھا
منگل جو رات کو خالدہ ہی کے ہاں رہتا تھا ، خالدہ سے بھی پہلے تیار ہو چکا
تھا ۔ دری ، ٹوکری وغیرہ خالدہ نے اسے دی کہ وہ لے کر دریا پر چلے اور
میاں سے بولی "میں جا کر دیدی اور کلو کو لے آؤں ۔ تم انوپم بھیا کے
پاس جاؤ ۔"
"وہ پوستی تو پڑا سو رہا ہو گا ۔ چھٹی کے دن اسے پلنگ سے اٹھانا
بڑا مشکل کام ہے ۔" ندیم نے جاکٹ پہنتے ہوئے کہا ۔
"تم اٹھاؤ تو جا کر ۔ اور ہاں دیکھنا ۔ آج ان سے ضرور بات کرنا ۔"

"ہاں ہاں بھئی ضرور کریں گے۔ حکم جورو جی بہ از حکم خداست۔"

"ہنھ باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔ اچھا میں چلی۔" خالدہ نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔ مگر باہر آئی تو ابھی تک آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے اور ایک گھڑی رات باقی تھی۔ ندیم بھی ساتھ ہی باہر نکلا "تمھیں ڈر لگے گا خلن۔"

"ڈر؟ ڈر کیسا — ہم آزاد ہندوستان کی بہادر عورتیں ہیں، ڈرنے کا کیا کام؟" اٹھلا کر خالدہ نے جواب دیا۔

"مگر وہ — چودھری کا کتا۔" ندیم نے چڑایا۔ اور عین اسی وقت کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

"ہائے مرے اللہ" خالدہ نے جلدی سے ندیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"اے آزاد ہندوستان کی بہادر سپوتنی۔ بس ایک کتے سے ڈر گئی؟"

"میں ڈری وری نہیں۔ اچھا تم انو بھیا کے پاس جاؤ۔ میں ساجو دیدی کو ساتھ لے لوں گی۔ وہاں تک منگل ساتھ رہے گا۔" ذرا دیر میں خالدہ اور منگل اندھیرے میں غائب ہو گئے اور ندیم مزے مزے سیٹی بجاتا اور گنگناتا انویم کی کوٹھری کی طرف چلا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہ تھی کھلا پڑا تھا۔ اور وہ حضرت جھلنگی چارپائی پر مزے سے پڑے سو رہے تھے اور ایک کتا جھوٹے برتنوں کو چاٹ رہا تھا۔ ندیم نے پہلے کتے کو بھگایا اور پھر انویم پر لعنت ملامت کی بوچھار کر دی۔

"بے حس ہے، پھوہڑ ہے — بے وقوف۔ کتے کے جھوٹے برتن چاٹتا ہے۔

انوپم بے چارا جھینپی ہنسی ہنستا ہوا اُٹھا اور جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر میلے کپڑوں ہی پر جواہر جیکٹ پہننے جا رہا تھا کہ ندیم نے ڈانٹا۔ "ارے بدھو میاں، ذرا کپڑوں کا حال تو دیکھو۔ میلے چیکٹ ہوئے ہیں۔

"خاصے تو ہیں۔ پھر دیر ہو جائے گی۔" انوپم نے صفائی دی۔

"واہ رے تیرے خاصے کپڑے۔ چلو جلدی کپڑے بدلو۔ وہاں گیتا بھی ہو گی۔ یہ خیال ہے۔"

"تو۔؟"

"تو۔ وہ کچھ نہیں۔ آدمی کے حلیے میں چلنا ہے تو چلو، جنگلیوں کا وہاں کام نہیں۔"

انوپم کے پاس ایک ہی جوڑا کپڑا دھلا ہوا پائنتی رکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اس نے بدلا۔ اور ندیم نے اپنے ہاتھ سے اس کے گھنے، گھنگھریالے بالوں میں کنگھی کی۔ "اب دیکھو آئینہ۔ آدمیوں کی سی اچھی بھلی صورت نکل آئی ہے۔" ہنستے ہوئے ندیم نے کہا۔

"یہ آخر آج مرا بناؤ سنگھار کیوں ہو رہا ہے!" ہنستے ہوئے انوپم نے کہا۔ اور دونوں باہر نکل آئے۔

"بردکھوے کے لئے لے جاؤں گا۔" ندیم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"بردکھوے کے لئے مجھے؟ یہ کس جانِ ناتواں پر ستم ڈھانے کا ارادہ ہے؟"

"جس پر تم پہلے ہی ستم ڈھا چکے ہو۔ اب اترانا چھوڑ دو۔ میں پوچھتا ہوں یہ جناب پر ہمچاری کا روپ دھارن کب تک کئے رہیں گے۔؟ لوگوں پر رعب ڈالنے کے اور طریقے بھی تو ہیں؟

"یہ کیا خیال آیا اس وقت تمھیں" مسکراتے ہوئے انوپم نے کہا۔

"ارے یہ مجھے نہیں تو اور کسے خیال آئے گا؟ بڑا بھائی ہوں کہ نہیں۔ سب کچھ تو مجھی کو کرنا ہوگا"

"کیا کرنا ہوگا جناب کو؟" انوپم نے اسی لہجے میں پوچھا۔

"تیرے بیاہ کا انتظام اور کیا۔ سچ سچ بتا اب دیر کیا ہے؟ کیا وہ مانتی نہیں؟"

"کون؟"

"مجھ سے تو بنو نہیں حضرت۔ گیتا اور کون؟" جھنجلا کر ندیم نے کہا۔

"گیتا سے پوچھا ہی کس نے ہے" سنجیدہ لہجے میں آہستہ سے انوپم نے جواب دیا۔

"تو آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں مجھ پر کہ اب تک آپ نے گیتا کو پرپوز ہی نہیں کیا ہے؟ کچھ پوچھا ہی نہیں؟ دل کا حال کہا ہی نہیں اس سے؟ یہ اُڑن گھائیاں کسی اور کو بتانا میاں۔ ہم تجربہ کار لوگ ہیں"

"ضرور ہو — جانتا ہوں۔ اور تم یہ جانتے ہو کہ مجھ سے زیادہ ناتجربہ کار اور بقول تمھارے بدھو اور کوئی نہیں ہو سکتا — اسی لیئے اب تک اس کی ہمت ہی نہیں پڑی"

"اب یہ بھی کہہ دو کہ تم دونوں میں محبت بھی نہیں ہے"

"دوسرے کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں ندیم بھائی"

ارے کمبخت اپنے بارے میں تو منھ سے پھوٹ۔ اس سے کہتا کیوں نہیں کہ میں تجھ پر مرتا ہوں۔ جان دیتا ہوں۔ اگر تو نے مجھ سے بیاہ نہ کیا تو پاگل ہو جاؤں گا — پتھروں سے سر پھوڑ ڈالوں گا، تو کہے تو کوہ بے ستون

سے جوڑے شیر تیرے لیے کاٹ لاؤں ــــ تو کہے تو گل بکاولی فراہم کروں۔
تو میری لیلیٰ ہے ــــ میں تیرا مجنوں ہوں۔ اے تو مری لیلیٰ میں ترا مجنوں۔"
اور ندیم نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا اور انویم ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا۔
"سچ مچ یار، آج تم ضرور چڑھا کر آئے ہو۔ بُرے طرح نشہ چڑھا ہوا ہے۔"
انویم نے کہا۔
"ارے اپن جانب کو ہمیشہ بے پیئے چڑھی رہتی ہے۔ اسے یہی شراب مسرت ہی تو مجھے پلانا چاہتا ہوں۔ سُنا نہیں ؎

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام
نہ پیئے اور جھومتا جائے!

"واہ خوب شعر ہے" انویم نے داد دی۔
"ہُنہہ خوب شعر ہے۔ تو کیا جانے مستی اور رندی! بزدل! اپنی محبوبہ سے حالِ دل کہنے تک کی ہمت نہیں۔ میں کہتا ہوں انویم تم اس طرح گیتا کو کھو بیٹھو گے۔"
"ندیم بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو منہ سے نکالنا کچھ چھچھورا پن سا لگتا ہے۔ محبت کی جاتی ہے۔ کہی نہیں جاتی۔ کیا بغیر زبان سے سنے محبوب یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی اس پر جان دیتا ہے؟"
"اگر سمجھ بھی سکتا ہو ــــ" ندیم نے دانت پیس کر کہا۔ "تو کیا جناب یہ چاہتے ہیں محبوب خود عاشق کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے یہ عرض کرے کہ میں جان گیا ہوں، سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھ پر جان دیتے ہو ــــ اس لئے اب خدا کے واسطے دیر نہ کرو اور مجھے اپنا بنا لو ــــ سچ ایسا احمق دنیائے عشاق میں آج تک پیدا نہیں ہوا ہوگا۔"

"دراصل — بات یہ ہے ندیم — کہ میں — میں اپنے کو گیتا کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھے اس نظر سے نہیں دیکھتی ہے۔" کچھ سوچتے ہوئے انوپم نے کہا۔ لہجے کی مایوسی چھپانے کے باوجود نہیں چھپ رہی تھی۔

"بقراطِ زماں تمہیں تو ہو۔ تم خود کہتے تھے کہ بیماری کے زمانے میں اسے تمہارے بغیر چین نہ آتا تھا۔ اور اب یہ بدگمانی؟" ندیم نے سمجھایا۔

"اس چھ مہینے میں ان کا جو طرزِ عمل رہا ہے وہ بھی تو دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے دوست کی حیثیت سے پسند کرتی ہیں اور ایک ساتھ کام کرنے والے ساتھی کی حیثیت سے میری قدر بھی کرتی ہیں۔ میری عزت بھی ہے ان کے دل میں اور تھوڑا بہت اُنس بھی۔ مگر محبت؟ نہیں ندیم گیتا کو مجھ سے محبت نہیں۔ میرا آئینہ کہتا ہے کہ یہ خیالِ خام چھوڑ دو۔ بھلا کہاں وہ — کہاں میں —" اور روکتے روکتے بھی ایک آہ انوپم کے سینے سے نکل ہی گئی۔

"حضرت یہ سرد آہیں، یہ گرم آنسو — اور پھر عاشقوں کے نام کو بٹہ لگانے والی یہ نامردی کی باتیں — شرم کرو۔ شرم۔"

انوپم کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

"بھیا — مان لیا تم بڑے قابل، بڑے ذہین، بڑے دور اندیش ہو۔ مگر عورتوں کے معاملے میں بالکل کورے۔ نرے بدھو ہو۔ اگرچہ منہ پہ کہنا خوشامد ہے۔ میں کچھ تجربہ رکھتا ہوں۔ نظر رکھتا ہوں اور شرط بدنے کے لئے تیار ہوں کہ گیتا تمھیں چاہتی ہے — وہ صرف تمھاری ہے۔ تمھاری۔" ندیم نے جوش کے ساتھ کہا۔

"تم آخر یہ کیسے کہتے ہو؟ اس کی کسی بات سے بھی تو یہ ظاہر نہیں ہوتا" شبہ اور مایوسی دونوں کا رنگ اس کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔

"ہوئی نہ وہی بات۔ محبت تمہارے خیال میں بھی لفظوں کی پابند ہے۔ اسے چاہیئے تھا کہ ہر وقت تمہارے آس پاس گھوما کرتی ۔ تم سے اظہار خصوصیت کرتی چاہے اس سے کتنی ہی بدنامی ہوتی اس کی ۔ وہ کہا کرے انویم پیارے، میری جان، تم کیوں مجھ سے دور دور رہتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ تم مجھے چاہتے ہو نا ۔ پھر آخر دیر کاہے کی ہے۔ تم مجھ سے خدا کے لئے جلدی سے بیاہ کر لو ورنہ میں مرجاؤں گی ۔" جل کر منھ چڑاتے ہوئے ندیم نے کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ۔ وہ سن لے تو کیا کہے" گھبرا کر انویم نے کہا۔

"ارے بدھو میاں۔ محبت کی زبان مرد کے منھ میں ہوتی ہے اور عورت کی آنکھوں میں۔ تجھے دیکھ کر اس کی نرگسی آنکھوں میں جو حیا چھپی پھرتی ہے، اس کے چہرے پر جو گلابی رنگ بکھر جاتا ہے، اس کے ہونٹوں پر جو شرمیلی مسکراہٹ ابھرتی ہے اور جسے وہ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے، کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے احمق۔ عورت کی محبت الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی میاں۔ اس کے ہزار رنگ، ہزار روپ ہیں۔ ہاں دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔ محسوس کرنے والا دل ہونا چاہیئے۔"

انویم کوئی جواب نہ دے سکا وہ کسی خیال میں کھوسا گیا تھا۔

دریائے گنگا کا کنارہ آگیا۔ ناؤ میں شبراتی اور منگل وری وغیرہ بچھائے ان لوگوں کے منتظر تھے۔ گیتا اور نلنی وغیرہ اب تک نہ آئی تھیں۔

صبح صادق کی ہلکی دودھیا روشنی آسمان پر پھیل رہی تھی۔ ذرا سا

مغرب کی سمت جھکا ہوا صبح کا ستارہ دمک رہا تھا اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں میں ایک لطیف سی خنکی موجود تھی۔

سامنے سے لڑکیاں آتی نظر آئیں۔ آگے آگے موتی بیگم بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے سا بو لپکتی ہوئی اور آخر میں گیتا اور خالدہ خراماں خراماں چلتی ہوئی۔ صبح کے دھندلکے میں وہ کسی دوسری دُنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھیں۔

ندیم نے کہا۔ "واہ ری کاہلی۔ میں نے انور سے کہا تھا کہ تم لوگ ہم سے پہلے پہنچ چکی ہوں گی اور تم نے گھنٹہ بھر لگا دیا۔ بناؤ سنگار میں عورتیں کتنا وقت برباد کرتی ہیں"

خالدہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واہ بناؤ سنگار تو تم ہی عورتوں کی طرح کرتے ہو۔ ہم تو دھیرے دھیرے اس لئے آرہے تھے کہ تم لوگوں کو ہماری برائیاں کرنے کا وقت مل جائے — لو سنبھالو — یہ ناشتہ دان — ہاتھ ٹوٹ گیا — امی نے جانے کیا کیا پکا کر ساتھ کر دیا ہے —"

گیتا نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھائیں اور مسکرا کر ندیم کو دیکھا۔ ایک دم ندیم اداس ہو گیا۔ آہ یہ نوکیلی دراز پلکیں — گیتا کی یہی چیز تو اسے سب سے زیادہ پسند تھی۔ مگر اس کی قسمت میں یہ نہ تھا کہ گیتا اس کی بنتی — پھر اس کی نظر خالدہ کے چہرے کی طرف اٹھ گئی۔ مگر خالدہ، وہ بھی کسی سے کم نہیں — اور اب تو خوب ہی رنگ روپ نکال لیا ہے — مگر گیتا والی بات کہاں؟

گیتا ندیم کی نظروں سے بے چین سی ہو گئی۔ اب ندیم کبھی اس کو

اس طرح نہ دیکھتا تھا۔ وہ جلدی سے لپک کر آگے بڑھ گئی۔

ناؤ کے کنارے انوپم کھڑا اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ خود بخود گیتا کی نظریں جھک گئیں اور چہرے پر بالکل ایسی شفق نکھر آئی جیسی پورب کی اُور دھیرے دھیرے آسمان پر پھیل رہی تھی۔

ناؤ کے ایک سرے پر کشتی کھینے والے دو ملاح دو لمبے لمبے بانس لئے بیٹھے تھے۔ دوسرے سرے پر شبراتی پتوار سنبھالے بیٹھا تھا۔ ساجو دوسری پتوار سنبھالے شبراتی کی برابر بیٹھ کر خود بھی کشتی کھینے کی کوشش کرنے لگی۔ موتی بیگم نے جو یہ دیکھا تو اس طرح ادھر لپکی کہ اگر ندیم سنبھال نہ لیتا تو دریا میں غوطہ کھاتی "ساجو دیدی۔ ساجو دیدی ۔۔ اللہ ۔۔ ہم بھی ناؤ چلائیں گے۔ یہ پتوار ہمیں دیدو دیدی"

ندیم اور خالدہ کی آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ اور دونوں کو یکایک یہ شوق چرایا کہ ناؤ والوں سے ناؤ چلانا سیکھنا چاہیے۔

ناؤ کے وسط میں دری پر اب صرف گیتا اور انوپم ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے رہ گئے۔ گیتا کے ایک ہاتھ میں کتاب تھی اور دوسرا ندی میں ڈال رکھا تھا۔ جس سے لہریں کھیل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں اُفق پر جمی ہوئی تھیں، جہاں رنگ برنگے بادل کے ٹکڑے سورج کا سواگت کرنے کے لئے تیزی سے جمع ہو رہے تھے۔

انوپم ہر چیز سے بے خبر گیتا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور گیتا کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ چغلی کھا رہے تھے کہ وہ بے دیکھے بھی اس کی نظروں کی گرمی محسوس کر رہی ہے۔

انوپم کا سانولا چہرہ شدتِ جذبات سے عنابی ہوا جا رہا تھا۔

اس کے دل کی دبی آگ کو آج ندیم نے بری طرح کریدا تھا۔ یہ نوجوان جو بظاہر بڑے ہی ٹھنڈے مزاج اور سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا، اپنے دل میں عشق کا ایسا شعلۂ سوزاں رکھتا تھا جس کی گرمی برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اور آج تو اس کے دل میں ولولوں، تمناؤں آرزوؤں کا ایک جوالہ مکھی بھڑک اٹھا تھا۔ پریم کا راگ اونچے سُر میں اس کے کانوں میں گنگنا رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس ناؤ پر، اس گاؤں میں، اس دنیا میں اس کے اور گیتا کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔ آج اسے گیتا سے بات کرنی ہے۔ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ضرور ہو گا۔ جو بھی ہو۔

مگر گیتا بولتی کیوں نہیں؟ اس کی طرف دیکھتی کیوں نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ کہے اور گیتا بگڑ جائے؟ مگر اس خیال کے ساتھ ہی ندیم کی تیز آواز جیسے اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"نامرد، بزدل" اس نے آہستہ سے کہا۔ "گیت" مگر شاید اتنے آہستہ کہ گیتا نہ سن سکے۔ ایک بار بمبئی میں ہسپتال میں انوپم نے اسے "گیت" کہہ کر پکارا تھا تو گیتا کا چہرہ شگفتہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا۔

"گیت" پھر انوپم نے کہا۔

"ہوں" اتنے ہی آہستہ سے گیتا نے جواب دیا۔

"تم — تم مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہو گیت — کیا مجھ سے ناراض ہو کچھ؟"

"نہیں تو —" اسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں جواب ملا۔

"ہم اب بھی ویسے ہی مخلص اور قریبی دوست ہیں نا۔ ایک دوسرے

کے جیسے ۔۔ جیسے بمبئی کے ہسپتال میں تھے ؟" جوش کے ساتھ انوپم نے پوچھا۔

"یقیناً انو۔ یقیناً" جس گرم جوشی سے اس بات کا جواب ملا اس نے انوپم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بزدلی اور کم ہمتی، شک و شبہات، احساسِ کمتری سب جانے کہاں فضا میں غائب ہو گئیں۔

"کیا صرف دوست ؟" انوپم اور زیادہ گیتا کی طرف جھک آیا۔

گیتا نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا مگر اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ اُبھری جس نے اس کے سارے چہرے کو منور کر دیا۔

انوپم نے اس کے چہرے کو دیکھا، ندی کو دیکھا۔ پانی میں کھیلتے ہاتھ کو دیکھا۔ زبان نے کام نہیں دیا۔ چپکے سے اپنا ہاتھ بھی ندی میں ڈال دیا۔ اور پانی کی چادر کی اوٹ میں گیتا کا ہاتھ تھام لیا۔ گیتا چونکی، مڑی، نظروں سے نظریں ٹکرائیں۔ اور پھر گیتا کی نگاہیں جھک گئیں۔

"گیت۔ کیا یہ ہاتھ میرا ہو سکتا ہے ؟"

گیتا کے چہرے پر شفق کی سرخی اور گہری ہو گئی۔

"کیا زندگی کے سفر میں، ہم دونوں یونہی دوش بدوش، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ ہم سفر رہ سکتے ہیں۔ گیت — کیا تم میری ہو سکتی ہو مجھے اپنا بنا سکتی ہو۔ ہمیشہ کے لئے"۔

ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ آواز میں اصرار تھا۔ التجا تھی، خلوص تھا پیار تھا۔ اور ذرا سا ارتعاش، پلکوں کو جنبش ہوئی، آنکھیں اُٹھیں، ملیں مگر جھکی نہیں۔ آہستہ۔ آہستہ کہ آواز کانوں نے نہیں دل نے سنی کہا گیا۔

"یہ ہاتھ تو — انو ہی کا تھا — ہے — اور رہے گا ..."

اور پھر اس کی پلکوں کا سایہ سرخ رخساروں پر مچل اٹھا، گردن اور زیادہ جھک گئی اور پانی کے اندر دو ہاتھ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔ آنکھوں سے دو موتی لڑھکے اور بارگاہِ محبت میں نذر پیش کر گئے۔

ناؤ دھیرے دھیرے بہاؤ پر جا رہی تھی۔ ہاتھ اسی طرح ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔ نظریں اسی طرح بندھی ہوئی تھیں۔

فضا میں دو قہقہے گونج اٹھے۔

ندیم اور خالدہ ہنستے کودتے ان کی طرف آ رہے تھے۔

دونوں چونک پڑے۔ چہروں پر مسرت ناچ رہی تھی، آنکھوں میں حیا رقص کر رہی تھی۔ مگر ہاتھ اب بھی ایک دوسرے کو تھامے تھے۔

کنارا آ گیا۔

سب سے پہلے کود کر سا بو کنارے پر گئی اور اس کے پیچھے موتی بیگم نے چھلانگ لگائی۔ پھر ندیم نے خالدہ کو سہارا دے کر اتارا۔ اس کے بعد گیتا اور انویم کھڑے ہوئے۔ انویم نے داہنا ہاتھ بڑھایا۔ گیتا جھجکی رکی، چاروں طرف دیکھا، مگر پھر ہمت کر کے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دونوں ایک ساتھ ریت پر کودے اور دور تک بے ارادے دوڑتے چلے گئے۔

"مبارک — مبارک ہو۔ بدھو میاں۔" ندیم نے انویم کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ سنا آپ نے ہم کل ہی سندر چاچا کے پاس چلیں گے۔" خالدہ نے ندیم سے کہا۔ اور وہ اور سا بو گیتا سے لپٹ گئیں۔ گیتا نے اپنا منہ خالدہ کے رنگین دوپٹے میں چھپا لیا اور

سا جو لہک لہک کر گانے لگی۔

لہروں نے محبت کے متوالوں کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ ندی جھوم اٹھی، سورج مسکرا پڑا۔ کرنوں نے منھ چوما۔ نسیم نے گدگدایا بادل اٹھکھیلیاں کرنے لگے، شفق نے زعفرانی رنگ اچھالا۔ چڑیاں چہچہائیں، پودے لہلہائے، غنچے مسکرائے، پھول ہنس پڑے۔ ساری کائنات مسکرا مسکرا کر گیتا اور انوپم کو تہنیت پیش کر رہی تھی۔



خواجہ غلام الثقلین کی صاحبزادی

صالحہ عابد حسین ۱۹۱۳ء میں بمقام پانی پت

[illegible] ہوئیں۔ تعلیم بیشتر گھر پر [illegible] سے پائی۔

[illegible] پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ ۱۹۲۶ء میں پہلی کہانی شائع ہوئی۔

[illegible] کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۳ء میں اور پہلا ناول ۱۹۳۶ء میں چھپا۔

اب تک [illegible] اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ڈراموں کا ایک مجموعہ اور مضامین کے مجموعے بھی اشاعت پذیر ہو چکے

ہیں۔ [illegible] کتابوں پر حکومتِ اترپردیش سے اور کئی کتابوں پر مرکزی

وزارت تعلیم سے انعام مل چکے ہیں۔

آپ کا [illegible] ناول "راہِ عمل" مکتبہ جامعہ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی